ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

اپریل سنہ ۱۹۳۸ع

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

سالانہ چندہ چار روپیہ

هندستانی سنہ ۱۹۳۸ع

ایڈیٹر : مولانا سعید انصاری

مجلس مدیران

فہرست مضامین

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

حصہ ۲	اپریل سنہ ۱۹۳۸ع	جلد ۸

اُستاد کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ

[از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور' ایم - اے ' پی ایچ ڈی - لندن]

آج سے ٹھیک سو سال قبل - حیدرآباد ایک ایسی باکمال ہستی کے فیوض علمی و باطنی سے سیراب ہو رہا تھا جسکی یاد پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی باقی ہے اور شائد ہمیشہ باقی رہے گی - اُستاذالاساتذہ حضرت حافظ میر شمس الدین فیض کی شخصیت ایسی ہمہ گیر تھی کہ ہر ذوق کا انسان اُن سے بہرہ ور ہو سکتا تھا - اُنکی جودت طبع ' غیر معمولی ذہانت اور قلمی اور ذہنی کمالات کے تذکرے اب تک حیدرآباد میں زبان زد خاص و عام ہیں - اُن کی قوت سخن اور بدیہہ گوئی ضرب المثل تھی اور اِس مشغلۂ شعر و سخن سے زیادہ وہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں مشہور تھے - اور سچ تو یہ ہے کہ تصنیف و تالیف اور علم و فضل اُن کے فیوض باطنی اور کشف و کرامات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے -

یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن میں ہر سو سال کے ختم پر علمی و ادبی احیا ہوتا رہا ہے - جب کوئی مورخ اِس سر زمین کی علمی اور

ادبی تاریخ قلمبند کرنا چاہے گا تو وہ اِس حقیقت حال کے انکشاف سے حیران رہ جائے گا کہ ہر ہجری صدی میں دکن کے بسنے والے ایک ذہنی انقلاب پیدا کرتے رہے ہیں اور اُنہیں درمیانی سالوں میں علمی و ادبی چہل پہل اور قلمی و دماغی سرگرمیاں التزام کے ساتھ عروج کمال تک پہنچتی رہی ہیں - ۱۰۰۰ ہجری سے آج تک برابر یہی صورت واقع ہوتی چلی آرہی ہے اور اگرچہ اِس سے قبل کی تاریخ ابھی اچھی طرح بے نقاب نہیں ہوئی ہے مگر کیا تعجب کہ اُس قدیم زمانے میں بھی یہی التزام رہا ہو -

حضرت "فیض" آج سے ٹھیک ایک سو سال قبل سر گرم عمل تھے اور آج جب کہ ہم سنہ ۱۳۵۶ھ میں اُن کی یاد تازہ کر رہے ہیں اُن کی ایک مختصر سی کتاب " فیض جاری " ہماری توجہ اپنی طرف ملتفت کرلیتی ہے جو آج سے ٹھیک سو برس پیشتر گویا اُنہیں دنوں میں چھپ رہی تھی جبکہ یہ مضمون چھپ رہا ہے- اِس کتاب " فیض جاری " کے سرورق پر یہ عبارت ہے جو دل چسپی سے خالی نہیں :— " رسالۂ فیض جاری ' عہد میں نواب فلک جناب بندگان عالی حضرت آصف جاہ نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ میر فرخندہ علی خاں بہادر مدظلہ العالی کے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں واسطے تعلیم طلبا کے سرکار شمس الامرا بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانے کے درمیان سنہ ۱۲۵۶ ھ میں چھپا " -

حضرت "فیض" نے مختلف موضوعوں سے متعلق اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ قطب شاہی دور کے بعد حیدرآباد کے کسی بلند مرتبہ اُردو شاعر نے نہیں لکھیں - اردو اور فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی اُن کی کتابیں موجود ہیں - اِن سب کے متعلق اُن کے زیر ترتیب سوانح حیات میں تفصیل سے معلومات پیش کی جائیں گی - یہاں یہ بتا دینا کافی ہے کہ

حضرت "فیض" ایک بلند پایہ استاد سخن ہونے کے علاوہ بہت بڑے انشا پرداز ، عروضی اور عالم و فاضل بھی تھے- قراءت ، خوشنویسی اور خط طغرٰ کے ایسے ماہر تھےکہ دکن سے باہر بھی کاملین اُن کے کمال کے قائل تھے - علوم عقلیہ و نقلیہ کے ساتھ ساتھ تصوف و عرفان اور مذہب و روحانیت میں بھی اُنہوں نے آخر زمانے میں وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ اُن کے جملہ تلامذہ اُن کو ولی کامل سمجھتے تھے - شاگردوں کے علاوہ اُنکے معتقدین اور مریدین کا بھی ایک بہت بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا جس کے سلسلے کے افراد اب تک باقی ہیں - اُنکے عرس اور یادگاری مشاعرے قریب قریب نصف صدی تک بڑی دھوم دھام سے ہوتے رہے اور اِس میں کوئی کلام نہیں کہ اُن کا فیض اب تک جاری ہے -"

اُردو ادب کی تاریخ میں مشکل ہی سے کوئی ایسا استاد سخن نظر آتا ہے جس کے شاگرد اپنے استاد کے اِتنے گرویدہ ہوں - اگرچہ مشہور ہے کہ حضرت " فیض " کسی کو اپنے سلسلۂ بیعت میں داخل کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے لیکن اُن کے شاگردوں اور تربیت یافتوں کے علاوہ اور لوگ بھی اُن کی بیعت کا شرف حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے' اور جو اُن کےمرید نہ ہو سکے اُن کو بعد میں افسوس رہا کہ ہم نے ایک ایسا موقع کھو دیا جو پھر نصیب نہیں ہو سکتا - نواب مشرف جنگ " فیاض " اُن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - اُن کے فرزند نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز فرماتے ہیں کہ حضرت " فیض " کے بعد حضرت "فیاض" کو اکثر اِس کا افسوس رہا کہ " میں نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت کیوں نہیں کر لی " -

غرض حضرت " فیض " نے اٹھاسی برس کی طویل عمر پائی اور اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیا - عنفوان شباب سے آخر عمر تک

تعلیم و تعلم اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا ۔ بارہ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوئے اور عنفوان شباب ہی میں وہ علمی شہرت حاصل کرلی تھی کہ عوام کے علاوہ شہزادے اور امیر زادے بھی آپ کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت سے مستفید ہونے لگے تھے - پچاس سال کی عمر تھی کہ عام علمی و ادبی شہرت کے ساتھ ساتھ مذہبی تقدس بھی حاصل کر لیا تھا - ایک ہم عصر مورخ خواجہ غلام حسین خاں سنہ ۱۲۷۰ھ سے قبل اُن کے متعلق اپنی مشہور و معروف تاریخ " گلزار آصفیہ " میں یوں لکھتا ہے :—

" از کاملان زمانہ و عارفان دورانہ ، فرد کامل و منتخب روزگار، جامع علوم عقلی و نقلی ، منبع کمالات صوری و معنوی- از ابتدائے شباب متوجہ تحصیل علوم گردیدہ در عرصۂ چند سال مشہور روزگار گشتہ مرجع خلایق گردید - کمالات حقایق و عرفان و استحقاق و ادراک شریعتے و طریقتے آنجناب از اشعار فارسی و ہندی اُردوے خاص از قصیدہ و غزل و رباعی وغیرہ آنحضرت مانند نور آفتاب تابان، درخشان و ظاہراست- ہرذی فہم کہ بادراک فہم خویش فکر کند بجان‌سخن‌رسد- سواے این حسن اخلاق و تہذیب و مروت و آدمیت از ملاقات آن جناب ہویدا میکردد - در قرامت کلام شریف یکتاے عہد خود ، تصانیف عربی و فارسی و ہندی آنجناب مشہور آفاق- معہذا در برآمد کار ارباب احتیاج بہ دمے یا درمے یا قدمے یا قلمے مستثناے زمانہ اند کہ این مقدمہ خیلے مشکل تراست علی‌الخصوص درین وقت ... در علم حقایق و معرفت الٰہی نکاتے چند از زبان آن واقف رموز خفی و جلی‌بوقت خلوص ملاقات برمی آیند کہ دل بے قرار شدہ می خواہد کہ ہمین وقت از سینہ بر آید و ترک علایق کند وبہ معبود حقیقی خود وصلت جوید و دیگر از خیال بیہودۂ دنیا کنارہ گز یند " [۱]

---

[۱]—گلزار آصفیہ ص۲۲۳—۲۲۴ -

یہ طویل عبارت اس لیے نقل کی گئی ہے کہ اِس سے ظاہر ہے کہ حضرت "فیض" نے سنہ ۱۲۹۰ ھ سے قبل ہی یہ رتبہ حاصل کر لیا تھا اور اُسکے بعد وہ اور تیس سال زندہ رہے اور جب یہ معلوم ہے کہ آخر وقت تک اُن کی مقدس زندگی کا ایک ایک لمحہ خلق خدا کی خدمت میں بسر ہوا ' اور اہل دکن اِس نعمت ایزدی سے ہر لمحہ فیضیاب ہوتے رہے تو محض اِس واقعے کا تصور ہی حضرت "فیض" کی غیر معمولی عظمت کے نقوش دلوں پر مرتسم کرنے کے لیے کافی ہے -

اِس خصوصیت میں بھی شاید ہی کوئی اور حضرت "فیض" کی ہمسری کرسکے کہ اُنہوں نے چار سلاطین آصفیہ کا زمانہ دیکھا اور پانچویں وارث تخت و تاج آصفی کی پیدائش کے قطعات تاریخی بھی لکھے - وہ نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے عہد حکومت میں سنہ 1195 ھ میں پیدا ہوئے اور اُنکی ۲۳ برس کی عمر تھی جب آصفجاہ ثانی کا سنہ ۱۲۱۸ ھ میں انتقال ہوا اور نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث تخت نشین ہوئے - لیکن نواب نظام علی خاں ہی کے دور میں اُنہوں نے ایک دیوان مرتب کرلیا تھا جو اُن کے دست خاص کا لکھا ہوا ہے اور اِس وقت راقم کے زیر مطالعہ ہے- اِس میں ڈھائی ہزار سے زیادہ شعر ہیں- اِسکے سرورق پر حضرت " فیض " کی مہر ہے اور اُسکے متصل دیوان کا نام تاریخی مصرعے میں "چشمۂ فیض اِسکی ہے تاریخ" خود مصنف کے قلم سے لکھا ہوا ہے' جس سے از قاعدۂ جمل سنہ ۱۲۳۸ ھ نکلتا ہے ' لیکن دیوان میں بعض شعر ایسے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ تاریخی نام بعد کو قرار دیاگیا ' حالانکہ دیوان کا بیشتر حصہ بہت پہلے لکھا جا چکا تھا - اِسکا ایک شعر ہے -

ہے شمار سال عمر اپنا برس بائیس میں
کچھ نہ ہم سے ہوسکا اب تک سر انجام شباب

اِس دیوان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت " فیض " نے عنفوان شباب ہی میں فن عروض میں اجتہادی شان حاصل کرلی تھی ' چنانچہ بعض غزلوں کے حاشیے پر خاص خاص بحریں لکھی ہوئی ہیں جن میں سے بعض خود اُنکی ایجاد کردہ ہیں - مثلاً ایک دو غزلے کے حاشیے پر لکھا ہے -

" بحر مجدد اختراع فیض - مفا علن فعلات فاعلاتن ' عکس بحر جدید "

اِس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے -

جو صبح دم کسی بام پر تو آوے | تو شکل مہر مقام پر تو آوے
مری غزل سے ہو "فیض" طائردل | جو کھول کھول تمام پر تو آوے

اِس دیوان کی چار پانچ غزلوں کے حاشیے پر لکھا ہے " شریک دیوان ثالث " جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس دیوان کو حضرت فیض نے کم سنی کاکلام سمجھ کر خارج کردیا تھا اور اِس میں سے صرف چند غزلیں اپنے بعد کے دیوانوں میں شریک کی تھیں - لیکن اُن کے مطبوعہ دیوان میں اِس دیوان کي شائد ایک هي آدہ غزل موجود ہے - اِس چشمۂ فیض کے سلسلے میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت کے فرزند میر حیات الدین " صاف " کے دیوان میں اِس دیوان کی بعض غزلیں بہ تبدیلی تخلص درج ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت " فیض " نے اِس" چشمۂ فیض" کو اِس طرح جاری رہنے دیا تھا کہ بعض غزلیں اُن کے بیٹے کے دیوان میں شامل کردي گئیں -

نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث کے عہد حکومت میں "فیض" کو نواب شمس الامرا کی وکالت کے علاوہ شاہی دربار سے بھی تعلق ہو گیا تھا - چنانچہ نواب سکندر جاہ کی زندگی ہی میں اُن کی جانشینی کے متعلق جب قیاس آرائیاں ہونے لگیں تو حضرت " فیض " نے صاف صاف اپنی رائے کا اعلان کردیا -

سایۂ دامان دولت میں سکندر جاہ کے
یوں تو کہنےکو سبھی ہیں چیدہ چیدہ آدمی
جز جناب ناصرالدولہ ریاست کے لیے
دوسرا کوئی نہیں ہے برگزیدہ آدمی

اِس عہد میں نواب شمس الامرا امیر کبیر بڑے سخن دوست اور علم پرور امیر تھے - ناممکن تھا کہ وہ ''فیض'' جیسی فنی کمال ہستی کو اپنی بارگاہ میں جگہ نہ دیتے - ''فیض'' بھی اُن کے ذوق علم و عمل کے مداح تھے - لیکن یہ مدحت طرازی حرص و ہوس کا نہیں ' خلوص اور علم دوستی کا نتیجہ تھی - معلوم ہوتا ہے کہ امیر کبیر نے حضرت ''فیض'' کو اپنے جملہ معاملات میں اپنا مشیر کار بنا لیا تھا اور اُن کی تصنیف و تالیف اور تراجم کی اشاعت کے اکثر مرحلے اِسی استاد سخن کے مشوروں سے طے ہوتے تھے - اُنکی تقریباً ہر کتاب کی ترتیب و طباعت میں 'فیض'' کو بھی دخل تھا - اکثر کتابوں کے نام اُنھیں نےتجویز کیے تھے اور قطعات تاریخی بھی لکھے تھے- مشہور اُردو کتاب ''ستۂ شمسیہ '' کی تاریخ تالیف اِس مصرعےسے نکالی ہے :—

شمس الامرا کی ہے یہ تالیف (۱۲۵۴ھ)

شمس الامرا کے لائق فرزند نواب عمدۃالملک رفیع الدین خاں کی کتاب ''صنعت عمدہ'' کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے:—

عمدۃالملک دام دولتہ چون پسندید دقت عمدہ
سال تاریخ او رقم زد ''فیض'' ہمگی ہست ''صنعت عمدہ''

تصنیف و تالیف کے علاوہ ''فیض'' نواب امیر کبیر کے تعمیری ذوق اور دیگر مشغولیتوں میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہے - نواب امیر کبیر نے قصر '' جہاں‌نما'' اور اُس کے بازاروں کی تعمیر میں جو جدت پیدا کی

تھی اُسکا شہرہ ہندوستان سے گزر کر یورپ تک پہنچ چکا تھا - اُن بازاروں کی تعمیر کی تاریخیں بھی "فیض" نے بڑی دلچسپ نکالی ہیں جو اُنکے مطبوعہ دیوان میں درج ہیں - یہاں نواب امیر کبیر کی وزارت اور وفات کے متعلق حضرت فیض نے جو تاریخیں لکھی تھیں اُنکے مادے بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں -

۱— تاریخ سرفرازی خدمت مدارالمہامی بہ نواب شمس‌الامرا امیر کبیر

(الف) وزیر مطلق شاہ دکن امیر کبیر (۱۲۵۶ھ) -

(ب) شمس‌الامرا شد وزیر نواب (۱۲۵۶ھ) -

۲—تاریخ وفات نواب شمس‌الامرا امیر کبیر -

(الف) شد امیر کبیر امیرارم (۱۲۷۹ھ) -

(ب) دلا کوئی ایسا ریاضی نہیں (۱۲۷۹ھ) -

حضرت "فیض" نے ایک دفعہ امیر کی سالگرہ کی تقریب میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جو اُن کے ملفوظات شہاب کے جمع کیے ہوئے دیوان میں موجودہے - یہ امر واضح رہے کہ اُنکے کلام میں سوا اِس ایک قصیدے کے کسی بادشاہ یا امیر کی شان میں اور کوئی قصیدہ موجود نہیں ہے - البتہ اُنکے مطبوعہ دیوانوں میں اُنکے نعتیہ قصیدے شامل ہیں - مدح امیر کبیر کے قصیدےمیں بھی کوئی ایسا شعرنظر نہیں آتا جو مبالغےیا بیجامدحت طرازی پر مبنی ہو - گویا یہ قصیدہ اُردو زبان میں اپنی قسم کا ایک ہی ہے اور چونکہ اُنکے مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہے اس لیے یہاں تمام و کمال درج کیا جاتا ہے :—

قصیدہ در مدح امیر کبیر

کھلا ہو لیوے جو تو ابروں میں ڈال گرہ

کبھی نہ کھول سکے ناخن ہلال گرہ

کروں نسیم کے صحن چمن میں ہاتھ قلم
کرے جو دانۂ شبنم کی پائمال گرہ

بہار خال جو دیکھیں کسی کے عارض پر
تو دیویں رشتۂ جاں میں ابھی بلال گرہ

نہ روبرو ترے پھر آئے گا مہ کامل
جبیں پہ ڈال نہ ، اے یار خوشخصال ، گرہ

خطا ہے دوں تری آنکھوں سے میں اگر تشبیہ
برنگ نافہ ہے یہاں ، دیدۂ غزال گرہ

ہوائے لطف تیری چل کے صحن گلشن میں
کرے ہے وا ، کئی غنچوں کی ، بے سوال گرہ

خیال خال لب گلعذار ہے جب سے
پڑی ہے دامن دل میں بھی خال خال گرہ

تری ہی کشمکش لطف سے کھلی ورنہ
دل حزیں کی مرے ، سخت تھی کمال گرہ

کہاں ہے فکر کے پنجہ میں گوہر مضمون
ہوئی ہے وا مرے ہاتھوں بڑی محال گرہ

سواد نقطۂ عشرت نظر کرے جو ترا
رخ بتاں کو نہ دکھلائے کوئی جال گرہ

مقابل اُسکے دُرگوش کے ہوئی ہے نسیم
چراغ صبح کسی اچھی نہیں ، نکال گرہ

پھر آج عقدہ کشا ہوے موج کی انگشت
حباب اسلیے پھرتا ہے یہاں سنبھال گرہ

غلط ہے ہمسری آفتاب، یہاں اُس سے
کہ قرص ناخن پا ہے، وہ بے مثال گرہ

شگوفہ، عقدۂ سربستہ وا کرے اپنا
جو کھولے بند قبا کسی وہ نونہال گرہ

جو زیر شانۂ دست کرم نہ آئے ترے
رہے گی کاکل خوباں کسی بال بال گرہ

کمند زلف سے تیری جو کرگیا پرواز
تو ہو زباں ہما میں رہا و بال گرہ

حصول جب سے کیا نقد سرخروئی کو
پھرے ہے غنچہ دکھاتا، چمن میں لال گرہ

جو تیرے گھر میں برس گانٹھ کا ہوا جلسہ
ہوئی ہے گلشن اُمید کی نہال گرہ

برنگ دانۂ انگور، دل پہ آبلے تھے
جب اپنی خاطر محزوں کا تھا ملال، گرہ

حباب مے کی طرح بے دماغ ہیں لیکن
ہمارے سر میں ہے اُس چشم کا خیال گرہ

شراب تاک پیے ساغر بلوریں میں
جو صبح چشم کی کھولے وہ ذی جمال گرہ

خجل ہو قطرۂ خوں سے تری، وہ آب ہوا
دل گہر میں رہا اب تک انفعال گرہ

بجھت زیب قبا تیری، تکمۂ زریں
ستارۂ سحری دیوے کھول کمال گرہ

یہی ہے آرزوے " فیض " اے اسہر کبیر
ہزار سال تک ہووے تیری سال گرہ

نواب سکندر جاہ کی وفات اور نواب ناصرالدولہ " آصفجاہ " رابع کی تخت نشینی کے وقت یعنی سنہ ۱۲۴۴ ھ میں حضرت " فیض " اُنچاس سال کے تھے اور علم و فضل اور شعر و سخن کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے ۔ نواب ناصرالدولہ بہادر کی تخت نشینی کے مادہ ہاے تاریخ نے حضرت فیض کی تاریخ گوئی کو شہرت دے دی تھی - اُنہوں نے اِن مصرعوں میں تاریخیں نکالی تھیں -

(الف) مرد میدان سکندرثانی (۱۲۴۴ ھ)

(ب) رونق خاندان آصفجاہ (۱۲۴۴ ھ)

اِس عہد سے قبل ہی شہزادہ مبارزالدولہ بہادر نے حضرت " فیض " کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا تھا - یہی مرشد زادے نواب آصف جاہ ثالث کی اولاد میں سب سے زیادہ علم و فضل اور مذہب و دینداری کے دلدادہ تھے- اور اُنکی افتاد طبع کی تعمیر میں حضرت " فیض " کو کافی دخل تھا- مشہور ہے کہ نواب مبارزالدولہ بعد کو بعض وہابی علما کی ترغیب سے وہابیت کی طرف مائل ہوگئے تھے - ممکن ہے کہ اُنکا یہ رجحان طبع " فیض " کی تعلیم و تربیت اور خیالات کا اثر ہو - کیونکہ کہا جاتا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ بھی علم و فضل اور معلومات کے زور میں پیری مریدی اور تصوف کے خلاف تھے اور مشائخین اور صوفیوں کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے - بعد میں نواب ناصرالدولہ کے عہد حکومت میں جب پیر شاہ ابراھیم سے اتفاقاً دو چار ہوئے تو یکایک خیالات میں انقلاب ہوگیا -اور کتابوں کی دنیا سے نکل کر تصوف و عرفان کی راہ اختیار کی - اور آخرکار خود بھی ایک بڑے صوفی اور اھل اللہ ہوگئے- اُن کے دیوان میں ابراھیم شاہ

صاحب کی مدح میں کئی اشعار نظر سے گزرے ھیں جن میں سے بعض یہ ھیں -

کیا لکھوں میں وصف ابراھیم کا　　ھے وہ مرآت ' احمد بے میم کا

ایک میں بھی عالم اُن کا سا نہیں　　گو یہاں عالم ھے ھفت اقلیم کا

کیا پتا اپنا بتاؤں "فیض" میں　　ھوں چمن پرورد ابراھیم کا

نواب مبارزالدولہ کے علاوہ نواب شمس الامرا امیر کبیر کے علم دوست اور شاعر مزاج صاحبزادے نواب حافظ محمد بدرالدین خاں معظم الدولہ معظم الملک تمیز بھی حضرت فیض کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے - یہ نیک دل نوجوان اپنے استاد کے بڑے عقیدت مند اور اچھے شاگرد تھے اور ھمیشہ استاد کو حسن نیازمندی اور تحفہ تحائف اور نذرانوں سے خوش کیا کرتے تھے - اگرچہ حضرت فیض بےطمع اور آزاد منش شخص تھے لیکن اپنے اِس شاگرد رشید کی مدح میں رطب اللسان ھیں -

(الف) رقم ھو کیسے عطائے معظم الدولہ
نہ یاں شمار میں تاروں کا جب خزینہ رھا
کرے کفاف جو دادودھش کو "فیض" اُس کی
نہ زمیں تو نہ ایسا کہیں دفینہ رھا

(ب) یہ آرزو ھے رھے جب تلک خداوندا
مبارزان جہاں کے حساب میں تلوار
چلے بفرق عدوے معظم الدولہ
جو ھے جناب شہ بوتراب میں تلوار

(ج) مداحی معظم دولہ کے فیض سے
ھیں کتنے کچھ فصیح غزل خوانوں میں ھم

اِس موقع پر خود معظم الدولہ تمیز کا وہ شعر بھی درج کرنے کے

قابل ہے جس میں اُنہوں نے اپنے استاد کے فیضان کی طرف اشارہ کیا ہے -

خدا کا فیض ہے جاری میں یہ دعویٰ کروں کیوں کر
کسی کا شعر میرے شعر سے بہتر نہ ہووے گا

شاعری کے علاوہ نواب تمیز ' خط ظفر میں بھی حضرت "فیض" کے شاگرد تھے - چنانچہ اُنہوں نے اپنے ناخن سے جو مرقع تیار کیا تھا اُس کے آخر میں حضرت "فیض" کا قطعۂ تاریخ بھی درج ہے :

از ناخن خود معظم الملک آراست ایں چنیں مرقع
اے "فیض" سنش بگفت مانی ناخن بدندم زد ایں مرقع

جب آصف جاہ رابع نے سنہ ۱۲۷۳ھ میں رحلت کی اور نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس تخت نشین ہوئے تو حضرت "فیض" کے تقدس اور قوت باطنی کا عام شہرہ تھا - اِس وقت اُن کی عمر اٹھتر سال کی تھی اور لوگ اُن کو "استاد کل" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے -

نواب ناصرالدولہ کی بے وقت وفات کا عام اہل ملک کی طرح اُن پر بھی بڑا اثر ہوا تھا - چنانچہ اُنہوں نے اِس سانحے کے متعلق کئی قطعات تاریخی لکھے ہیں جن میں سے دو کے مادہ ہائے تاریخ یہ ہیں -

(الف) بخلد لم یزل آمد جناب ناصرالدولہ (۱۲۷۳ھ) -

(ب) ناصرالدولہ بسپہر جلت آمد از محل (۱۲۷۳ھ) -

نواب افضل الدولہ کی تخت نشینی کی تاریخ بھی بڑی اچھی نکلی ہے ' فرماتے ہیں -

رئیس حیدرآباد دکن "فیض" ہے نواب افضل الدولہ بہادر
(۱۲۷۳ھ)

حضرت "فیض" نواب افضل الدولہ کے تقریباً آخری عہد تک زندہ رہے - چنانچہ آخر زمانے میں جب نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس پیدا ہوئے تو حضرت "فیض" کی عمر اٹھاسی سال کی تھی - اُنھوں نے اِس محبوب بادشاہ کی ولادت کے کئی تاریخی قطعات لکھے جن میں سے حسب ذیل مادہ‌ھاے تاریخ قابل ذکر ھیں -

(الف) رھے یارب سلامت شاہزادہ (۱۲۸۳ھ) -

(ب) چراغ دکھن (۱۲۸۳ھ) -

اِس طویل عرصے میں یعنی عہد نظام علی خاں آصف جاہ ثانی سے پیدائش محبوب علی خاں آصف جاہ سادس تک حیدرآباد جن سیاسی منازل سے گزر رہا تھا اُن سب سے حضرت فیض واقف تھے- خاص کر شمالی ھند کے واقعۂ غدر ۱۸۵۷ع نے اُن کو خاص طور پر متاثر کیا تھا - اُن کو اندیشہ تھا کہ کہیں انگریز آئندہ حیدرآباد کو بھی نقصان نہ پہنچائیں - اُس زمانے کے عام نقطۂ نظر کے مطابق وہ بھی اِس قوم کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے -

ھے دشمن دکھن وہ کلہ پوش جس نے "فیض"
غارت کیا ھے تختۂ ھندوستان کو
اپنی آتش بار آھیں دیکھ کر
بھاگ جائیں پلٹنیں انگریز کی
گیا مٹکف کسی بندر کے رستے
تری آمد اِدھر جو مارٹن تھی

آخری شعر بعنوان شباب کے کلام میں شامل ھے - اِس میں حیدرآباد کے دو ریزیڈنٹوں کا ذکر کیا ھے - پہلے مصرع میں سر چارلس مٹکف کی طرف اشارہ ھے جو حیدرآباد کے گیارھویں ریزیڈنٹ تھے اور

سنہ ۱۸۲۵ع تک یہاں قیام کیا تھا - اِن کے بعد چند روز کے لیے کیپٹن ایچ سی - پھارت نے ریزیڈنٹ کے فرائض انجام دیے - کیوں‌کہ سر چارلس مٹکاف کے جانشین ڈبلیو - بی مارٹن کو حیدرآباد پہنچنے میں چند ہفتوں کی تاخیر ہوگئی تھی - مارٹن حیدرآباد میں سنہ ۱۸۲۵ع سے ۱۸۳۰ع تک ریزیڈنٹ رہے - مصرع ثانی میں اُنہیں کا ذکر ہے - مصرع اول ہجوملیح کی حد میں آجاتا ہے -

شاعر اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے - اگرچہ وہ اپنے ماحول اور زمانے کے حالات اور سیاست کی کوئی جھلک اپنے کلام میں نہیں چھوڑنا چاہتا ' اور اِس قسم کے واقعات کے اظہار کو نفس شاعری کے لیے کسر شان سمجھتا ہے - تاہم اِس احتیاط کے باوجود اُس کی زبان یا قلم سے غیر ارادی طور پر ایسے شعر نکل جاتے ہیں جن کے متعلق وہ یہ محسوس بھی نہیں کرسکتا کہ زمانۂ آئندہ میں یہ اشعار اُس کے قلب و دماغ کی کیفیات اور رجحانات کی چغلی کھائیں گے اور اُن اسرار کو فاش کریں گے جن کے چھپانے کی اُس نے ہمیشہ کوشش کی تھی - متذکرۂ بالا اشعار کے علاوہ جن میں سیاست وقت کی جھلک نظر آتی ہے' حضرت " فیض" کے کلام سے اور باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ اُن کے عہد سے نصف صدی پیشتر ہی حیدرآباد میں شمالی ہند کے شعرا کی آمد شروع ہوگئی تھی اور حیدرآبادی شاعروں نے اپنی زبان و محاورہ کو غلط قرار دے کر اُن نووارد شاعروں کی شاگردی شروع کردی تھی - چنانچہ خود فیض بھی حافظ تاج‌الدین مشتاق دہلوی تلمیذ حضرت خواجہ میر درد کے شاگرد ہوگئے تھے - لیکن اِس تعلق کے باوجود وہ شمالی ہند سے آئے ہوئے شاعروں کے دعوائے زباں دانی کو بلا تحقیق تسلیم کرنا اور حیدرآبادی شعرا کے کلام کو بلا وجہ نظر حقارت سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے

کہ عہد حاضر کی طرح اُس زمانے میں بھی یہ احساس اہل دکھن کے جذبات خودداری کا جزو اعظم تھا' ورنہ فیض جیسا پاک باطن شاعر جذبۂ وطن پرستی اور اہل دکن کے اہل زبان ہونے کا اِس طرح اِظہار نہ کرتا ۔

رشک فردوس' چمن ہے اپنا
حیدرآباد' وطن ہے اپنا

حیدرآباد دکن میں ہیں ہم
چین سے اپنے وطن میں ہیں ہم

معشوق گورے گورے دکن میں ہیں اس لیے
میں لکھنئو گیا نہ فرنگی محل گیا

شعرا ہند کے سب "فیض" جلیں کیئے ہیں
حیدرآباد دکن خاص وطن ہے اُن کا

نہ کریں اہل زباں کی تقلید
کس لیے صاحب زباں ہیں ہم

آخری دو شعروں میں ہندوستان کے شعرا کی دکن میں مسلسل آمد اور اہل دکن کو غیر اہل زبان سمجھ کر تقلید پر مائل کرنے کی طرف طنزاً اشارہ کیا گیا ہے - حضرت " فیض" جیسی باکمال ہستی کا یہ طعنہ خاص اہمیت رکھتا ہے - اُنھیں کسی سے رشک تھا نہ حسد اور نہ کسی شاعر کی قدر افزائی اور ملازمت سے سروکار - وہ فکر معاش سے بے نیاز تھے - اُن کے دادا مولوی میر رحمت اللہ اور والد میر امیرالدین دونوں ارباب فضل و کمال اور صاحبان منصب و ثروت تھے - اِس خاندانی وجاہت کے علاوہ علنفوان شباب سے حضرت "فیض" کی کافی قدر و منزلت تھی- اولاً نواب مبارزالدولہ کی تعلیم اُن کے سپرد ہوئی اور پانسو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا - اِس کے

علاوہ مسلسل اُن کے مدارج و مناصب میں اضافہ ہوتا رہا - فیاض ازل نے حضرت " فیض" کو دولت باطنی یعنی علم و فضل کے ساتھ عزت و ثروت سے بھی نوازا تھا - اِس کا اندازہ اُن کے ایک خاص شاگرد بہاری لال رمز کی تحریر سے ہوتا ہے - یہ خود رمز کی لکھی ہوئی یادداشت ہے جو اِس وقت زیر نظر ہے - اپنے حالات کے ضمن میں اپنے قلم سے اپنے استاد و مرشد کے متعلق یوں رقمطراز ہیں :—

" برائے تعلیم مبارزالدولہ بہادر مرشد زادۂ والی دکن بمقرر پانصد روپیہ ماہانہ مقرر شد - من بعد برائے تعلیم بدرالدین خان بہادر صاحبزادۂ نواب شمس‌الامرا امیر کبیر اولیٰ سہ صد روپیہ ماہانہ بعد چندے برائے شہریارالملک بماہ مذکور و بعد در زمانۂ سراج‌الملک و سر سالار جنگ بہادر دوصد روپیہ بلا ترقی معاش و خدمت بیاد الہی و عزلت نقد عمر صرف نمودہ - "

حضرت " فیض" کے صاحب زادوں کا بھی منصب مقرر تھا اور اُستاد زادے و مرشد زادے ہونے کے حیثیت سے اِن سب کے خاص اعزاز تھے اور عمر بھر اُن کی قدر و منزلت ہوتی رہی - غرض منصب ' تنخواہ اور اعزاز کے لحاظ سے حضرت "فیض" کی زندگی امیرانہ زندگی تھی مگر اُنکے ذاتی اخراجات و حالات زندگی صوفیائے کرام کی طرح نہایت سادہ و صاف تھے - اُن کے متعلق مشہور ہے جیسا کہ محبوب‌الزمن میں لکھا ہے :—

" مزاج میں کسر نفسی زیادہ تھی - تکلف ظاہری سے متنفر تھے - مکان میں فرش بوریا ہوتا تھا - اُسی پر امرا ' غربا آتے تھے اور بیٹھتے تھے " صفحہ (۹۱۶) -

اِس بیان کی تصدیق محمد ہدایت اللہ خاں "رواج" جاگیردار و نائب معتمد پائیگاہ خورشید جاہی کی اُس تقریظ سے بھی ہوتی ہے جو دیوان فیض

مرتبۂ مظفرالدین خاں ''معراج'' کے ساتھ شائع ہوئی ہے - اُس میں لکھا ہے ''بالجملہ در اسباب ظاہری تکلف نمی خواست و فرش آں بے ریا بوریائے بود کہ ہر کہ از امیر و فریب می آمد بر آں می نشست'' صفحہ (۱۱۰) -

حضرت '' فیض'' محتاجوں اور مستحقوں کی ہر طرح امداد کرتے تھے - جو اُن کے یہاں آتا خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا - وہ اپنی طبیعت کے بالکل بر خلاف' سفارشوں سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے- چنانچہ اُن کے معاصر حکیم غلام حسین خاں نے گلزار آصفیہ میں اِس بارے میں خاص طور پر زور دیا ہے :—

''در برآمد کار ارباب احتیاج بدمے یا درمے یا قدمے یا قلمے مستثنائے زمانہ کہ این مقدمہ خیلے مشکل تر است علی الخصوص دریں وقت کہ پدر برائے پسر زبان سعی و کوشش دراز نمی کند تا برائے غیر چہ کند''- صفحہ (۳۲۳) -

حضرت '' فیض'' کی حاضر جوابی ' بذلہ سنجی ' اور بدیہہ گوئی بھی بہت مشہور تھی - محبوب الزمن اور دیوان فیض کی تقریظوں وغیرہ میں اِس کے متعلق بعض قصے درج ھیں جن میں سے چند اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیے جاتے ھیں -

۱—ایک دفعہ ایک بزرگ اُن کی ملاقات کو آئے - اثنائے تقریر میں خشمناک ہوکر تعلی سے فرمایا کہ :—

'' تم اگر دیکھنا چاھتے ہو تو میں اپنے کو ابھی شیر کی شکل میں ظاہر کروں '' - حضرت ''فیض'' نے مسکرا کر جواب دیا کہ شیر حیوان ہے بہتر ہے کہ آپ انسان بنیں - اِس برجستہ جواب پر اُن بزرگ کو شرمندہ ہونا پڑا -

۲— ایک روز ایک بدتہذیب نے حضرت "فیض" کا مضحکہ اُڑانے کی غرض سے سوال کیا کہ جناب کے تخلص خاص یعنی فیض کا قافیہ کیا ہوگا ؟ آپ نے فوراً جواب میں یہ مصرع پڑھ دیا :—

ع آں کہ بدائے وجود تست

۳— آپ کے ایک شاگرد میر شجاعت علی کرم نے عرض کیا کہ پیر و مرشد ایک مصرع کہا ہے :—

ع دانے نہ آپ سبحۂ سمرن کے دیکھیے -

مگر اِس کا دوسرا مصرع نہیں لگتا ، حضرت "فیض" نے بلا تامل ارشاد فرمایا :—

ع منکے ڈھلے ہوئے مری گردن کے دیکھیے -

۴— مولوی احمد علی خلف اکبر علی خاں فصاحت جاہ نے ایک مصرع (سکندرطالع جمشیدسطوت) بھیج کر دریافت کیا کہ یہ مادۂ تاریخی ہے ، اِسمیں لفظ طالع کے ساتھ اضافت جائز ہے یا نہیں -

حضرت "فیض" نے اپنے شاگرد خاص نواب مشرف جنگ فیاض کو اشارہ کیا کہ اِس کے جواب میں لکھدیں کہ :—

" کسر طالع داخل کسر شان فصاحت است از آنکہ حاصل سکندر طالع جملہ است و جملہ موصوف نمی شود - کمالایخفی علی الفصیح والبلیغ و دیگر ایں کہ محل مقتضی وصل است و قائل درپے فصل - وایں هم قباحت است - اگر مصرع بہ ایں طور شود (سکندر طالع و جمشید طلعت) اولیٰ و موافق مقصود و خالی از عیب بود - "

اِسی طرح کی اور بھی مثالیں پیش نظر ہیں، مگر اُن سب کا اِس جگہ پیش کرنا باعث طوالت ہے- یہ امر واضح ہے کہ حضرت "فیض" بڑے بذلہ سنج اور بدیہہ گو تھے اور یہ خصوصیات اُن کے دیگر کمالات کے مقابلے

میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں - اُن کی غیر معمولی ذہانت اور جودت طبع اُن کے خط ظفر سیکھنے کے واقعے سے بھی ظاہر ہوتی ہے - وہ حیدرآباد میں خط ظفر کے موجد مانے جاتے ہیں اور اُن کی توجہ سے اکثر نوجوانوں نے بھی یہ کمال حاصل کیا تھا - ایک ولایت‌زا ماہر فن ناخن کی تحریریں دیکھ کر حضرت ''فیض'' بہت خوش ہوئے اور اُس سے یہ خواہش کی کہ یہ خط اُنکو بھی سکھا دے - مگر وہ اِسمیں بخل کرتا اور نہیں چاہتا تھا کہ حیدرآباد میں اُس کے سوا کوئی اور اِس خط سے واقف ہو - حضرت ''فیض'' نے خود ہی اُس کا گُر معلوم کیا اور مشق شروع کردی - چند روز کے بعد ایسا کمال بہم پہنچایا کہ اُن کی شہرت خود اُس ولایتی ماہر فن تک پہنچ گئی - یہ سن کر ایک روز وہ ایک قطعہ لیے ہوئے حضرت ''فیض'' کے یہاں پہنچا - وہ اُس قطعۂ کاغذ کو لیکر مکان میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر میں بالکل ویساہی قطعہ تیار کر کے باہر تشریف لائے - ولایتی ایک ہی طرح کے دو قطعے دیکھ کر حیران رہ گیا ' اور بالکل تمیز نہ کرسکا کہ اُس کے ناخن کا قطعہ کون‌سا ہے اور مولانا کا کون‌سا - اُس کو بڑا افسوس رہا کہ کاش وہ مولانا کی استادی کا شرف حاصل کر لیتا - مولانا کے ناخن کے متعدد قطعات نواب مشرف جنگ نیاض کے کتب خانے میں ابھی تک موجود تھے مگر افسوس ہے کہ اِس مضمون کی تحریر کے وقت دستیاب نہ ہو سکے' ورنہ اُن کا عکس شائع کر دیا جاتا - البتہ مولانا کے ایک خاص شاگرد حافظ بدرالدین خاں نواب معظم‌الملک تمیز کا مرقع خط ظفر اِس وقت تک نواب معین‌الدولہ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے جسکے چند قطعات کے عکسی بلاک مرقع سخن جلد اول و دوم میں شائع ہو چکے ہیں - اِس مرقع کے لیے مولانا نے جو قطعہ لکھا تھا اور غالباً خود اپنے ناخن سے مرقع تمیز کے آخر

میں درج کیا تھا وہ اِسی مضمون میں اوپر گزر چکا ہے - اُنکا مادۂ تاریخ نہایت لا جواب ہے - یعنی

ناخن بدلم زد این مرقع (۱۲۵۹ ھ)

حضرت " فیض " بڑے پرگو شاعر تھے - تقریباً اڑسٹھ سال اُردو ادب اور شعر و شاعری کی خدمت انجام دی - بائیس سال کی عمر میں اُنھوں نے ایک دیوان مرتب کر لیا تھا - جس سے پتا چلتا ہے کہ بیس سال کی عمر یا اِس سے پہلے ہی سے شعر کہنا شروع کردیا تھا - اُن کے ابتدائی دیوان " چشمۂ فیض " کا ایک شعر پہلے نقل کیا جاچکا ہے ' جس میں ۲۲ سال کی عمر بتائی گئی ہے - غرض عنفوان شباب سے وقت رحلت تک وہ برابر شعر کہتے رہے - نواب میر محبوب علی خان آصفجاہ سادس کی ولادت کی تقریب میں اُنھوں نے جو متعدد بلند پایہ قطعات تاریخی لکھے وہ اُن کی وفات سے پانچ چھے ہفتے قبل کی تصنیف ہیں -

حضرت " فیض " نے جسوقت شاعری شروع کی تھی حیدرآباد میں شاہ تجلی متوفی (سنہ ۱۲۱۵ ھ)' لچھمی نارائن شفیق (سنہ ۱۲۱۵ ھ) شیر محمد خان ایمان (سنہ ۱۲۲۰ ھ) اور محمد صدیق قیس (سنہ ۱۲۳۰ ھ) جیسے دکنی اساتذۂ سخن موجود تھے - اُنھیں کے پیدا کیے ہوئے ادبی ماحول میں " فیض " کی شاعری کی نشوو نما ہوئی - اور ابھی اُن کا آغاز شباب ہی تھا کہ حیدرآباد کے اکثر بلند پایہ شاعروں نے انتقال کیا - تعجب ہے کہ اُن کے بعد کوئی ایسا شاعر حیدرآباد میں (فیض کے علاوہ) پیدا نہ ہوسکا جو اُنکی جگہ لیتا - اور سچ تو یہ ہے کہ خود "فیض" کی ترقی اور شہرت بھی ایک معجزے سے کم نہیں ہے - جب دیکھا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں شمالی ہند کے اکثر اساتذۂ سخن مثلاً شیخ حفیظ

شاہ نصیر ' آفاق ' شہرت ' مرھون ' صفا ' وصفی اور شہید وغیرہ موجود تھے اور اِن سبھوں نے یہاں کے درباروں اور مشاعروں میں اپنی شاعری اور زباں دانی کا رنگ جما رکھا تھا - اِن اہل زبان شعرا کے مقابلے میں حضرت فیض کا مستقل جگہ پیدا کرلینا اور قبول خاطر و لطف سخن میں روز بروز ترقی کرتے جانا اُن کے غیر معمولی کمال اور قادرالکلامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے - مشہور ہے کہ ایک دفعہ شاہ نصیر مہاراجہ چندو لال کے مشاعرے میں اِس نو جوان کا کلام سنکر بےتحاشا بول اُٹھے تھے کہ -

" یہ آفت کا پُتلا ہے ' ہونہار ہے ' عنقریب رنگ دکھلائے گا "

حضرت "فیض" کا اپنے اُن معاصر شعرائے دھلی اور لکھنؤ کے کلام سے متاثر ہونا ضروری تھا ' چنانچہ اُن کے کلام میں شاہ نصیر کا رنگ خاص طور پر جھلکتا ہے ' اور وہ بھی سنگلاخ زمینوں اور مشکل سے مشکل قافیوں اور ردیفوں کے استعمال کا التزام ضروری سمجھتے ہیں - حیدرآباد کی شاعری کیلیے یہ امر نقصان دہ ثابت ہوا کہ اُس زمانے میں اکثر ایسے ہی شاعر شمالی ہند سے دکن میں آئے جو خیال اور مطالب و معانی و زبان سے زیادہ ضلع جگت اور صنعت ایہام پر زور دیتے تھے - اگر حفیظ آفاق ' مشتاق اور شاہ نصیر کے بجائے "فیض" میر تقی میر کے رنگ پر چلتے تو یقین ہے کہ اُن کا کلام اِس سے زیادہ مقبول ہوتا - میر کے انتقال کے وقت "فیض" کی عمر تیس سال کی تھی اور اُن کا پہلا دیوان اِس سے کئی سال قبل مرتب ہو چکا تھا -

حضرت "فیض" کے چار اردو دیوان مرتب ہوئے تھے' پہلا دیوان "چشمۂ فیض" تو اِس وقت موجود ہے ' لیکن بقیہ تین دیوان ابتک دستیاب نہو سکے - " چشمۂ فیض " کا ذکر اوپر گزر چکا ہے' یہ اِس لیے اہم ہے کہ

اِس کا کلام مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہے اور اِس کے مطالعے سے اُن کی ابتدائی زندگی اور خیالات کے متعلق بعض ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں جن سے اِس مضمون میں جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے۔ حضرت ''فیض'' کے بقیہ تین قلمی دواوین کا ذکر اِسی چشمۂ فیض کے حاشیوں میں ملتا ہے - جن کا ذکر گزر چکا ہے - اگر یہ دیوان بھی مل جائیں تو یقین ہے کہ ہماری معلومات میں اور اضافہ ہوگا - معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان اُن کی وفات کے بعد یا تو کسی طرح تلف ہوگئے یا کسی شاگرد یا معتقد کے یہاں رہ گئے - کیونکہ بعد میں مختلف شاگردوں کی طرف سے جو دو دیوان طبع کیے گئے اُن کے مُرتّبوں نے اُن دواوین کا کہیں ذکر نہیں کیا -

حضرت '' فیض '' کا پہلا مطبوعہ دیوان '' گلدستۂ عرفان'' کے نام سے سنہ ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوا - اِس کے مرتب خواجہ جمال الدین مطلب تھے ' جنھوں نے اِس کام میں اور دو اصحاب حمید الدین اور سید احمد سے بھی مدد لی - ''مطلب'' مثنوی خواں تھے اور بعض تلامذۂ فیض اُن کو '' جانشین خاص حضرت فیض '' تصور کرتے ہیں جیسا کہ اِس دیوان کی تقریظ سے ظاہر ہے - اِس گلدستۂ عرفان کی طباعت وغیرہ کے سلسلے میں نواب معزز جنگ خواجہ عالم علی خاں (جمعدار عرب) اور شجاعت خاں جری (مددگار نواب اکرام جنگ) نے مالی امداد و اعانت کی تھی - یہ دیوان بڑی تقطیع کے ۳۵۶ صفحات پر مشتمل ہے - اِس میں قریب قریب ساڑھے سات ہزار اشعار جمع کیے گئے ہیں- اِس کے آخر میں شجاعت خاں جری کی تقریظ کے علاوہ حکیم محمد فاضل حکیم مقصود علی جفا ' غلام محبوب خاں محب اور خواجہ جمال الدین مطلب کے قطعات تاریخی بھی درج ہیں -

اِس دیوان کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی سنہ ۱۳۰۱ھ میں حضرت " فیض " کا ایک اور دیوان " مرقع فیض " بھی شائع ہوا - جس کو حضرت " فیض " کے فرزندوں سے اجازت لے کر حکیم مظفر الدین خاں مزاج اور نواب مشرف جنگ فیاض نے مرتب کیا اور اول الذکر کے فرزند منور الدین خاں علاج نے شائع کیا تھا - اِس کی ترتیب اور تقطیع وغیرہ گلدستۂ عرفاں سے بہتر ہے اور غلطیاں بھی کم ہیں - اِس میں ۴۸۰ اردو کے اور ۱۳۶ فارسی کے جملہ ۶۱۶ صفحات ہیں؛- اشعار کی تعداد تقریباً اُتنی ہی ہے - البتہ اِسکی بعض تقریظیں نہایت دلچسپ اور پر از معلومات ہیں - اِن میں منور الدین خاں علاج ' ہدایت اللہ خاں رواج اور مظفر الدین خاں مزاج نے حضرت " فیض " کے متعلق ضروری معلومات قلمبند کردی ہیں - اِن کے علاوہ متعدد شعرا کے قطعات تاریخی بھی شامل ہیں جن میں احمد علی قاضی ' عبدالعلی طپش ' کاظم علی شعلہ ' انور خاں الفت ' عبداللہ عجب ' عبدالقیوم حفظ ' مظفر الدین خاں مزاج ' میر احمد علی عصر ' عباس حسین ششدر ' محمد علی خاں بخشی کے علاوہ تلامذۂ "عصر" میں آصف یاورالملک وزیر ' نام ' شرف ' عشق اور تلامذۂ مزاج میں تپاس ' خطاب ' مغز ' دماغ ' سیف ' رواج اور علاج وغیر کے نام قابل ذکر ہیں -

گلدستۂ عرفاں کی موجودگی میں اِس دیوان کو شائع کرنے کی ضرورت اِس کی تقریظ میں ہدایت اللہ خاں رواج نے اِس طرح ظاہر کی ہے -

" دریں زماں شہرت طبع دیوان مولانا گوش‌خورد زماں و زمانیاں شدہ ' جائے عمداً بالاحاظ رفع غلطی کتابت دیوان مولانا بہ تقطیع نازیبا و خط نادرست بطبع نا مطبوع در آمدہ ' و اکثر

جا مطلب فوت شدہ ' امید از ناظرین با انصاف و شایقین سہل صاف آنست کہ ہر دو دیوان را بچشم انصاف کہ خیرالاوصاف است باعتبار حسن ترتیب و تصحیح بلیغ ملحوظ فرمودہ شرط حق پسندی از دست نخواہند داد " -

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت " فیض " کا بہت سا کلام یا تو تلف ہو گیا ہے یا اُن کے شاگردوں اور معتقدوں کے دواوین میں شامل ہے ورنہ ایک ایسے پرگو شاعر کا کلام جس نے اَسّی سال شعر و شاعری میں گزار دیے چار سے زیادہ دواوین پر مشتمل ہوتا - اِس کے علاوہ اِس میں ایسے کلام کے بھی وافر نمونے دستیاب ہوتے جو مطالب و معانی کے لحاظ سے بے نظیر ہوتے - اور جس میں محض زبان و محاورہ کی خوبیوں اور نزاکتوں کو امتیاز حاصل نہ ہوتا - ایسے شاعر جو محاورہ بندی اور زبان کی خوبیوں اور لغات کا اپنے کلام میں لحاظ رکھتے ہیں اور اپنی شاعری کو خدمت زبان کے لیے وقف کر دینا چاہتے ہیں ' صاف اور پاکیزہ اشعار کی پروا نہیں کرتے ' اور جب کبھی قادرالکلامی کی وجہ سے ایسے شعر نکل جاتے ہیں جن میں زبان ' محاورہ یا صنائع و بدائع کے لحاظ سے کوئی خاص ندرت نہو تو اُن کو اپنے شایان شان نہ سمجھہ کر اپنے تلامذہ کو دیدیتے ہیں - یہ امر یقینی ہے کہ حضرت " فیض " نے اپنا اِس قسم کا کلام اپنے تلامذہ یا فرزند کو دیدیا تھا اور اِس طرح سے اُن کے کلام کا بہت سا حصہ جو زمانۂ مابعد میں اُن کی شہرت قائم رکھنے میں مدد ومعاون ہوتا یا مطالب و معانی پر نظر رکھنے والوں کی تشفی کرسکتا اُن کے دواوین سے خارج ہو گیا - اردو زبان کی تاریخ میں ہر جگہ اور ہر وقت یہی ہوتا رہا ہے کہ زبان و محاورہ کا خیال رکھنے والے شاعر (مثلاً سودا ' انشا ' ذوق)

اپنی زندگی میں قدر و منزلت حاصل کرتے رہے لیکن اُن کے بعد جب اُن کا کلام پڑھا جاتا ہے تو پڑھنے والوں کو وہ لطف حاصل نہیں ہو سکتا جو خود شاعر کی زبان سے سننے والوں کو حاصل ہوا تھا - اِسی طرح جو شاعر مطالب و معانی پر زیادہ زور دیتے ہیں وہ اپنی زندگی میں اُتنے مشہور نہیں ہوتے جتنے بعد میں ہوتے ہیں ، اور زمان و مکان کا یہ فرق جتنا زیادہ ہوتا ہے اُتنی ہی اُن کی شہرت بڑھتی جاتی ہے - میر اور غالب کی مقبولیت میں یہی راز مضمر ہے -

حضرت " فیض " نے زبان و محاورہ پر جو زور دیا ہے اُس کا ایک سبب تو شاہ نصیر اور آفاق جیسے شعرا کا اثر ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے- اِس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے زمانے میں شمالی ہند کے متعدد شعرا حیدرآباد میں موجود تھے جو حیدرآبادی شاعروں کو اہل زبان نہیں سمجھتے تھے اور اُن کے کلام کو زبان کے لحاظ سے کم درجے کا قرار دیتے تھے - اُن کے مقابلے میں حضرت " فیض " یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حیدرآبادی شاعر بھی شمالی ہند کے شعرا کے برابر زبان و محاورہ کا استعمال جانتے ہیں - اپنے اِس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے - کیونکہ اُن کے کلام کو اہل شمال نے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا - اُن کے دیوان کی تقریظ میں اِس بارے میں ہدایت اللہ خاں رواج نے لکھا ہے :—

" در سروش سخن کہ افسانہ ایست از صاحب زمان شاگرد غالب بر موقعے شعر مولانا درج است " -

نمک چھڑکا کیا اچھا ہوا " فیض " دھاں زخم اب تک بے مزا تھا

حاصل کلام ہندیان ہم بکلام خود کلام فیض‌التیامش را جا دادہ اند " (صفحہ ۱۱۰) -

اِس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت " فیض " کا کلام صحت زبان اور محاورہ بندی کی وجہ سے کافی مشہور ہوا اور اِس خصوصیت نے ایسی شہرت پائی کہ اُن کے مخالفین نے بعض ایسے شعر خود لکھکر اُن سے منسوب کر دیے جس میں کوئی محاورہ طنزاً استعمال کیا گیا ہے - اور چونکہ حضرت " فیض " کی یہ خصوصیت بہت مشہور تھی اس لیے اُن کے معتقدین بھی اِس قسم کے اشعار تو اُنھیں کا سمجھتے تھے - چنانچہ نواب کریم الدین خاں فرزند مشرف جنگ نہاض نے لکھا ہے کہ

" صاحب گلزار آصفیہ نے حضرت " فیض " کا ذکر علما اور شعرا کے ضمن میں علیحدہ علیحدہ کیا ہے - چند شعر بھی نموتاً لکھے ہیں' جن میں ایک یہ ہے -

" سرہ گالیاں کھاتے کھڑے ہو ارے میاں "فیض" کیاچکنےگھڑےہو

میرے پاس گلزار آصفیہ کی جلد ہے جس میں حضرت والد مغفور نے اپنے قلم سے یہ نوٹ تحریر فرمایا ہے - " یہ شعر حضرت موصوف کا نہیں ہے ' خود میں نے حضرت " فیض " سے اِس کی تصدیق کر لی ہے " -

اِس سلسلہ میں ایک اور واقعے کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ حضرت " فیض " کے حیدرآباد کے معاصرین میں حیدر حسین خاں حیدر ایک مشہور استاد سخن اور صاحب ثروت شاعر تھے - اُن کے تلامذہ کا بھی ایک بڑا گروہ تھا جن میں سید عبداللہ حسینی افسر ' حافظ انوار اللہ انور اور مظفر الدین معلی قابل ذکر ہیں ـ تلامذۂ حیدر نے بعض مشاعروں میں " فیض " اور اُن کے تلامذہ پر چوٹیں بھی کیں تھیں ' لیکن ایک دفعہ کسی مشاعرے میں حضرت " فیض " اور جناب حیدر دونوں موجود تھے اور موخرالذکر کے ایک نوجوان شاگرد نے جب اپنی غزل میں ایک عامی محاورہ باندھ کر حضرت " فیض " پر چوٹ

کرنے کے لیے یہ مصرع پڑھا کہ ع " فیض " ہے جوتیوں میں حیدر کی - تو حضرت " فیض " سروقد کھڑے ہو گئے اور اُس نوجوان کو جھک کر سلام کیا - اِس واقعے کا حیدر اور اُن کے تلامذہ پر اِتنا اثر ہوا کہ اُس وقت سے طعن و تعریض بند ہو گئی اور وہ بےباک شاعر تمام عمر اپنی اِس بےادبی پر نادم رہا -

زبان و محاورہ بندی کے علاوہ کلام " فیض " کی دوسری اہم خصوصیت تصوف و عرفان کی جھلکیں ہیں - اُن کے آخری دور کے کلام میں یہ رنگ بہت گہرا ہے، اور بعض شعر تو صاف طور پر اپنے لکھنے والے کے اہل اللہ اور صاحب باطن ہونے کی گواہی دیتے ہیں - اُن کی غزلیں مجالس سمع میں خاص کیفیت پیدا کرتی ہیں - خاص کر حسب ذیل شعر بہت مشہور ہیں -

کریں ہم کسکی پوجا اور چڑھائیں کسکو چندن ہم
صنم ہم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم
در و دیوار ہے نظروں میں اپنی آئینہ خانہ
کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہی اپنا آپ درشن ہم
محبت ہے تو اپنے سے، عداوت ہے تو اپنے سے
ہیں آپ ہی دوست اپنے ہم، ہیں آپ ہی اپنے دشمن ہم
ہوا اے "فیض" معلوم ایک مدت میں، ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

حضرت "فیض" فارسی کے بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے اور زیادہ تر حافظ کے رنگ میں کہا کرتے تھے - اُن کے اردو دیوان کے آخر میں تیرہ ہزار شعر فارسی کے بھی شائع کیے گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اِتنا ہی فارسی کلام مُرتّبین کو دستیاب ہو سکا؛ کیونکہ اُن کا فارسی دیوان

چوری گیا تھا - چنانچہ مظفرالدین خاں معزاج اپنی تقریظ میں رقمطراز ھیں:—

''دیوان آں حضرت بدست حوادث روز گار سرقت‌شعار افتاد کہ نشانے ازاں بدست نیامد - بعدھ غزلیات و اشعارے کہ فراھم شدہ بود با دیوان اُردو بحملۂ طبع جلوۂ ظہور نمود '' -

''فیض'' کے موجودہ فارسی کلام میں (۷۰) غزلوں (۵۷) رباعیوں اور (۷) نعتیہ قصیدوں کے علاوہ جامی و حافظ کی غزلوں پر مخمسات اور مثلثات نیز متعدد قطعات تاریخی بھی شامل ھیں - بہت سی فارسی غزلیں نئی بحروں میں لکھی گئی ھیں - جو خود مصنف کی ایجاد کردہ ھیں- اِن غزلوں پر مرتب دیوان نے کئی بحروں کا نام اور وزن‌وغیرہ بھی درج کر دیا ھے -

مثال کے طور پر اِس قسم کی چند بحریں اور غزل کا ایک ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ھے -

۱— بحر طویل مثمن سالم فرع طویل ارکان اُو—مفاعیلن مفعولن مفاعیلن مفعولن مستخرجۂ صاحب دیوان -

مطلع—رخ جاناں چہ باشد مقابل بہ دل ما
بود مانند عنقا چہ عالی منزل‌ما

۲— بحر مشابہ مثمن سالم فرع مضارع ارکان اُو—فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن چار بار مستخرجۂ صاحب دیوان -

مطلع— شرف من‌چہ‌می پرسی بخدمت ناقص تمامم کرد
بادہ با تو حلالم شد آب بے تو حرامم شد

۳— بحر بدیع مسدس سالم فرع سریع ارکان اُو— مفعولات مستفعلن - مستفعلن شش بار مستخرجۂ صاحب دیوان -

مطلع—ہمدم باتو بر لا مکان شاہی شد

در پے غم تو تشویش چہ ماہی شد

۴—بحر مجرد مسدس سالم نوع جدید — ارکان آن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن شش بارمستخرجۂ صاحب دیوان -

مطلع—آرام ما عارض دلجوے أو باشد

بہرام ما چشم پر جادوے أو باشد

فارسی غزلوں کے آخر میں بھی قطعات و مصرعہاے تاریخي درج ھیں جو ڈیڑھ سو سے زیادہ ھیں- استخراج تاریخ میں "فیض" کو خداداد ملکہ حاصل تھا - دکن کے کسی اور شاعر نے اِتنی تاریخیں نہیں نکالیں- چنانچہ خاندان امیر کبیر ھی سے متعلق اُنھوں نے پانچ ہزار تاریخیں استخراج کی تھیں - اِس کے متعلق اِسی خاندان کے ایک غلام اور وابستہ "رواج" نے لکھا ھے کہ -

" دراستخراج تاریخ ' ملکہ میداشت کہ عقل از رسائیش می ماند مصرعہاے تواریخ تولد صرف در خاندان امیر کبیر پنجہزار فرستادہ و داد سخن پروری دادہ - ہر کہ تاریخ می خواست فی‌الوقت بنامش نوشتہ می داد "

(مرقع فیض صفحہ ۱۰۸)

خود تاریخیں استخراج کرنے کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی ایک آسان طریقہ ایجاد کرکے شائع کر دیا تھا ' جو جدول فیض اور دائرۂ لولبی کے نام سے موسوم اور مشہور ھے - اور یہ دیوانوں میں بھی شائع کردیا گیا ھے - جو اصحاب اِس فن میں کمال حاصل کرنا چاھتے ھوں اِس جدول فیض اور دائرۂ لولبی کا ضرور مطالعہ کریں - اِس کے ذریعے سے ایک معمولي فہم کا انسان بھی آسانی کے ساتھ مادۂ تاریخ

یا مصرع تاریخ موزوں کر سکتا ہے۔ دواوین اردو و فارسی کے بعد رسالہ "فیض جاری" کا ذکر ضروری ہے جو خالق باری کے طرز پر بشکل مثنوی لکھا گیا تھا - نواب شمس الامرا امیر کبیر کے قائم کیے ہوئے مدرسوں میں پڑھانے کے لیے اِس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی - چنانچہ اُنھیں کی فرمائش پر سنہ ۱۲۵۶ھ میں یہ رسالہ مرتب کیا گیا اور اُنھیں کے مطبع میں چھپا تھا - اِس کے آخر میں لکھا ہے "موافق عدد نام مولوی شمس الدین محمد کے چھ سو اُناسی بیت پر سوائے دو بیت ہیں" لیکن شمار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں در اصل سات سو اکہتر (۷۷۱) ابیات ہیں -

" فیض جاری " کے سلسلے میں ایک اور کتاب خزانۃالامثال کا ذکر بھی ضروری ہے جو اردو کی اصطلاحوں اور لغات سے متعلق لکھی گئی تھی - افسوس کہ یہ کتاب اِس مضمون کی ترتیب کے وقت دستیاب نہ ہوسکی- لغات و اصطلاحات کی کتابوں کے علاوہ حضرت "فیض" نے صرف و نحو پر بھی کئی کتابیں لکھی تھیں' جن میں سے ایک "شمس التصریف" اِسوقت نواب عزیز یار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے - اِس کا ذکر آگے کیا جائے گا - دیگر کتب مثلاً شمس النحو ' شرح منظومۂ صرف ' رسالہ درمیان ناسخ و منسوخ ' طریق الفیض ' شرح مائۃ عمل ' شرح کلمۃالحق اور مفید دراحکام حلت و حرمت وغیرہ بھی اِس مضمون کی ترتیب کے وقت نہ مل سکیں -

فن عروض وغیرہ پر بھی اُنھوں نے دو کتابیں موسوم متن مہر شمس الدین (۱۲۳۵) اور شرح مہر شمس الدین لکھی تھیں - جن میں پہلی کتاب خود اُنھیں کی زندگی میں تلف ہو گئی ' جسکا ذکر موخرالذکر

کی تمہید میں خود حضرت "فیض" نے اِس طرح کہا ہے :—

"قبل ازیں رسالۂ مختصر مسمی بہ " متن مہر شمس الدین " کہ مادۂ تار یخش ہمیں بود در سنہ ۱۲۳۵ھ یک ہزار دو صد و سی و پنج ہجری تالیف نمود - از اتفاقات زمانہ آشنائے بنابر نقل درخواست کردہ شیرازۂ جمعیتش را پریشان ساخت - بعد چندے باظہار این معنی پرداخت " -

دوسری کتاب "شرح مہر شمس الدین" حسن اتفاق سے اِس وقت تک نواب محمد کریم الدین خاں کے کتب خانے میں محفوظ ہے - اِس کا موضوع فن شعر خاص کر عروض وقوافی اور صنایع و بدایع ہے - متوسط تختی کے (۱۱۵) صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں - اِسکا سبب تالیف یہ لکھا ہے -

" بحسب استدعاء بعض احباء خصوص بپاس خاطر مولوی ولی محمد سلمہ تعالیٰ پر داختم ...... بہ سہ ضیاء ویک فیض ترتیب دادہ موسوم بہ شرح مہر شمس الدین ساختم و بعونہٖ مادۂ تار یخش ہمیں افتاد - منہ مبداء والیہ المعاد " -

ضیاے اول میں شعر کی تعریف کی گئی ہے - ضیاے ثانی میں قافیے کا ذکر کیا ہے اور ضیاے ثالث میں صنائع لفظی و معنوی کی بحث اور تمثیلات ہیں - اِس ضمن میں تحریر فرمایا ہے :—

" بدانکہ معمہ و نغز اگرچہ در اقسام صنایع و بدایع است مگر مولف موجب خفقان و خلجان طبع خود می داند لہذا ارتکاب بہ تحریرش نمی کند- بنابر آں کہ در صنعت معما بجز کوہ کندیدن و کاہ برآوردن فائدۂ دیگر متصور نیست - علیٰ ہذا القیاس صنعت نغز ہم است "

کتاب کے آخری عنوان "فیض" میں جدول تاریخ اور دائرۂ اولیٰ

کے علاوہ چند فارسی غزلیں " بحضور مستخرجۂ مولف " میں لکھی گئیں ہیں - اِس کتاب کی فصلوں کا نام اپنے فرزند ضیاءالدین احمد کے نام کی مناسبت سے رکھا ہے اور آخری حصے یعنی ضمیمے کو مصنف نے خود اپنے تخلص کی مناسبت سے موسوم کیا ہے -

شمس التصریف عربی زبان میں علم صرف پر لکھی گئی ہے - سن تصنیف سنہ ۱۲۵۳ھ ہے - حضرت "فیض" نے اپنے فرزند ضیاءالدین احمد کی تعلیم کی خاطر اِس کو قلمبند کیا تھا - اِس کا نسخہ اِس وقت محفوظ ہے ' جسکا ذکر گزر چکا ہے -

حضرت "فیض" نے بتاریخ ۱۴ رجب سنہ ۱۲۸۳ھ ہفتے کی شام میں رحلت فرمائی - وہ زیادہ دن بیمار نہ رہے - اور آخر وقت تک علمی و ادبی مشغلہ جاری رہا - اُن کے اکثر تلامذہ نے اِس حادثے کی تاریخیں قلمبند کی ہیں ' جن میں حکیم مزاج کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ قابل ذکر ہے - اِس میں سن پیدائش اور سن وفات دونوں موجود ہیں -

بودست سن تولد "فیض"   ہرگاہ وجود مظہر کل
۱۱۹۵

شد سال وصال او بوحدت   باللہ وجود مظہر کل
۱۲۸۳

حضرت کے بعد اُن کا عرس بڑی دھوم سے ہوتا تھا - اُن کے تمام تلامذہ اِس میں حصہ لیتے تھے - عرس اور مشاعرے کا انتظام نواب مشرف جنگ فیاض کے ذمے تھا ' جنھوں نے ۳۵ سال تک اِس کو جاری رکھا - اُن کے بعد اُن کے فرزند رشید نواب عزیز یار جنگ بہادر نے بھی چند سال تک یہ خدمت انجام دی- اِن مشاعروں کے لیے شمالی ہند سے بھی غزلیں آتی تھیں اور "گلدستۂ فیض" میں چھپتی تھیں' جو خاص اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا - شہر کے اکثر امرا اور صاحبان علم و فضل زیارت

یا شرکت مشاعرہ کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ تلامذہ کے علاوہ حضرت کے مریدین، اور معتقدین بھی کثرت سے شرکت کرتے تھے - غرض پچاس برس تک اِس عرس اور مشاعرے کا بازار حیدرآباد میں گرم رہا -

حضرت "فیض" کے کلام کا نمونہ یہ ہے :—

عہد پیری میں نہیں ' داغ جوانی کام کا
صبح کو بے نور ہے ' جلوہ چراغ شام کا

کیسی دوا مجھ کو مسیحا نے دی | درد محبت کا ' سوا ہوگیا
پھر ترا سہلے میں لگتےھي ' مَیں | آدمی تھا ' قبلہ نما ہو گیا
موت کدھر آتی ہے ' دیوانی ہے | "فیض" تو پہلے ہی فنا ہوگیا

جام خورشید ہے ایاغ اپنا | چرخ چارم پہ ہے دماغ اپنا

دوجہاں کی ہے جس میں گنجائش | دل ہے وہ گوشۂ فراغ اپنا

وہ رشک مسیحا ' سر بالیں جو نہیں تھا
ہر ہر نفس اپنا ' نفس باز پسیں تھا
دنیا تھی کدھر اور کدھر ساکن دنیا
تھا وہم ہمارا ' نہ مکاں تھا ' نہ مکیں تھا

کسی بدمست کے ہاتھوں سے پیمانے پہ کیا گذرا
خدا جانے تری آنکھوں سے ' میخانے پہ کیا گذرا

جب سے کسی صنم کا افسانہ جانتے ہیں
ہرسنگ و خشت کو ہم بت‌خانہ جانتے ہیں
مرقد پہ کوہ کن کے اے "فیض" یوں لکھا ہے
دیوانے ہیں جو مجھکو دیوانہ جانتے ہیں

افتادہ یہ زمیں ہے اور نم بہت ہے یہاں
نشوو نمائے نخل وفا ' کم بہت ہے یہاں
شکل حباب اپنی ہے ' اک دم کی زندگی
گر ٹھہر جائیں "فیض" کوئی دم' بہت ہے یہاں

میں در اہل دول پر نہ کبھی سر ماروں
گنج قاروں بھی اگر ہو تو نہ ٹھوکر ماروں

اک بیدی و دو گوش نہیں معنی انساں
انساں جنہیں کہتے ہیں' وہ لوگ جدا ہیں

دل کے بدلے ہوئے اطوار نظر آتے ہیں
جان دینے ہی کے آثار نظر آتے ہیں

آج تم نکلو ' خواہ کل نکلو   غرض اِس کارواں سے چل نکلو

بہت غنچہ، لب پھر ہنسا چاہتا ہے   خدا جانے کیا گل کھلا چاہتا ہے

دل تنگ پڑے رہتے ہیں کونے میں چمن کے
ہیں ہم بھی ہوا خواہ کسی غنچہ دہن کے
کرتا ہوں ابھی سرو کو سیدھا ترے آگے
دو چار قدم چل تو سہی ' باغ میں تن کے

تم ہو مختار ' جو کچھ چاہتے ہو کرتے ہو
میں ہوں مجبور ' مرے ہاتھ سے ہوتا کیا ہے
کل پہ موقوف نہ رکھ' آج ہی کر لے سب کچھ
زیست کہتے ہیں جسے ' اُس کا بھروسا کیا ہے

بحر مواج ہر حباب میں ہے   عین بے پردگی ' نقاب میں ہے

میں محیط و محاط دونوں ایک　　آب گوہر میں، گوہر آب میں ہے
اپنی غفلت ہے عین بیداری　　آپ ہی کا خیال، خواب میں ہے

زیست ہے فرقت محبوب میں دشوار مجھے
نظر آتے ہیں مری موت کے آثار مجھے
واہ وا اے اثر عشق رخ و کاکل یار
جانتا ہے کوئی کافر، کوئی دیندار مجھے

مزدور بنے، خلق کا بوجھا اُٹھائیے　　احساں مگر نہ سر پہ کسی کا اُٹھائیے
بازار گرم ہے لب جاں بخش یار کا　　اعجاز کی دکان مسیحا! اُٹھائیے

اُٹھ گئے مے‌خوار، پر ساقی کی جی میں یاد ہے
بزم برہم ہو گئی، شیشے میں صہبا رہ گئی
فرع کے جلوے سے، کم ہوتی ہے رونق اصل کی
دل ہوا روشن، تجلی سویدا رہ گئی

سیر کیا خاک، بحر و بر میں ہے　　خشک و تر سب مری نظر میں ہے
خندہ زن ہے ثبات پر میرے　　بے ثباتی، جو کچھ شرر میں ہے

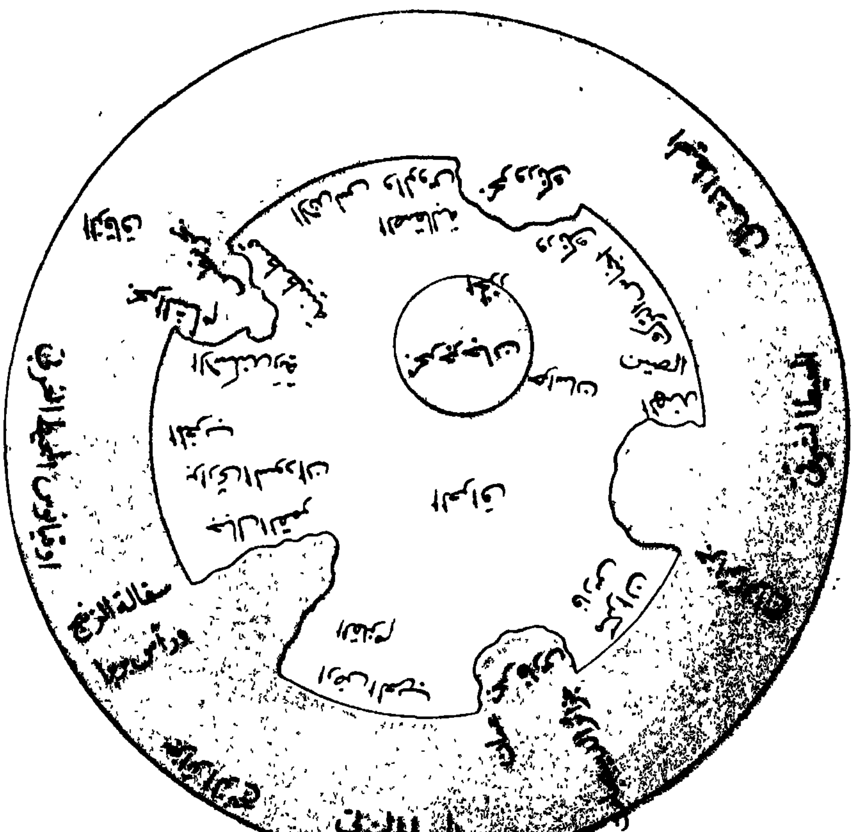
رہا جو تو میں برسوں خدا کی　　بہت چوکا، بڑی میں نے خطا کی
وجود غیر ہے صرف اعتباری　　جو ہستی ہے، وہ ہستی ہے خدا کی
بلی کہکر بلا میں پھنس گئے ہم　　نہ سوجھی ابتدا میں انتہا کی

باہم ارباب تمنا کو جدا کرتا ہے　　فلک تفرقہ انداز! یہ کیا کرتا ہے
مجھکو آزاد نہ کر قید سے چلدے صیاد!　　بے پر و بال کو بھی کوئی رہا کرتا ہے
موجۂ باد بہار چمنستان بہشت　　مشہد ''فیض'' پہ جاروب دیا کرتا ہے

بحر ورنگ کا دنیا میں سب سے پہلا نقشہ

جو

سنہ ۴۲۱ھ میں البیرونی نے ابوالحسن علی بن ابوالفضل خاصی کے لئے بنایا۔



از کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم مصنفہ علامہ ابوریحان بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ

بحر ورنگ

(Bering Sea)

(از سعید انصاری، مدیر رسالہ)

ایشیا اور امریکا کی درمیانی آبنائے اور سمندر کا نام بیرنگ ہے جس کا مکتشف موجودہ تحقیقات کے مطابق کپتان وِیٹس بیرنگ (Vitus Bering) تھا - اُس نے سنہ ۱۱۵۴ھ مطابق ۱۷۴۱ع میں آخری سفر کیا تھا '[۱] اور جبھی اِس آبنائے اور سمندر کا انکشاف ہوا - الاسکا یا روسی امریکا کا پتا بھی اِسی سال اِسی کپتان نے لگا یا تھا [۲] -

لیکن اگر اِس شخص اور موجودہ تحقیقات کو چھوڑکر قدیم جغرافیے کا مطالعہ کیا جائے ' تو دو قسم کے خیالات ملتے ہیں :—

(۱) قطب الدین محمود شیرازی (سنہ ۷۱۰ھ) نے تحفۂ شاہیہ میں لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں جس سمندر کو بحر مایطس کہتے تھے ' اب اُسی کا نام بحر ورنگ ہے - اور حمداللہ مستوفی (سنہ ۷۴۰ھ) نے نزہۃالقلوب میں بحر مالاطیقون کو بحر ورنگ قرار دیا ہے ' جس کا منشا یہ ہے کہ اِس سمندر کے انکشاف کا فخر یونانیوں کو حاصل تھا -

(۲) ابوریحان بیرونی (سنہ ۴۴۰ھ) کی کتاب التفہیم میں یونانیوں کا ذکر نہیں ہے ' اور نہ اِس سمندر کا کوئی یونانی نام مذکور ہے - بلکہ اُس کو بحر ورنگ لکھا ہے - حالانکہ اِسی مصنف نے دوسری جگہ بعض سمندروں کے یونانی نام لکھے ہیں ' مثلاً بحر طرابزندہ کے متعلق

---

[۱]— انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص۷۷۵ ' ج۳ ' طبع یازدہم

[۲]— ایضاً ص۴۷۷ ج ۱ '

تصریح کی ہے کہ یونانی اُس کو بحر بلطاس کہتے ہیں (ص۷۸) [۱] - بحر مغربی کی نسبت لکھا ہے کہ یونانیوں کے یہاں اُسکا نام اوقیانوس ہے (ص۳۲) - جزیرۂ تواسی کے ذکر میں بطلمیوس کا حوالہ دیا ہے - (ص۱۲۹) - یونانی ، سنسکرت اور دوسری زبانوں کی مہارت کے لحاظ سے "بیرونی" کا جو درجہ تھا ظاہر ہے- بحر ورنگ کا چونکہ یونانی جغرافیہ میں تذکرہ نہ تھا اس لیے اُس نے بھی سکوت اختیار کیا - البیرونی کے تقریباً پونے دو سو برس بعد یاقوت رومی (سنہ ۶۲۶ھ) نے معجم البلدان میں ، اُس کے بعد علامہ نصیرالدین طوسی (سنہ ۶۷۲ھ) نے کتاب التذکرہ میں ، زکریا قزوینی (سنہ ۶۸۲ھ) نے آثارالبلاد اور عجائب المخلوقات میں ، ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن ابوطالب دمشقی (سنہ ۷۲۸ھ) نے نخبۃالدھر میں ، اور ابوالفدا(سنہ ۷۳۲ھ) نے تقویم البلدان میں جو کچھ لکھا ہے : اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں کو اِس انکشاف سے کوئی تعلق نہ تھا- بلکہ " ابوالفدا " نے جو ہمارے ماخذوں میں بہ استثنائے مستوفی ، زمانے کے لحاظ سے سب سے متأخر ہے ، یہاں تک تصریح کی ہے کہ ابوریحان بیرونی اور نصیر الدین طوسی کی تصنیفات کے علاوہ اِس سمندر کا کسی کتاب میں ذکر نہیں ہے [۲] - اِس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان بحر ورنگ کے مکتشف تھے -

یونانیوں نے اِس سمندر کو معلوم کر لیا تھا یا نہیں ؟ اِس کے لیے "بیرونی" کے سکوت کے علاوہ ، شائد یہ کہنا کافی ہوگا کہ "بطلمیوس" (Claudius Ptolemaeus) المتوفی سنہ ۱۵۰ ق م نے اپنے جغرافیے میں اِس کا نام نہیں لیا ہے - بطلمیوس کی اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں : لیکن

---

[۱]—اخبار امم المجوس مرتبہ زاثول ۔

[۲]—تقویم البلدان ص۳۵ ۔

اُس کا عربی خلاصہ جو خلیفۂ مامون الرشید (سنہ ۱۹۸ ھجری — ۲۱۸ ھجری) کے مہتمم کتب خانہ ' ابوجعفر (کذا) محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اُسی انداز پر کیا تھا ' ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس کا نام حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (ص ۱۵۷ ج ۱) میں رسم المعمور من البلاد لکھا ہے ' اور ڈاکٹر رابرٹ مل (Hugh Robert Mill) نے کتاب صورۃ الارض بتایا ہے ' جو کتاب "جغرافیا" کا بالکل صحیح ترجمہ ہے۔ (جغرافیا ' بطلمیوس کی کتاب کا نام تھا) - کاتب چلپی اور ڈاکٹر مل دونوں نے یقین دلایا ہے کہ یہ کتاب بدقسمتی سے ناپید ہو گئی ہے [۱] - لیکن سنہ ۱۹۲۹ع میں وائنا سے ہنس وی ' مزیک (Hans V. Mzik.) نے اُس کو مرتب کر کے ایک مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے - اور وہ اِس وقت ہمارے مطالعے میں ہے - اُس سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مسیح سے ڈیڑھ سو برس پہلے تک دنیا کو بحر ورنگ کا علم نہ تھا - اور بعد میں چونکہ بطلمیوس ہی کے جغرافیے پر اکثر ممالک اعتماد کرتے رہے اس لیے عہد اسلامی تک جغرافی معلومات میں کوئی معتدبہ اضافہ نہ ہو سکا -

اب رہا علامۂ "قطب الدین شیرازی" (سنہ ۷۱۰ھ) کا یہ لکھنا کہ بحر ورنگ کا پرانا نام بحر مایطس تھا ' یہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اُن سے بہت پیشتر "مسعودی" (سنہ ۳۴۶ھ) نے کتاب التنبیہ والاشراف میں تصریح کردی ہے کہ بحر مایطس ' قطب شمالی کے قریب ہے اور اُس کے بعض حصے قطب کے نیچے ہیں - پھر شیرازی نے بحر ورنگ کا جو رقبہ لکھا ہے بحر مایطس کے رقبے سے اُس کو کوئی نسبت نہیں - مسعودی نے بحر مایطس کا رقبہ یہ بتایا ہے :— طول ۳۰۰ میل ' عرض ۱۰۰ میل ' اس طرح کل رقبہ ۳۰ ہزار میل مربع ہوا ' حالانکہ بحر ورنگ کا رقبہ اسلامی جغرافیے کی رو سے ۵۹۴۰۰ میل مربع ہے -

[۱]— کشف الظنون ' ص ۳۹۵ ج ۱ - انسائکلوپیڈیا برٹانیکا ص ' ۱۴۲ ' ج ۱۱ -

" البیرونی " پہلا شخص ہے جس نے کتاب التفہیم لاوائل صناعة التنجیم میں بحر ورنگ کا حال لکھا - اِس کتاب کی وہ عبارت جو بحر ورنگ کے متعلق ہے ' الگزنڈر زائپل (Alexander Seippel,) نے " اخبار امم المجوس من الارمان و ورنک والروس " (Rerum Normannicarum) کے تیسرے باب میں نقل کی ہے- اِس کے علاوہ ورنگ کے متعلق طوسی ' قزوینی ' قطب الدین شیرازی شمس الدین دمشقی ' اور ابوالفدا کی کتابوں سے بھی پوری پوری عبارتیں درج کی ہیں - ہم نے زائپل کے چھ ماخذوں پر تین کا اور اضافہ کیا ہے: یاقوت کی معجم البلدان ' قزوینی کی عجائب المخلوقات اور حمداللہ مستوفی کی نزهة القلوب - اِس طرح ہمارے مضمون کے ماخذ (نو) ہو جاتے ہیں ' جن کی عبارتیں حسب ذیل ہیں :—

(الف) کتاب التفہیم :—

اما البحر الذی فی مغرب المعمورة وعلی ساحله[١] بلاد طنجة والاندلس فانه یسمی [٢] البحر المحیط' ویسمیه[٣] الیونانیون أوقیانوس' ولا یُلَجّج فیه' و انما [٤] یُسْلَک بالقرب من ساحله ' و هو یمتد من عند هذه البلاد نحو الشمال علی محاذاة ارض الصقالبة ' و یخرج منه خلیج عظیم فی شمال الصقالبة و یمتد الی قرب ارض بلغار[٥] المسلمین ویعرفونه بحر ورنک ' و هم امة علی ساحله ' ثم ینحرف وراء هم

لیکن وہ سمندر جو دنیا کے مغرب میں ہے ' اور جس کے ساحل پر بلاد طنجہ اور اسپین واقع ہیں ' اُس کا نام بحر محیط ہے - اور یونانی اُس کو اوقیانوس کہتے ہیں - اُس کے اندرونی حصوں میں جایا نہیں جاتا - البتہ اُس کے ساحل کے کنارے کنارے سفر کیا جاتا ہے - اور وہ اِن شہروں کے پاس سے شمال کی طرف سر زمین صقالبہ کے سامنے سے ہوتا ہوا پہیلا گیا ہے ' اور اُس سے شمال

[١]—ساحل [٢] سمی [٣] وسماه [٤] انما [٥] بلغار بلاد — معجم البلدان ص ٢٠ ج ١ - لیپزک سنة ١٨٦٦ م -

نحو المشرق ، و بين ساحاته و بين
اقصى ارض الترك ارضون و جبال
مجهولة ، خربة ، غير مسلوكة ،

صقالبہ میں ایک بڑا خلیج نکلتا
ہے ، جو مسلمانان بلغار کے ملک کے
قریب تک چلا آیا ہے ، اُس کو بحر
ورنگ کہتے ہیں' اور وہ (ورنگ) اُس
کے ساحل پر ایک قوم ہے ' پھر وہ
(بحر ورنگ) اُن کے آگے مشرق کی
طرف گھوم جاتا ہے ' اور اُس کے
ساحل اور ترکستان کے انتہائی
حدود کے درمیان بہت سے نا معلوم '
ویران ملک اور پہاڑ ہیں ' جہاں
لوگ نہیں جاتے ہیں '

اِسی کتاب میں دوسری جگہ ہے :—

و اما الاقليم السابع فليس فيه كثير
عمران ، انما هو في المشرق غياض و
جبال ياوى اليها فرق من الترك
كالمستوحشين ، و يمرّ على جبال
باشغرت و حدود البجناكية و بلدى
سُوار و بُلغار و الروس والصقالبة
والبلغرية و ينتهي الى البحر المحيط ،
و قليل من وراء هذا الاقليم من
الامم مثل ايسوا و وارنك و يورة
و امثالهم ،

اور لیکن ساتویں اقلیم تو اُس میں
بہت آبادی نہیں ہے ، مشرق میں
صرف چند جنگل اور پہاڑ ہیں
جہاں کچھ ترکی قبائل وحشیانہ
زندگی بسر کرتے ہیں' اور یہ (اقلیم)
باشغرت کے پہاڑوں ، بجناکیہ کے
حدود ، سوار و بلغار کے دو شہروں '
روس ، صقالبہ ، بلغریہ پر سے گزرتی
ہوئی بحر محیط تک ختم ہوتی ہے'
اور اِس اقلیم کے آگے بہت کم قومیں
آباد ہیں ، مثلاً ایسوا ' ورانگ '
یورہ ' وغیرہ '

(ب) معجم‌البلدان میں بحر ورنگ کا ذکر بیرونی کے حوالے سے ہے -

واما کیفیۃ وضع‌البحار فی‌المعمورۃ فاحسن ما بلغنی ما حکاہ ابو الریحان البیرونی -

اور بہر حال آبادی میں سمندر کسطرح ہیں ؟ تو اِس کی نسبت سب سے اچھا بیان جو مجھے پہنچا ہے ، بیرونی کا ہے -

اِس کے بعد بیرونی کی پہلی عبارت نقل کی ہے - زائیل نے یہ حوالہ درج نہیں کیا ہے -

(ج) کتاب‌التذکرۃ :—

و فی‌القدرالمکشوف للعمارۃ ایضاً بحار کثیرۃ بعضہا متصل بالمحیط ، کالذی بین‌المغرب والا ندلس ، و الذی بین اندلس و الشام ، والبحر الجنوبی المتصل بالجانب‌الشرقی الذی خرج منہ اربعۃ خلجان الی وسط‌العمارۃ - الخلیج البربری ، وہو اقربہا الی‌المغرب ، والخلیج‌الاحمر ، وخلیج فارس ، والخلیج الا خضر ، و لکل واحد منہا طول و عرض صالحان ، وکبحر ورنگ من جانب الشمال ، و بعضہا غیر متصل کبحر طبرستان ، و بحیرۃ خوارزم وغیرہما من البطائح والمغایض،

اور آبادی کے لیے کھلے ہوئے (زمین کے) حصے میں بھی بہت سے سمندر ہیں جن میں بعض محیط سے مل گئے ہیں ، جیسے وہ (سمندر) جو مغرب اور اندلس کے درمیان ہے، اور وہ جو اندلس اور شام کے درمیان ہے، اور بحر جنوبی جو مشرق کی طرف مل گیا ہے، اور جس سے چار خلیج آبادی کے بیچ تک نکلے ہیں ، (یعنی) خلیج بربری جو مغرب سے تمام خلیجوں میں سب سے زیادہ قریب ہے، اور خلیج احمر اور خلیج فارس اور خلیج اخضر - اور اِن میں سے ہر ایک (خلیج) کا اچھا خاصا طول و عرض ہے- اور جیسے بحر ورنگ شمال کی جانب - اور اُن

(سمندروں) میں سے بعض (محیط سے) نہیں ملے ہیں ' جیسے بحر طبرستان اور بحیرۂ خوارزم ' یا سنگستانوں اور جنگلوں کی دوسری جھیلیں اور تالاب -

(د) آثارالبلاد واخبارالعباد :—

ورنک موضع علی طرف البحرالشمالی ' و ذالک ان البحر المحیط من جانب الشمال خرج منه خلیج الی نحوالجنوب ' فالموضع الذی علی طرف ذالک الخلیج یسمی به الخلیج یقال له بحر ورنک ' وهو اقصی موضع فی الشمال ' البرد فیه عظیم جداً ' والهواء غلیظ ' والثلج دائم ، لا یصلح للنبات ولا للحیوان ' قلّما یصل الیه احد من شدة البرد والظلمة والثلج ' واللہ اعلم '

ورنگ ' بحر شمالی کے کنارے ایک جگہ کانام ہے - اور یہ یوں ہے کہ بحر محیط سے ' شمال کی طرف سے ایک خلیج نکلا ہے جو جنوب کی جانب چلا آیا ہے ' پس وہ جگہ جو اُس خلیج کے کنارے پر ہے ' جس کے نام پر خلیج کا نام پڑا ہے ' اُسکو بحرورنگ کہتے ہیں - اور وہ شمال میں سب سے دور جگہ ہے - وہاں سخت سردی پڑتی ہے - ہوا کثیف ہے - برف ہمیشہ رہتی ہے - نباتات اور حیوانات کے قابل نہیں - سردی ' تاریکی اور برف کی شدت کے سبب بہت کم لوگ وہاں تک پہنچتے ہیں '

(ه) آثارالبلاد کے مصنف ' زکریا قزوینی نے اپنی دوسری کتاب عجائب المخلوقات میں جو کچھ لکھا ہے ' وہ زائیل کے مجموعۂ انتخابات میں شامل نہیں - اِس کتاب کا اصل عربی نسخہ ہمارے سامنے نہیں ہے - اُس کا فارسی ترجمہ ہم نے دیکھا ہے - یہ قلمی ناقص الطرفین نسخہ بغدا سے

میں ہے ؛ مصوّر ہے ' اور تصویریں نہایت صحیح اور نفیس ہیں ۔ بعض جگہ تصویر اور رنگ کا کمال دکھلایا ہے - اِس میں کرۂ زمین کا ایک نقشہ بھی ہے ' جو البیرونی کے نقشے سے زیادہ صحیح ہے - "جرجی زیدان" نے آداب اللغۃ العربیۃ (ص ۲۲۴ ج ۳) میں لکھا ہے کہ عجائب المخلوقات کا فارسی ترجمہ لکھنؤ میں سنہ ۱۲۸۳ھ میں چھپا ہے - اُس میں حیوانات کی رنگین تصویریں بڑھائی گئی ہیں - لیکن قلمی نسخے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو عربی تصنیف مصور نہو ' مگر فارسی ترجمہ چھپنے سے پہلے بھی مصور تھا -

بہر حال ورنگ کے متعلق فارسی ترجمے کی عبارت یہ ہے '

" بحر محیط ...... اما از جانب شمال ممتد شود کہ قریب بوی بزمین بلغار کہ اوان مسلمانان ست ' وآن خلیج را بحر ورنگ گویند - پس ازاں منحرف شود بجانب مشرق ' و میان ساحل از بلن (؟) دور تر از ترک زمین بسیارست - وآنجا کوہہا مجہول و اراضی خراب بسیارست - کس آن را سلوک نکنند - تا آنکہ بجہت مشرق رسد کہ ورائے اقاصی ارض چین ست - دریں است (؟) ہیچ آبادانی نیست - واین ارض ہیچ مسلوک نیست - پس ازاں خلیجے عظیم کہ ایں بحرہا کہ معروف ست جملہ خلیجہا او باشد - خلیج اول را بحر چین ست الخ "

(و) تحفۂ شاہیہ :—

و اعلم ان المحیط المغربی ایضاً اذا جاوز اندلس نحو الشمال ' دخل قطعۃ منہ فی المعمورۃ ممتدۃ فی شمال ارض الصقالبۃ الی ارض مسلمی	اور جاننا چاہیے کہ محیط مغربی بھی جب اندلس سے بڑھ کر شمال کی طرف جاتا ہے تو اُس کا ایک حصہ آبادی میں داخل ہو کر شمال

البلغار ، طولها من المغرب الى
المشرق مائة فرسخ وعرضها ثلاثة
وثلاثون فرسخا ، و سمی فی کتب
القدماء بحر مایطس ، والان بحر
ورنک ، وهم امة علی ساحله ، طوال
کماة ، واذا جاوز عن ورنک نحو
الشرق امتد وراء اراضی الترک ،
فی جبال غیر مسلوکة ، واراض غیر
مسکونة الی حدود اراضی الصین ،
ولکونها غیر مسکونة ایضاً وامتناع
اجراء السفن فیه لما مرّ ، لم یُعلم
اتصاله بالمحیط المشرقی ،

زمین صقالبہ میں مسلمانان بلغار
کے ملک تک پھیلتا ہے۔ اُس کا طول
مغرب سے مشرق تک سو فرسخ
اور عرض تینتیس فرسخ ہے۔ اُس کا
نام قدما کی کتابوں میں بحر
مایطس تھا - اور اب بحر ورنگ
کہتے ہیں - اور یہ (ورنگ) اُس کے
ساحل پر ایک قوم ہے دراز قد ،
بہادر - اور جب یہ (محیط مغربی)
ورنگ سے مشرق کی طرف چلا جاتا
ہے تو بلاد ترک کے آگے پھیل جاتا ہے ،
جو (بلاد) ایسے پہاڑوں میں ہیں
جہاں لوگ چلتے نہیں ، اور
ایسی زمینوں میں ہیں جہاں
لوگ بستے نہیں ، اراضی چین کے
حدود تک - اور چونکہ یہ (حصے اور
علاقے) غیر آباد بھی ہیں ، اور
جیسا کہ گزرا اِس (سمندر) میں
کشتیوں کا چلانا غیر ممکن ہے ، اِس
(محیط مغربی) کا محیط مشرقی
سے مل جانا اب تک معلوم نہ
ہو سکا ،

دوسری جگہ لکھا ہے :—

واما نہر دنوي فہو نہر عظیم یضا هي بحراً ، یبتدئی من یول و یمر ببیت یوکط ثم یوکم ثم یرکر ثم یرکو ویم کہ و یم کد و یطاکچ و ک کبج و کاکج و کب کبج و کبج کب و کد کب و کہ کا و کوکا و کرکا ، و ہو مصبہ فی بحر طرابزوں ، ولانہ یمتد من قرب القطعۃ الغربیۃ الشمالیۃ ظن بعض ان شعبۃ من بحر الروم متصلۃ بالمحیط المغربی ، و بعض انہ یتشعب من بحر ورنگ ، واختلفوا ایضاً فی انہ ہل یمکن المسیر من الروس والصقلاب الی قسطنطینیۃ فی البر ای من غیر رکوب السفن ام لا ، ولا حقیقۃ لہذا النزاع ، لانہ یمکن عند جمود ہذا النہر و لایمکن عند سیلانہ ،

اور لیکن دریاے دنوي تو وہ بڑا دریا ہے جو سمندر کامقابلہ کرتا ہے۔ وہ شروع ہوتا ہے یول سے (چلند مختصر فرضی جغرانی اصطلاحات) اور گزرتا ہے......کرکا پر اور بہتی (کرکا میں) بحر طرابزون میں گرتا ہے۔ اور چونکہ وہ غربی شمالی حصے کے قریب سے پھیل جاتا ہے بعض کا خیال ہے کہ بحر روم کا ایک ٹکڑا محیط مغربی سے مل گیا ہے - اور بعض کہتے ہیں کہ وہ (دنوی) بحر ورنگ سے نکلا ہے - اور اِس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا روس اور صقلاب سے قسطنطینیہ تک خشکی میں سفر کرنا بلا کشتیوں کی مدد کے ممکن ہے یا نہیں ؟ لیکن یہ جھگڑا بے بنیاد ہے ، کیونکہ جب دریا منجمد ہو تو (سفر) ممکن ہے ورنہ نہیں ،

(ز) نخبۃالدہر فی عجائب البر والبحر :—

الا قلیم السابع لیس فیہ کثیر عمران ، انما هو فی المشرق غیاض و جبال یأوی

ساتویں اقلیم ، اِس میں بہت آبادی نہیں - مشرق میں صرف

الیها طوائف من الترک کالمتوحشین، ویمر علی بلاد السجناکیة و بلغار الکفار و الروس و الصقالبة و باشغرت و برّي (؟) سواد ورانک و یورة ، و آخره ستون درجة و نهاره الاطول ست عشرة ساعة ، و جمیع مایمتدالعمران فیماوراءه الی حدود عرض ست و ستین درجة و ربع و سدس درجة کما قلنا قبل ، ثم ما بعد ذالک الی تمام التسعین خراب، لایسکن لاهل الاقالیم ، ولایعیش فیه حیوان معهود ، و ذالک لتراکم الثلوج علیه و تراکب الضباب و بُعدالشمس عنه ، ولایمتنع ان یکون مأهولا بحیوان لانعرفه، ولایمکنه الانتقال عنه، کما لایمکن اهل الاقالیم سکناه ، ولا دخله احد و توغل فیه الاهلک دون الخروج منه ، وقد تقدم القول فیه بانه اقلیم الظلمة ،

چند جنگل اور پہاڑ هیں جہاں کچھ ترکی قبائل وحشیوں کی طرح رهتے هیں - یہ (اقلیم) بجناکیہ کے شہروں ، کفار بلغار ، روس ، صقالبہ باشغرت ، سواد (؟)کی دو خشکیوں (؟) ورانگ اور یورہ پر گزرتی هے - اِس کا آخر ۶۰ درجہ هے ، اِس کا سب سے بڑا دن ۱۶ گھنٹے کا هے ، اور اِس کے آگے جو آبادی کے مقامات هیں وہ تقریباً ۶۶ درجے اور ربع و سدس درجے کے عرض تک هیں ، جیسا کہ هم پہلے بیان کر چکے هیں ، پھر اِس کے بعد ۹۰ (درجے) کے اختتام تک ویران هے - اهل اقالیم وهاں نهیں رہ سکتے - اور نہ کوئی مانوس جانور وهاں رهتا هے - اور یہ یوں کہ وهاں برابر برف گرتی هے - لگاتار کهرا پڑتا هے - اور آفتاب وهاں سے دور هے - البتہ یہ محال نهیں کہ وهاں ایسے جانور رهتے هوں جن کو هم نهیں جانتے ، اور وہ اِدهر نهیں آسکتے - جس طرح اِدهر کے آدمیوں کا وهاں رهنا ناممکن هے -

وہاں جو گیا اور اندرونی حصے تک پہنچا وہ برباد ہو گیا ' نکل نہ سکا - اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ اقلیم ظلمت ہے -

ایک جگہ لکھا ہے :—

ثم یتلوہ (یعنی جبل درن) فی الامتداد جبل البشارة و الفتح ' الفارق بین غرب جزیرة الاندلس و بین شرقها ' من اول الجزیرة الی آخرها ' ومنه شعبة تتصل بالبحر الشمالی الی بحر ورنک والصقالبة والکلابیة '

پھر پھیلاؤ میں اُس (کوہ درن) کے بعد بشارت اور فتح والا پہاڑ ہے ' جو اسپین میں اِس سرے سے اُس سرے تک ممتد ہوکر اُس کو مغربی اور مشرقی حصے میں تقسیم کردیتا ہے ' اُس کا ایک حصہ بحر شمالی سے ملا ہوا ' بحر ورنک ' صقالبہ اور کلابیہ تک چلا گیا ہے '

دوسری جگہ :—

وهو البحر المحیط الذی منه مدد سائر البحار ' و لا یعرف له ساحل ' وله اسماء فی الجهات سماه بها الیونان و من قبلهم ' فاسمه فی الجهة المغربیة اوقیانوس والبحر الاخضر ' وفی جهة جنوب الارض والمشرق بحر الظلمات والبحر الزفتی والجامد ' و فی جهة منعطف الجنوب البحر الاحمر ' و فی الشمال والمغرب بحر الظلمة و بحر ورنک ' والمحیط الشمالی '

اور وہ بحر محیط ہے جس سے تمام سمندروں کو مدد پہنچتی ہے - اُس کے ساحل کا پتا نہیں - مختلف اطراف میں اُس کے مختلف نام ہیں ' جو یونانیوں اور اُن سے پہلے لوگوں نے رکھے ہیں - تو مغربی سمت میں اُس کا نام اوقیانوس اور بحر اخضر ہے ' اور زمین کی جنوبی اور مشرقی سمتوں میں بحر ظلمات ' بحر زفتی اور جامد ہے ! اور منعطف

جنوبی سمت میں بحر احمر ہے،
اور شمال و مغرب میں بحر ظلمت،
بحر ورنگ اور محیط شمالی ہے -

ایک موقع :—

ثم یمتد (البحر المحیط) بسواحله من حدود بحر قادس الی حد برزة منه دقیقة طویلة کصورة الدائرة، واعرض عرضها ثلاثة ایام، واما طولها فلم یعلم، و تسمی هذه البرزة بحر انکلطرة، ثم تمتد سواحل المحیط من حدود هذه البرزة والی ان تعطف فی جهة الشمال بغرب، وهناک برزة الکبری التی تسمی بحر ورنک، و ورنک اسم طائفة فهم لا یکادون یفقهون قولا، وهم صقلب الصقالبة، وهذه البرزة هی بحر الظلمة الشمالی، و بالقرب من سواحله خمس جزائر یاتی و صفها، ثم تمتد سواحله فی الشمال والغرب حتی تدخل اقلیم الظلمة، و لا علم بما هناک،

پھر (بحر محیط) اپنے سواحل کے ساتھ حدود بحر قادس سے اپنی ایک رودبار کی حد تک پھیلتا چلا گیا ہے - یہ (رودبار) باریک، لانبی، دائرے کی طرح ہے - اس کی سب سے زیادہ چوڑان تین دن کا راستہ ہے - اور اس کی لمبان کا پتا نہیں - اس رودبار کا نام بحر انکلطرہ ہے - پھر محیط کے سواحل اس رودبار کے حدود سے پھیلتے ہوئے شمالی سمت میں مغرب کی طرف گھوم جاتے ہیں، اور وہیں اس کی وہ بڑی رودبار ہے جس کا نام بحر ورنگ ہے - اور ورنگ ایک گروہ کا نام ہے - یہ لوگ غیر فصیح ہیں، تقریباً بات نہیں سمجھتے - اور یہ اصلی صقالبہ ہیں - اور یہی رودبار شمال والا بحر ظلمت ہے - اور اس کے سواحل سے قریب

پانچ جزیرے ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے - پھر اِس (محیط) کے سواحل شمال اور مغرب میں بڑھتے ہوئے اقلیم ظلمت میں داخل ہوجاتے ہیں، جہاں کا ہم کو کچھ علم نہیں -

دوسرا موقع :—

واختلفوا فی الساعد الخارج منه (یعنی من البحر الرومی) عند قسطنطینیة ، فزعم قوم انه داخل الیه من بحر بنطس الذی هو البحر الاسود ، ویسمی بحر الروس ، و ان بحر الروس متصل ببحر ورنک و الصقالبة ، وزعم قوم ان هذا البحر الرومی هو الذی یصب من الساعد فی بحر الروس ، و ان بحر الروس غیر متصل ببحر ورنک ، لاتصال الارض الکبیرة من الاندلس الی ماوراء النهر و الی صحاری القبجق ، لا یقطع السیر منها غیر الانهر الحلوة فقط -

اور لوگوں نے اُس بازو کے متعلق اختلاف کیا ہے جو اُس (بحر رومی) سے قسطنطینیہ کے قریب نکلا ہے - تو کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بحر بنطس سے اندر آیا ہے جس کا نام بحر اسود ہے اور اُس کو بحر روس (بھی) کہتے ہیں - اور یہ کہ بحر روس، بحر ورنک اور صقالبہ سے ملا ہوا ہے - اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بحر رومی وہی ہے جو بازو سے بحر روس میں گرتا ہے - اور یہ کہ بحر روس، بحر ورنک سے ملا ہوا نہیں ہے - کیونکہ ایک بڑا خطۂ زمین اندلس سے ماوراءالنہر اور دشت قبچاق تک متصل چلا گیا ہے ، جس کے راستے کو شیریں دریاؤں کے علاوہ کوئی چیز منقطع نہیں کرتی -

تیسرا موقع :—

والتنّین یوجد فی البحرالرومی و بحرالخزر و بحر ورنک بکثرة ' و کذالک فی سواحل المحیط بالاندلس '

اور اژدھے بحر رومی' بحر خزر اور بحر ورنگ میں بکثرت پائے جاتے ھیں - اور اِسی طرح اندلس میں جو محیط کے سواحل ھیں' اُن میں بھی -

(ح) تقویم البلدان :—

و یخرج من ھذا البحرالمذکور (یعنی بحر اوقیانوس) عدة ابحر ' منها بحرالروم و بحر بردیل و بحر ورنک -

اور اِس ذکر کیے ھوئے سمندر (بحر اوقیانوس) سے کئی سمندر نکلتے ھیں' جن میں بحر روم ' بحر بردیل ' اور بحر ورنگ ھے -

دوسری جگہ مذکور ھے :—

" ذکر بحر ورنک " :— لم اجد لهذا البحر ذکراً الا فی مصنفات ابی الریحان البیرونی' و فی التذکرة للنصیر فاثبته حسبما ذکرہ البیرونی' قال بحر ورنک یخرج من البحر المحیط الشمالی الی جهة الجنوب ' وله طول و عرض صالحان' و ورنک امة علی ساحله -

بحر ورنگ کا ذکر :— میں نے اِس سمندر کا ذکر ابو ریحان بیرونی کی تصنیفات ' اور نصیر کے تذکرے کے علاوہ اب تک کہیں نہیں پایا - تو جیسا بیرونی نے ذکر کیا ھے ویسا ھی میں نے لکھدیا - وہ (بیرونی) کہتا ھے :— بحر ورنگ' محیط شمالی سے جنوب کی طرف نکلتا ھے ' اور اُس کا طول و عرض اچھا خاصا ھے - اور ورنگ اُس کے ساحل پر ایک قوم ھے -

(ط) گزشتہ آٹھ ماخذوں کے علاوہ نواں ماخذ حمداللہ مستوفی (الموجود سنہ ۷۴۰ھ) کی نزهۃالقلوب ہے ' جس کو اسٹرینج (G. Le Strange) نے مرتب کیا ' اور سنہ ۱۹۱۵ع میں طبع ہوئی ہے - اِس کے انتخابات الگزنڈر زائیل کے مجموعے میں نہیں ہیں- مستوفی نے کئی جگہ اِس کتاب میں بحر ورنگ کا ذکر کیا ہے -

ایک جگہ [۱] :—

" آب انل :—و از آب نہرہا بعضی در بحر مالاطیقون کہ آنرا نیز دریاے ورانگ می گویند ' و بعضی در بحر شرقی می ریزد " -

دوسری جگہ [۲] :—

" خلیج ششم بحر غالاطقون ست - آنرا دریاے ورانگ نیز خوانند- بر طرف شرقش ولایات بلغار و بدریہ و بودہ و بعضی از قرقیز و ورانگ ست و در جنوب دشت خزر کہ آنرا دشت قبچاق نیز خوانند - و بر غرب ولایات فرنگ و قلزم و قسطنطنیہ و غیر آں - و شمال بحر محیط ست - و بدیں بحر قریب بدو ہزار جزیرہ است - و بہنگام کوتاہی روز بعضے ازیں جزائر تاریک شود ' و بدیں سبب آنرا ظلمات خوانند - و شرح جزائرش در کتب ہیئت مشروح ست - و درو عجائب بسیارست " -

ایک اور مقام [۳] :—

" بدریہ و سدوریہ و بلغار و ورانگ و انسور و بودہ ' بلاد و صحاری بسیارست ' خلف اقلیم ہفتم ' درمیان بحر شرقی و دریاے غالاطیقون - و بیشتر سکان آنجا صحرا نشینند - و ہوایش در غایت سردی دارد - و آنجا از ارتفاعات اندکے غلہ و اکثر جاورس و حبوب صیفی بود - و پنبہ و انگور (و) میوہا قطعاً نباشد - اما مواشی بسیار بود - و بنیاد معاش ایشاں بر نتاج مواشی و محصول معدنیات ملور بیشترست " -

---

[۱] - نزہۃ القلوب ص ۲۱۲ [۲] - ایضاً ص ۲۳۸ - [۳] - ایضاً ص ۲۵۶ -

اِن عبارتوں میں بعض ناموں کے مختلف تلفظ محشی نے لکھے ہیں ، مثلاً بحر غالاطقون کو عالاطیقون ، قالیطیقون ، فالیطاقون، عالاصیفون پڑھا گیا ہے ؛ ورانگ کو ورنگ جو اکثر عربی ماخذوں کے مطابق ہے ؛ سدرریہ کو ستوریہ ؛ بلند کو بلندہ ؛ بودہ ، کو یورا ؛ پودا ، بورہ ؛ انسور کو ایسودہ ؛ اسور ، ابسورہ ؛ انسود ، ایسورہ - لیکن یہ زیادہ تر کاتبوں کی تصحیفات ہیں جو نقل در نقل ہوکر موجودہ اختلافات کی شکل میں سامنے آگئی ہیں - ہم کو یہاں اِن کی تصحیح سے غرض نہیں -

ورنگ کے تین راستے

مسلمان " بحر ورنگ " کس راستے سے گئے ؟ یہ بڑا قابل توجہ مسئلہ ہے -

خشکی کا راستہ

یہ بہت ممکن ہے کہ مسلمان سیدھے " سیلا " (کوریا) سے ورنگ چلے گئے ہوں - مگر ہم کو اب تک اِس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملا ہے - خشکی کا راستہ سنہ ۴۲۱ھ تک غالباً معلوم نہ تھا - بیرونی نے لکھا ہے کہ اِس علاقے (ملک ورنگ) میں جنگل اور پہاڑ بہت ہیں ، آبادی کم ہے ، راستے نہیں چلتے ہیں - قزوینی (سنہ ۶۸۲ھ) نے بھی عجائب المخلوقات میں قریب قریب یہی بیان دیا ہے - لیکن قطب الدین شیرازی (سنہ ۷۱۰ھ) کے زمانے میں " قسطنطینیہ سے صقلاب " تک راستہ چلتا تھا - " صقالبہ " کی آبادی بحر ورنگ کے شمال و مغرب ، ساحل کے کنارے تھی ، جیسا کہ بیرونی نے نقشے میں دکھایا ہے - اس لیے آٹھویں صدی کے اوائل میں ورنگ تک راستہ بالکل صاف ہو گیا تھا - اور وہاں کے حالات کسی قدر تفصیل سے معلوم ہو گئے تھے - اسی لیے دمشقی (سنہ ۷۲۸ھ) کی کتاب میں بحر اسود اور دشت قبچاق والے خشکی کے راستے اور دریاؤں ، نیز ورنگ

کی قومیت اور زبان کا تذکرہ ملتا ہے - اور مستوفی (سنہ ۷۴۰ھ) نے تو ورنگ میں کثیر آبادی کی خبر دی ہے - اِس کے ساتھ پیداوار ' مویشی ' معدنیات وغیرہ کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے - اِن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ اور دشت قبچاق کے واسطے سے صقالبہ کے ملک کو جاتے ہونگے - اور پھر وہاں سے ورنگ پہنچتے ہونگے -

سمندر کا شمالی مشرقی راستہ

اگر مسلمان بحرالکاہل (Pacific Ocean) سے بحر ورنگ چلے گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ سنگھالین اور جزائر سیلا سے سیدھے آبنائے اور بحر ورنگ تک پہنچ سکتے ہیں - لیکن اِس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے - البتہ " اسپین " کی طرف سے بحر مغربی (Atlantic Ocean) اور پھر شمال کی طرف پہنچ کر بحر منجمد (Arctic Ocean) کے سواحل کے قریب رہ کر " صقالبہ " اور " بلغار " کے ممالک کے سامنے ہوتے ہوئے بحر ورنگ کا سفر ہوتا تھا - سنہ ۲۹۰ھ تک " جزائر برطانیہ ' ایک طرف ' اور بحر شمالی (بحر منجمد) کا صقالبہ سے متصل حصہ دوسری طرف معلوم ہو چکا تھا [۱] - سنہ ۳۰۰ھ تک " صقالبہ " سے آگے بحر شمالی (بحر منجمد) کا حال معلوم نہ تھا [۲] - سنہ ۳۳۶ھ سے پیشتر راس ورنگ اور پورے ' بحر ورنگ " کی حدیں معلوم ہوگئی تھیں - لیکن اُس کا نام معلوم نہ تھا [۳] - سنہ ۴۲۱ھ سے قبل اگرچہ " بحر مغربی " کے اندرونی حصوں میں سفر دشوار تھا ' لیکن اُسکے ساحلوں کے کنارے کنارے برابر جہاز چلا کرتے تھے ' جو بحر ورنگ تک

---

[۱]—اعلاق النفیسۃ ' ص ۸۵ و ۱۴۵ -

[۲]—المسالک و الممالک ' ابن خردادبہ -

[۳]—کتاب العجائب مسعودی کی ایک عبارت زائپل نے نقل کی ہے اور دوسری سلسلۃ التواریخ میں ہے -

آجاتے تھے - گو سنہ ۶۸۲ ھ تک بڑی آسانی سے وہاں پہنچنا بہت مشکل تھا -

" سردی ، تاریکی ، اور برف کی شدت کے سبب وہاں لوگ کم پہنچ سکتے ہیں " - (قزوینی) -

یہی عام راستہ تھا - چنانچہ " روسی " صقالبہ سے لڑنے کے لیے کشتیوں پر سوار ہوکر اِسی راستے سے آیا کرتے تھے جیسا کہ ابن رستہ (سنہ ۲۹۰ ھ) نے الا علاق النفیسۃ میں تصریح کی ہے - [۱]

اِس بحری راستے کے سفر نے مسلمانوں سے تمام شمالی یورپ اور شمالی ایشیا کے صحیح نقشے مرتب کرائے - جن کا بغیر سفر کیے اِس حسن و خوبی سے تیار ہونا نا ممکن تھا - بیرونی (سنہ ۴۲۱ ھ) اور ادریسی (سنہ ۵۴۸ ھ) کے نقشوں میں سواسو برس کے اندر جو عظیم‌الشان فرق پیدا ہوا ، وہ اِسی بار بار کی آمد و رفت ، پیمائش زمین کے شوق اور گمنام قوموں اور نامعلوم ملکوں کے حالات کی جستجو ہی کا نتیجہ تھا -

سمندر کا شمالی مغربی راستہ

گزشتہ بحری راستے کے علاوہ سمندر کا ایک اور راستہ بھی تھا ، جو " شمال و مغرب " ہوکر ورنگ کو جاتا تھا - یہ بات اُس زمانے کے لحاظ سے شائد عجیب معلوم ہو ! لیکن اِسکے بھی شواہد موجود ہیں -

مسعودی (سنہ ۳۳۲ ھ) نے کتاب التنبیہ میں " قطب شمالی " تک تمام آبادیوں اور سمندروں کا پتا دے دیا ہے - ادریسی کی نزهۃ المشتاق میں " اسلانده " (آئسلینڈ) کی شکل موجودہ آئسلینڈ سے بڑی اور بہت لمبی بنائی گئی ہے - جس سے وہ " سقوسیہ " (اسکاٹ لینڈ) اور " دارا مرخہ " (ڈنمارک) سے قریب ہوگیا ہے - اِس طرح بحر شمالی (North Sea) کا بڑا حصہ خشکی میں تبدیل ہو جانے

---

[۱]— اعلاق النفیسۃ ص ۱۳۵ -

سے شمالی مغربی سفر کے امکانات زیادہ قوی ہو گئے ہیں - آئسلینڈ کے قریب ہی " گرین لینڈ " واقع ہے - جس کے بعد شمالی امریکا کے جزائر اور سواحل شروع ہوجاتے ہیں ' اور اُن کے خاتمے پر بحر ورنگ مل جاتاہے -

ان ساحلوں کی طرف سے ورنگ تک پہنچنا ' ہمکو شمس الدین دمشقی (سنہ ۷۴۸ھ) نے بتایا ہے - وہ بحر ورنگ کی جگہ بتاتے وقت رود بار انگلستان سے مغرب کی طرف چلا ہے' اِس لیے ورنگ کو شمال و مغرب میں بتاتا ہے - حالانکہ اگر ایشیا کی طرف سے دیکھتا تو اگلے مصنفین کی طرح وہ بھی شمال و مشرق لکھتا - اُس نے ایک جگہ " بحر انکلطرہ " (English Channel) سے مغرب و شمال کی طرف گھومنے والے سواحل بحر محیط (من حدود ہذہ الجزۃ الی ان تعطف فی جہۃ الشمال بغرب) کا ذکر کرتے ہوئے ' بحر محیط کی بڑی رودبار بحر ورنگ کی جگہ بتائی ہے ' اور دوسرے مقام پر بحر محیط کے شمال و مغرب والے حصوں کے سمندروں میں ایک سمندر کا نام بحر ورنگ لکھا ہے - ظاہر ہے کہ بحر محیط کے وہ ساحل جو رود بار انگلستان سے شمال و مغرب کی طرف ہیں ' آئسلینڈ ' گرین لینڈ ' کنیڈا اور الاسکا ہی ہوسکتے ہیں !

مسلمان شہدائے بحر کی یاد !

جن حوصلہ مندوں نے بحر ورنگ کا نئی اور پرانی دونوں دنیاؤں کی طرف سے پتا چلایا تھا ' اور سمندر پر قابو نہ ہونے کے باوجود بحر منجمد کے ٹھوس برفانی دائرے کا پورا چکر کاٹتا تھا ' اُن کی مہمّوں اور قربانیوں کے متعلق تاریخ کی زبان بالکل خاموش ہے ! اُن میں کتنے ایسے تھے جو اثنائے راہ میں بھٹک کر (المغرورون) کہیں سے

کہیں نکل گئے - اور کتنوں کو جہاز ٹکرا جانے کے سبب بحر ورنگ کے اژدھوں نے نگل لیا ! وہ اِن سمندروں کے کھنگالنے کے لیے ایسے پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ گھر سے باھر نکلے کہ پھر اُن کو اپنے اھل و عیال اور دوست احباب سے ملنا نصیب نہ ھوا - جہازوں کی چھت اور خوفناک دریاؤں کی سطح زندگی بھر اُن کی رفیق رھی ! اُن میں سے بہتوں نے بحر ظلمات کی تاریکیوں اور بحیرۂ نھرّہ کی روشنیوں میں اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کیں ' جہاں اُن کے جسموں کو قرار گاہ لحد میسر نہ آسکی ' اور مادرگیتی اُن عزیز فرزندوں کے لیے اپنی آغوش نہ پھیلا سکی ! اِن شہدائے بحر کی ایک بڑی جماعت تھی جس کی طرف دمشقی نے یہ خفیف سا اشارہ کیا ھے -

" وھاں جو گیا اور اندرونی حصے میں پہنچا ' وہ برباد ھو گیا اور نکل نہ سکا " !

یہی وہ جانباز تھے جن کے طفیل میں علم جغرافیہ نے وسعت پائی ' اور یہی وہ قافلہ سالار تھے جن کے نقش قدم پر چلنے کے باعث آنے والے مکتشفین کے قافلوں اور مہموں کا نام روشن ھوا - کسی نے اِنھیں کے متعلق کہا ھے ' اور کیا خوب کہا ھے -

بعد از وفات تربت ما بر زمیں مجوے
در سینہ ھاے مردم عارف مزار ما است

بحر ورنگ کا زمانۂ اکتشاف

اگرچہ بحر ورنگ کے اکتشاف کا زمانہ متعین طور پر معلوم نہیں ' لیکن اِتنا ضرور کہا جاسکتا ھے کہ سنہ ۳۰۰ھ کے بعد [۱] اور سنہ ۳۴۹ھ سے پیشتر اُس کا پتا چل گیا تھا - گو مفصل حالات معلوم نہ تھے -

[۱] ــــ المسالک والممالک ' ابن خرداذ بہ -

کتاب‌العجائب ' مسعودی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحر ورنگ اور موجودہ "راس بیرنگ" کا بھی مصنف کو علم تھا - اگرچہ نام معلوم نہ تھا - اصل عبارتیں آگے آتی ہیں - البیرونی (سنہ ۴۲۱ھ) نے کتاب‌التفہیم میں اِس سمندر کے جاے وقوع وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ' اور نقشے میں اُس کی جو ٹھیک جگہ دکھائی ہے ' وہ اِس وقت سب سے پہلا ماخذ اور سب سے پرانا ذخیرہ ہے - تاہم وہ اُس تحریری سرمائے (سیاحوں کی بیاضوں اور یاد داشتوں) سے ماخوذ ہے جو سنہ ۳۰۰ھ اور ۴۰۰ھ کے درمیان جمع ہوا تھا ' اور جو افسوس ہے کہ اِس وقت ہمارے پاس نہیں !

ورنگ اور مسلمان

یہاں سے مضمون کا جغرافی حصہ شروع ہوتا ہے - مسلمانوں نے ورنگ کے متعلق اپنے جغرافیوں میں کیا معلومات جمع کیے ؟ اب اِس کو بالتفصیل ظاہر کرنے کا موقع ہے - اس لیے مناسب ہے کہ ورنگ کا مفصل جغرافیہ اسلامی کتابوں سے مرتب کر دیا جائے -

انسائیکلوپیڈیا میں چونکہ اِس سر زمین کا اکتشاف
تلفظ
ویٹس بیرنگ کی طرف منسوب ہے ' اس لیے انگریزی لب و لہجہ میں اس کے نام کا تلفظ " بیرنگ " ہو گیا ہے - لیکن مسلمان جغرافیہ نویسوں کی تحقیقات کے مطابق اِس نام کو بیرنگ سے کوئی تعلق نہیں - پھر صحیح تلفظ کیا ہے ؟

(۱) البیرونی نے تفہیم میں اور دمشقی نے نخبے میں ورنگ اور ورانک دو تلفظ لکھے ہیں -

(۲) مستوفی نے نزہۃالقلوب میں صرف ورانک لکھا ہے -

(۳) باقی چار مصنفین یعنی طوسی ' قزوینی ' قطب شیرازی ' اورابوالفدا نے ورنگ درج کیا ہے -

چونکہ اکثریت " ورنگ " کی طرف ہے، اس لیے ہم اِسی کو اختیار کرتے ہیں، یعنی الف کے بجاے "واء" کو زبر!

وجہ تسمیہ

ورنگ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ انسائکلو پیڈیا کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ ورنگ کے جزیروں، سمندر اور آبناے کا نام اُس کے مکتشف ویٹس بیرنگ کے نام پر پڑا ہے- لیکن کیا یہ واقعہ ہے؟ کیا شخص مذکورسے پہلے اِس مقام کا یہ نام تھا؟ اسلامی جغرافیہ بتلاتا ہے کہ اب سے کم از کم ساڑھے آٹھ سو برس (اور جدید اکتشاف اور بیرونی کی کتاب کے سال تصنیف کو لیا جائےتو سات سو تینتیس برس) پیشتر بھی اِس مقام کا یہی نام تھا - کیا اِس آٹھ سو برس پہلے کے اکتشاف کا سہرا بھی روس کے ویٹس بیرنگ کے سر ہو سکتا ہے؟

مسلمان مصنفین کی تحقیقات کے مطابق اِس مقام کا نام مکتشف کے نام پر نہیں، بلکہ اُس قوم کے نام پر رکھا گیا ہے جو یہاں آباد تھی -

البیرونی (سنہ ۴۲۱ھ) نے تفہیم میں لکھا ہے،

وهم امة على ساحله ،	اور وہ (ورنگ) ایک قوم ہے اُس (بحر ورنگ) کے ساحل پر،

قطب شیرازی (سنہ ۷۱۰ھ) نے بھی تحفے میں یہی الفاظ لکھے ہیں -

ابو طالب دمشقی (سنہ ۷۲۸ھ) کی نخبۃالدھر میں یہ الفاظ ہیں،

ورنک اسم طائفة	ورنگ ایک گروہ کا نام ہے،

ابوالفدا (سنہ ۷۳۲ھ) کی تقویم میں ہے،

ورنک امة على ساحله ،	ورنگ اُس (بحر ورنگ) کے ساحل پر ایک قوم ہے،

وجہ تسمیہ معلوم ہونے کے بعد اب ضرورت ہے کہ قوم ورنگ، ملک ورنگ اور بحر ورنگ کی علحدہ علحدہ تفصیل کی جائے -

۱—قوم ورنگ

بیرونی ' قطب شیرازی ' دمشقی ' ابوالفدا اور مستوفی کے بیانات سے ' جن میں بعض ابھی گزر چکے ہیں ' اور بعض آگے آئیں گے ' یہ ثابت ہوتا ہے کہ ورنگ ایک قوم تھی ' لیکن اُس قوم کی کیا تعداد تھی ؟ اور اُس کے ملک میں آبادی کم تھی یا زیادہ ؟ اِس کا تذکرہ اب تک نہیں کیا گیا ہے۔

آبادي

مسلمانوں میں اِس کے متعلق دو مختلف خیال تھے ' جن کو ہم پہلے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے نقل کرتے ہیں ' پھر اُن پر تنقید کریں گے -

۱—بیرونی کی تفہیم (سنہ ۴۲۱ھ) میں ہے -

وقليل من وراء هذاالاقليم من‌الامم مثـل ايـسوا و ورانک و يـورة وامثالهم '	اور اِس اقلیم (ہفتم) کے آگے بہت کم قومیں ہیں ' مثلاً ورنگ ' ایسوا ' یورہ وغیرہ -

۲—قزوینی کی آثارالبلاد (سنہ ۶۸۲ھ) میں ہے -

لايصلح......و لا للحيوان ' وہ (زمین)......اور جاندار کے مناسب نہیں

۳—اِسی مصنف کی دوسری کتاب عجائب‌المخلوقات کے فارسی ترجمے میں ہے -

هیچ آبادانی نیست -

۴—دمشقی سنہ (۷۲۸ھ) کی نخبۃالفکر میں ہے -

الاقليم‌السابع ليس فيه كثير عمران' انما هو في المشرق غياض و جبال يـاوي‌اليهـا طوائف من‌التـرک كالمتوحشين' ويمرعلى‌بلاد البجناكيه	اقلیم ہفتم ' اِس میں بہت آبادی نہیں ہے - مشرق میں صرف چند جنگل اور پہاڑ ہیں ' جہاں کچھ ترک قبائل وحشیانہ زندگی بسر

و بلغار الکفار والروس والصقالبة و باشغرت وبری سواد ورانک و یورة '	کرتے ھیں - اوریہ (اقلیم) بلاد بجناکیہ ' کفار بلغار ' روس ' صقالبہ ' باشغرت ' اور سواد کی دو خشکیوں (؟) ' ورانگ اور یورۃ پر سے گزرتی ھے -

یہ عبارت جیسا کہ صاف ظاهر ھے ' البیرونی کی کتاب سے لی گئی ھے - لیکن اِس میں چند غلطیاں ھیں ' جن میں بعض کتابت کی ہوی ھیں ' مثلاً "بلدی سوار و بلغار" کی جگہ " بري سواد " جس سے مطلب خبط هو گیا ھے - بعض اور غلطیاں بھی ھیں ' جن کو اختلاف راے میں داخل کیا جاسکتا ھے - اُن کا ذکر آئے گا -

۵---حمداللہ مستوفی (سنہ ۷۴۰ھ) کی نزهة القلوب میں ھے -

برطرف شرقش ولایات بلند و بدریہ و بودہ و بعضے از قرقیز و ورانگ ست -

دوسری جگہ ھے '

بدریہ و سنوریہ و بلند و ورانگ و انسور و بودہ بلاد و صحاری بسیارست خلف اقلیم هفتم ' درمیان بحر شرقی و دریاے قالاطیقون - و بیشتر سکان آنجا صحرانشینند -

اصولاً بیرونی سب سے قدیم ماخذ اور مستوفی سب سے اخیر ماخذ میں یہ اختلاف ھے کہ

۱---بیرونی آبادی کی قلت تسلیم کرتا ھے ' اور

۲---مستوفی کثیر آبادی کا قائل ھے '

چوتھا ماخذ دمشقی قلت آبادی میں بیرونی کا هم خیال ھے - اور چوتھا ماخذ قزوینی سرے سے آبادی کا منکر ھے -

دوسرا بہت بڑا اختلاف پہلے اور آخری ماخذ میں یہ ھے کہ دونوں اِس آبادي کو اقلیم هفتم سے آگے ماننے کے باوجود ' اُس کی قلت و کثرت

کے بارے میں مختلف هیں - جس کا بدیہی نتیجه یه نکلتا هے که بعد کے ۳۰۰ برس میں جو تحقیقات هوئی تهی اُس کی وجه سے بیرونی کے معلومات پر اضافه هوگیا تها -

بیرونی اور دمشقی میں اصولی اختلاف یه هے که

۱ — اول الذکر اِس آبادی کو اقلیم هفتم کے آگے مانتا هے ' اور

۲ — دوسرا اُسی اقلیم کے اندر شمار کرتا هے '

لیکن جب یه دیکھا جاتا هے که مستوفی آخری ماخذ بهی بیرونی کا هم خیال هے تو یہی صحیح معلوم هوتا هے که یه آبادی اقلیم هفتم سے آگے تهی - شائد اسی لیے قزوینی (چوتھے ماخذ) نے اِس آبادی میں کسی اقلیم کا نام هی نہیں لیا هے -

جیسا که دمشقی اور مستوفی نے تصریح کی هے ' یه آبادی وحشی و صحرائی تهی - تہذیب و تمدن کا قدم اُس وقت یہاں تک نہیں پہنچا تها - اور شائد آج تک نہیں پہنچا هے -

نسل

یه آبادی کس نسل کی تهی ؟ اِسکی تصریح دمشقی (سنه ۷۲۸ھ) نے کی هے '

وهم صقلب الصقالبة '	وہ (ورنگ) صقالبه میں صقلب هیں '

صقالبه کا تذکرہ همارے ماخذوں میں سے تین میں موجود هے - بیرونی ' قطب شیرازی اور دمشقی نے ورنگ کے هم‌سرحد هونے کی حیثیت سے اُن کا نام لیا هے ' اور بیرونی کے نقشے میں وہ بحر ورنگ سے مغربی و جنوبی جانب دکھائے گئے هیں -

بیرونی لکھتا هے '

و یخرج منه خلیج عظیم فی شمال الصقالبة '	اور اُس (بحر؟ اوقیانوس) سے صقالبه کے شمال میں ایک بڑا خلیج نکلتا هے '

دوسری جگہ ہے '

واما الاقلیم السابع .... والروس والصقالبة '	اور لیکن اقلیم ہفتم ...... اور روس و صقالبہ پر سے گزرتی ہے '

قطب شیرازی نے لکھا ہے '

هل یمکن المسیر من الروس والصقلاب الخ '	کیا روس اور صقلاب سے سفر ممکن ہے الخ

دمشقی کی نخبة الفکر میں ہے '

الاقلیم السابع .... والروس والصقالبة '	اقلیم ہفتم ' .... اور روس و صقالبہ پر سے گزرتی ہے '

دوسری جگہ ہے '

و منه شعبة تتصل بالبحر الشمالی الی بحر ورنک والصقالبة '	اور اُس (جبل فتح) کا ایک حصہ بحر شمالی سے ملا ہوا ' بحر ورنگ اور صقالبہ تک چلا گیا ہے ' -

اِسی کتاب کی ایک عبارت گزشتہ عنوان میں نقل کی گئی ہے ' اُس کے بعد کچھ آگے چل کر ہے '

و ان بحر الروس متصل ببحر ورنک والصقالبة '	اور بحر روس ' بحر ورنگ اور صقالبہ سے ملا ہوا ہے '

غرض ورنگ اور صقالبہ ایک ہیں ' بلکہ دمشقی کے قول کے مطابق اصلی صقالبہ وہی ہیں جو ورنگ کہلاتے ہیں - کیونکہ وہ صقلب کی اولاد ہیں - صقالبہ میں صقلب کی اولاد کے علاوہ مازای ابن یافث کی اور شاخیں بھی شامل ہوگئی تھیں - لیکن خود صقالبہ کون قوم ہے ؟ یہ ایک اہم تاریخی سوال ہے - ہم مورخین کے اختلافات سے قطع نظر کرکے دو نہایت قدیم ماخذوں سے صقالبہ کا نسب ثابت کرتے ہیں -

" طبری " (سنہ ۳۱۰ ھ) نے اپنی تاریخ کبیر میں یافث بن نوح کے کئی بیٹوں کے نام لکھے ھیں ' اُن میں سے "یوان" کو صقالبہ اور برجان کا پدر اعلیٰ قرار دیا ھے [۱] - اور ایک جگہ یہ عبارت بھی لکھی ھے '[۲]

فمن بنی یافث کانت یاجوج و ماجوج والصقالبۃ والترک '	پس بنو یافث سے یاجوج ' ماجوج ' صقالبہ اور ترک تھے -

" ابو زید بلخی " (سنہ ۳۴۲ ھ) کی طرف منسوب کتاب البدء والتاریخ' جو دنیا کی عام تاریخوں میں سب سے مبسوط کتاب ھے' اُس میں بنو یافث کے ناموں میں اضافے اور اختلاف کے ساتھ ساتھ گو "یوان" (مورث صقالبہ) کا نام نہیں ھے ' تاھم اجمالی طور پر صقالبہ ' ترک ' یاجوج ' ماجوج ' سب کو بنو یافث تسلیم کیا ھے - وہ یافث بن نوح کا تذکرہ کرکے لکھتا ھے '

فمنھم الترک والخزر والصقالبۃ و برجان '	پس اُنھیں میں سے ترک ' خزر ' صقالبہ اور برجان ھیں -

اِس طرح طبری اور ابوزید دونوں بلااختلاف صقالبہ کو یافث ابن نوح کی اولاد تسلیم کرتے ھیں - یعنی اُن کو اور ترکوں کو ھم نسب مانتے ھیں - اس لئے ورنگ اور ترک بھی ھم نسب ھوئے -

شکل و صورت

یہ معلوم ھونے کے بعد کہ ترک اور ورنگ ایک ھی مورث اعلیٰ کی اولاد ھیں- قوم ورنگ کے قد و قامت اور خط و خال کے متعلق نہایت آسانی سے رائے قائم کی جاسکتی ھے - یعنی وہ سرخ و سفید ھوتے تھے - جیسا کہ ترکوں کے متعلق ابن رستہ (سنہ ۲۹۰ ھ) کی تصریح موجود ھے - تاھم قطب شیرازی (سنہ ۷۱۰ ھ)

---

[۱]—تاریخ الامم والملوک ص ۲۱۷ و ۲۱۸ ج ۱ '
[۲]— ایضاً ص ۲۱۲ ج ۱ '

کے ہم ممنون ہیں جنہوں نے تحفۂ شاہیہ میں ورنگ کی نسبت یہ معمولی سی بات بھی لکھ دی ہے - فرماتے ہیں '

طوال ' کماۃ '	یہ لوگ دراز قد اور شجاع ہوتے ہیں'

آخری لفظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اِن لوگوں کے پاس لڑنے کا ضروري سامان موجود تھا - کیونکہ شجاع کو کَمِیّ (اِسی کی جمع کماۃ ہے) اسی لیے کہتے ہیں کہ اُس نے '

کسی نفسہ ای سترھا بالدرع والبیضۃ (لسان العرب ج ۲۰) '	اپنے بدن کو زرہ اور لوھے کے خود سے چھپایا ' (یعنے اِن چیزوں کو پہن لیا)

پیشہ

ایک صحرائی اور وحشی آبـادی جو وسائل معاش اختیار کر سکتی ہے ' ورنگ کے پاس بھی اُسی قسم کے وسائل تھے - اُن کی تفصیل سب سے آخری ماخذ مستوفی (سنہ ۷۴۰ھ) کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے - اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیرونی کے ۳۰۰ برس بعد اِس چیز سے واقفیت ہوئی تھی - بہر حال مستوفي کی عبارت یہ ہے '

و بنیاد و معاش ایشان بر نتاج مواشی و محصول معدنیات بلور بیشترست '

" بیشتر " کے لفظ سے یہ پتا چلتا ہے کہ ورنگ کے پاس اور ذرائع معاش بھی تھے -

زبان

ورنگ کی زبـان کیـا تھی ؟ اِس کا تذکرہ شمس‌الدین دمشقی (سنہ ۷۲۸ھ) نے کیا ہے - جس نے اُن کی اصلیت اور نسب و نسل کے متعلق سب سے پہلے دنیا کو آگاہ کیا تھا - لکھتا ہے '

هفتم ' لایکادون یفقهون قولا '	غیر فصیح هیں ' تقریباً بات نہیں سمجھتے '

چونکہ یہ لوگ متمدن آبادی سے بالکل منقطع تھے' اس لیے مہذب دنیا کی بولیاں نہیں سمجھ سکتے تھے - میری راے میں اُن کی زبان غالباً صقلبی یا اُس کی کوئی شاخ ہو گی -

مذہب

ورنگ کے مذہب کی بابت ہمارے پاس جو کچھ هے وہ یہ هے کہ قدما " اندلس " کے حصۂ ساحلی شمالی واقع اقلیم چہارم ' پنجم' ششم ' اور " اقلیم هفتم " کو مجوس کے زیر حکومت سمجھتے تھے [۱] - مجوس سے مراد آتش پرست هیں - اِن مقامات کی آبادی زیادہ تر آگ کی پوجا کرتی تھی - چنانچہ "آئرلینڈ" والوں کے متعلق زکریا قزوینی نے آثارالبلاد میں [۲] ؛ " روس " کے متعلق یعقوبی نے کتاب‌البلدان میں [۳] ' ابو عبید بکری نے المسالک والممالک میں [۴] ' اور جمال الدین و طواط نے مناهج‌الفکر و مباهج العبر میں [۵] ؛ " صقالبہ " کے متعلق مسعودی نے کتاب‌العجائب میں [۶] ؛ اور " برجان " کے متعلق قزوینی نے آثارالبلاد میں [۷] ' اِسکی تصریح کی هے -

صقالبہ کی آتش پرستی کے متعلق خاص طور سے چند حوالے درج کیے جاتے هیں - اور چونکہ ورنگ بھی اِسی قوم میں شامل تھے ' بلکہ اصلی صقالبہ تھے ' اس لیے اُنکا مذہب بھی یہی ہوگا -

ابن رستہ (سنہ ۲۹۰ ھ) نے الاعلاق‌النفیسة میں لکھا هے [۸] '

---

[۱]—اخبار امم‌المجوس ص ۳۷' بحوالۂ نزہۃالانفس ابن غالب ' اس حوالے کی عبارت نفح‌الطیب ' ابوالعباس مقری میں هے -
[۲]—ایضا ص ۴۲ - [۳]—ایضاً ص ۵۰ - [۴]—ایضاً ص ۸۱ - [۵]—ایضاً ص ۱۰۳ -
[۶]—ایضاً ص ۱۲۷ ' [۷]—ایضاً ص ۱۴۱ [۸]—الاعلاق‌النفیسة ص ۱۴۳ -

وهم کلهم عبدة نیران	اور یہ (صقالبہ) کل کے کل آگ کی پرستش کرتے ہیں '

پھر کہتا ہے [۱] '

اذا مات منهم میت احرقوه بالنار '	جب اُن میں کوئی مرجاتا ہے تو اُس کو آگ میں جلا دیتے ہیں '

مسعودی ' کتاب العجائب میں لکھتا ہے [۲] '

واما الصقالبة فهم عدة امم ' فمنهم ......و قوم یقولون بالمجوسیة و یعبدون الشمس '	اور لیکن صقالبہ تو وہ چند قومیں ہیں ' اُن میں سے بعض .... اور بعض مجوسیت کے قائل ہیں- اور آفتاب کی پرستش کرتے ہیں -

دوسری جگہ کہتا ہے [۳] '

واکثر قبائلهم مجوس ' یحرقون انفسهم بالنار ' و یتعبدون لها '	اور اُن (صقالبہ) کے اکثر قبائل مجوسی ہیں - اپنے (مُردوں) کو آگ میں جلاتے ہیں - اور اُس کی پوجا کرتے ہیں-

اسحاق بن حسن زیّات کی ذکر الاقالیم میں ہے [۴] '

و بعد هذا الاقلیم (یعنی الاقلیم السابع) بلدان کثیرة ' ...... یسکنها المجوس والصقالبة '	اور اِس اقلیم (ہفتم) کے بعد بہت سے شہر ہیں ' ...... وہاں مجوس اور صقالبہ رہتے ہیں -

ابن سعید مغربی نے بسط الارض فی طولها والعرض میں صقالبہ کے ایک بڑے جزیرے کا ذکر کیا ہے جس کے شمال اور مشرق کے بعد کوئی آبادی نہیں - اُس جزیرے کی آبادی کے متعلق لکھتا ہے ' [۵]

---

[۱]—الاعلاق النفیسة ' ص ۱۳۳ - [۲]—اخبار امم المجوس ص ۱۲۷ - [۳]—ایضاً - ص ۱۲۸ ' [۴]—ایضاً - ص ۱۳۰ ' [۵]—ایضاً - ص ۱۳۹ -

یقال انهم باقون علی التمجس و عبادة النار ' و لایرون اعظم منها منفعة لاشتداد الجمد عندهم '	کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ مجوسیت اور آتش پرستی پر ابتک باقی ہیں ' اور آگ سے زیادہ کسی چیز کو نفع‌رساں نہیں سمجھتے ' کیونکہ وہاں بہت برف باری ہوتی ہے '

اِن اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ ورنگ اور اکثر صقالبہ مُردے جلاتے تھے - آتش پرست تھے ' اور آفتاب کی پوجا بھی کرتے تھے - اِس کی یہ وجہ ابن سعید نے خوب بیان کی ہے کہ سردی کی زیادتی اور برف کے انجماد کے باعث اُن کو آگ سب سے زیادہ نافع نظر آتی تھی ' (یہی سبب آفتاب پرستی کا بھی ہو سکتا ہے ') غالباً اِنہیں حوالوں کی بنا پر زائیل نے ورنگ کو اپنے انتخابات میں شامل کر کے مجوس کہا ہے '

سلطنت

یہ اِس سلسلے کا آخری عنوان ہے اور ورنگ کی وحشیانہ زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے عجیب بھی - کہا ورنگ کی کوئی منتظم سلطنت تھی ؟ اِس سوال کا جواب صرف صقالبہ کی تاریخ سے مل سکتا ہے '

ابوعبید بکری نے کتاب‌المسالک والممالک میں صقالبہ کی نسبت یہ فقرے لکھے ہیں [۱] '

بلاد الصقالب متصلة من البحر الشامی الی البحر المحیط الی الشمال ...... وهم اجناس کثیرة مختلفة '	صقالبہ کے شہر بحر شامی سے بحر محیط تک ' شمال تک ' برابر چلے گئے ہیں ' ...... اُن کی بہت سی مختلف قسمیں ہیں -

آگے چل کر لکھتا ہے [۲] '

[۱]—اخبار امم المجوس - ص ۸۲ ' [۲]—ایضاً ص ۸۳ -

و بالجملة فان الصقالب ذوو صولة و بطش ، ولولا اختلافهم بكثرة تفرع اعرافهم و تفرق انفخاذهم ماقامت لهم فی الشدة امة من الامم،

خلاصہ یہ ہے کہ صقالبہ غلبے اور گرفت والے لوگ ہیں ، اوراگر اونچی زمینوں اور قبیلوں میں بکثرت پھیل جانے کی وجہ سے اُن میں پھوٹ نہ پڑگئی ہوتی تو دنیا کی کوئی قوم اُن کے برابر مضبوط نہ ہوتی -

مسعودی کی کتاب العجائب میں ہے ،

و ورائهم (الافرنجة) اجناس اکثر اعتزائهم الی الصقالبة ولهم اتساع مملكة وعمارة ،

اور اُن (اہل یورپ) کے آگے بہت سی قومیں ہیں ، جو زیادہ تر صقالبہ کی ہم نسب ہیں ، اُن کی وسیع سلطنت اور آبادیاں ہیں ،

لیکن اِس سے صقالبہ کی گزشتہ تاریخ اور عظمت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا - اِس راز کو صرف ابوعبید بکری نے فاش کیا ہے ، وہ المسالک والممالک میں لکھتا ہے [۱] ،

وقد کا نوا قدیما سلف یجمعهم ملک سمته "ماخا" و کان من جنس منهم یدعی ولیتابا ، و هذا الجنس معظم فیهم ، ثم اختلفت کلمتهم فزال نظامهم و تحزبت اجناسهم و ملک کل جنس منهم ملک ،

اور یہ لوگ (صقالبہ) قدیم زمانے میں ایک بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے ، جس کا لقب "ماخا" تھا - اور وہ اُن کی اُس قوم سے ہوتا تھا جو ولیتابا کہلاتی ہے - اور یہ قوم اُن میں بڑی با عظمت ہے - پھر اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو اُن کا نظام برباد ہو گیا ، قومیں متفرق

---

[۱] — اخبار امم المجوس ص ۸۲ -

ہوگئیں ' اور ہر قوم کا الگ الگ
بادشاہ ہو گیا ۔

غالباً ورنگ کی علحدگی اور متمدن دنیا سے دوری ' تنزل کے بعد ہوئی ہوگی ' ورنہ دور ترقی میں تو تمام اولاد یافث کی ایک عظیم‌الشان سلطنت تھی ' جو بحرشام سے لیکر یورپ اور ایشیا کے تمام وسطی اور شمالی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی -

۲ــــملک ورنگ

جاے وقوع

جیسا کہ بیرونی کے حوالے سے اوپر گزرا ' یہ ملک اقلیم ہفتم کے آگے ہے ' اسحاق بن حسن بن ابوالحسین زیات نے بھی اِسی طرح مانا ہے ' گو اُس میں ورنگ کا نام نہیں ہے - اُس کی تصنیف کا ایک اقتباس ویر درج ہو چکا ہے - مستوفی بھی البیرونی‌ا ہم خیال ہے - او نزہۃالقلوب کی عبارت اوپر گزر چکی ہے -

قزوینی نے آثارالبلاد میں لکھا ہے '

هو اقصی موضع فی‌الشمال	وہ شمال میں سب سے دور مقام ہے '

اُس نے مزید تفصیل یہ بہم پہنچائی ہے '

ورنک موضع علی طرف البحرالشمالی ' ...... فالموضع الذی علی طرف ذالک الخلیج یسمی بہ‌الخلیج یقال لہ بحر ورنک '	ورنگ بحر شمالی کے کنارے ایک مقام ہے ' ...... پس وہ جگہ جو خلیج کے کنارے ہے ' اور جس کے نام پر خلیج کا نام رکھا گیا ہے الخ

حدود اربعہ

قزوینی کے گذشتہ بیان سے ورنگ کی شمالی حد متعین ہوجاتی ہے ' یعنی وہ بحر شمالی کے کنارے واقع ہے - لیکن اُس کے جنوبی ' شرقی اور غربی حدود کیا ہیں ؟ بیرونی نے ساحل اور آخری حدود ترکستان (یعنی منگولیا) کے درمیان

ورنگ کا ملک تسلیم کیا ہے - قزوینی نے عجائب المخلوقات میں مشرق کی طرف آخری حدود چین (یعنی کوریا و منچوریا) اور ملک ترک (یعنی منگولیا) سرحد قرار دی ہے - قطب الدین شیرازی نے بھی اِسی کو اختیار کیا ہے - اور مستوفی نے بحر شرقی (بحرالکاہل) اور دریاے فالا طیقون (بحر ورنگ) کے درمیان ورنگ کو مانا ہے - اب اگر مستوفی کے بیان کو ہم سامنے رکھیں ' تو ملک ورنگ کے حدود اربعہ یہ ہونگے '

مغرب—بحر ورنگ

مشرق—ترک و چین

شمال—بحر شمالی

جنوب—خزر

اور یہ حدود بالکل اُس نقشے کے مطابق ہیں جو البیرونی نے تفہیم میں شامل کیا ہے -

آب و ہوا قزوینی نے آثارالبلاد میں لکھا ہے کہ " وہاں سخت سردی ہوتی ہے ' ہوا میں لطافت نہیں ہے ' برف ہمیشہ گرتی ہے " یہ بھی لکھا ہے کہ " سخت سردی ' برف اور تاریکی کی وجہ سے وہاں لوگ بہت کم پہلتے پھولتے ہیں " - مستوفی نے تصریح کی ہے کہ " وہاں ہوا نہایت سرد ہوتی ہے " -

دن' رات دمشقی نے بتایا ہے کہ وہاں سب سے لمبا دن سولہ گھنٹے کا ہوتا ہے -

آباد زمین ورنگ کی آبادی کا قزوینی کے سوا کوئی منکر نہیں ہے ' اور آبناے کے متصل علاقے اور جزائر کی نسبت یہ بیان بالکل صحیح ہے- البتہ ملک کے اندرونی حصے کی نسبت اختلاف ہے کہ وہاں آبادی کم ہے یا زیادہ ؟ بیرونی اور دمشقی کم کے قائل ہیں' اور زیادت

ومستوفی زیادہ مانتے ھیں - زیات کے علاوہ اور سب حوالوں کی عبارتیں مضمون کے شروع میں نقل ہو چکی ھیں ' یہاں صرف اُس کے جغرافیے کی عبارت درج کی جاتی ھے [ا] '

وبعد هذا الا قليم (یعنی الاقلیم السابع) بلدان کثیرة مسکونة '	اور اِس (یعنی ساتویں) اقلیم کے بعد آباد شہر بکثرت ھیں -

اِس سے ثابت ہوتا ھے کہ متاخرین کی تحقیقات نے قدما کی معلومات پر اضافہ کردیا تھا ' -

مستوفی نے آباد قوموں کے نام بھی لکھے ھیں ' یعنی بدریہ ' سلوریہ ' بلند ' ورانک ' انسور ' بودہ - اور اِس سے زیات کے خیال کی تائید ہوتی ھے " ورنگ میں بے شبہہ ' بعض حصے غیر آباد بھی تھے ویران زمین اور اِس کو ھمارا پہلا ماخذ بیرونی بھی تسلیم کرتا ھے -

تفہیم میں ھے '

و بین ساحلہ و بین اقصیٰ ارض الترک ارضون و جبال مجہولة خربة ' غیر مسلوکة '	اور اُس کے ساحل اور آخری سر زمین ترک کے درمیان بہت سی نا معلوم ' ویران زمینیں اور پہاڑ ھیں ' جہاں لوگ جاتے نہیں -

قزوینی کی عجائب المخلوقات کے فارسی ترجمے میں ھے '

واراضی خراب بسیارست ...... واین ارض ھیچ مسلوک نیست '

قطب شیرازی کے تحفے میں ھے '

واراض غیر مسکونة	اور غیرآباد زمینوں میں '

دوسری جگہ ھے '

[ا]—اخبار امم المجوس ص ۱۳۰ '

ولکونها غیر مسکونة ایضاً	اور اُن کے غیرآباد ہونے کی وجہ سے بھی -

پہاڑ — بیرونی لکھتا ہے '

و جبال مجھولة	اور نا معلوم پہاڑ ہیں '

قزوینی کی عجائب المخلوقات کے ترجمے میں ہے '

و انجا کوہہا مجھول ...... بسیارست '

قطب شیرازی کہتے ہیں '

فی جبال غیر مسلوکة '	ایسے پہاڑوں میں جہاں آمد و رفت نہیں ہے '

جنگل — وونگ اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں جنگل بھی بہت ہیں - مستوفی نے لکھا ہے'

...... و صحاری بسیارست '

لیکن یہ تمام جنگل غیرآباد نہیں ہیں ' اِن میں اچھی خاصی آبادی ہے - مستوفی کہتا ہے '

بیشتر سکان آنجا صحرا نشیںاند '

پیداوار — قزوینی نے آثارالبلاد میں لکھا ہے '

لایصلح للنبات	وہ (وونگ) نباتات کے مناسب نہیں'

یہ بیان آبادے کے متصل حصے کے متعلق ہے - اندرونی علاقے کی نسبت مستوفی بتاتا ہے کہ

آنجا از ارتفاعات اندکے غلہ ' و اکثر جاورس و حبوب صیفی بود ' و پنبہ و انگور میوہ ہا قطعاً نبا شد -

روئی ' انگور اور میوے کی پیداوار سے انکار کرتے ہوئے مستوفی نے غلے کی کمی بھی ظاہر کی ہے ' اِس غلے سے مراد شاید جاڑے کی پیداوار

ہوگی ' گرمی کی پیداوار سے مراد شائد گیہوں ' جو اور چھلہ دانہ ہوں گے' جو آج بھی سائبیریا میں (جس کا ورنگ ایک حصہ ہے) پیدا ہوتے ہیں [۱] -

حیوانات

مستوفی نے حیوانات کی تفصیل نہیں بتائی ' صرف یہ لکھا ہے -

اما مواشی بسیار بود -

اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ باشندوں کا ذریعۂ معاش بڑی حد تک مویشیوں کی پرورش و پرداخت ہے ' مویشی کے لفظ سے گاے ' بیل ' اونٹ ' گھوڑے مراد ہیں جو آج بھی سائبیریا میں نظر آتے ہیں [۲] -

معدنیات

مستوفی نے ورنگ کے معادن میں بلور کا خاص طور پر ذکر کیا ہے -

بنیاد و معاش ایشان بر .... محصول معدنیات بلور بیشتر ست -

۳—بحر ورنگ

اِس سمندر کا ذکر سب سے پہلے مسعودی (سنہ ۳۴۹ھ) کی کتاب العجائب میں آیا ہے - لیکن اُس کو اِس کا نام معلوم نہ تھا - لکھتا ہے [۳] '

واماالصقالبة......ولهم بحر حلو يجري من ناحية الشمال الى الجنوب' ولهم ايضاً بحر يجري من الغرب	اور بہرحال صقالبہ.........اور اُن کا ایک شیریں سمندر ہے جو شمال سے جنوب کی طرف جاری ہے ' اور

[۱]—منجم العمران ص ۲۵۹ ج ۲' از سید محمد امین خانجی -
[۲]—ایضاً -
[۳]—اخبار امم المجوس ص ۱۲۸ -

الی الشرق ، حتی یتصل ببحر آخر یجیء من ناحیة البلغر -	اُن کا ایک دوسرا سمندر بھی ھے جو مغرب سے مشرق کی طرف جاری ھے یہاں تک کہ دوسرے سمندر سے جو بلغر کی طرف سے آیا ھے مل گیا ھے-

اِس عبارت میں پہلا فقرہ قابل توجہ ھے - وہ جس سمندر کو بحر مقالبۃ کہہ رھا ھے ، اُسی کا نام بحر ورنگ ھے !

البیرونی (سنہ ۴۲۱ھ) نے اِس سمندر کا صحیح نام دریافت کیا - اور تفہیم میں اُس کے مزید حالات لکھے- اِن مصنفین میں بیرونی، طوسی، قزوینی ، قطب شیرازی ، دمشقی ، ابوالفدا ، مستوفی ، سب نے بحر کے لفظ سے اُس کا تذکرہ کیا ھے - لیکن بیرونی ، قزوینی اور مستوفی نے خلیج بھی کہا ھے - دمشقی نے برزۂ کبری کہہ کر اُس کو یاد کیا ھے جو بڑی آبنائے کا مرادف ھے -

راس ورنگ

مسعودی نے کتاب العجائب میں دوسری جگہ ایک سمندر (ونجل) کی راس ، ظلمت شمالی کے قریب سے نکلتی ھوئی بتاتی ھے ، کہتا ھے [۴] -

راسہ یخرج من قرب الظلمۃ الشمالیۃ ،	اور اُس کی راس (یا سر) ظلمت شمالی کے قریب سے نکلتی ھے -

اب اگر بحر "ونجل" سے مراد جنوبی "بحرالکاہل" ھے تو اُس کی راس ، ظلمت شمالی کے قریب وھی ھو سکتی ھے جو اب راس بیرنگ کہلاتی ھے - اِس عبارت سے صاف ظاھر ھے کہ مسعودی کو " راس بیرنگ" (Bering Strait) کی بھی اطلاع تھی !

---

[۴] --- سلسلۃ التواریخ ص ۱۷۲ ، مطبوعۂ پیرس -

بحر ورنگ کا مخرج

یہ سمندر کہاں سے نکلا ہے ؟ اِس کا جواب مسعودی بیرونی ، قزوینی ، دمشقی ، اور ابوالفدا نے یہ دیا ہے کہ اِس کا مخرج ظلمت شمالی اور بحر شمالی ہے -

حدود

اِس سمندر کے حدود اربعہ کیا ہیں ؟ اِس کو چند مصنفین نے اجمالاً لکھا ہے - اوپر مسعودی کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں اُن سے بحر ورنگ کے شمالی و جنوبی حدود معلوم ہوتے ہیں - یعنی اُس کے شمال میں بحر ظلمت اور جنوب میں بحر و نجل ہے - بیرونی نے مشرقی حدود بھی بتائے ہیں کہ وہ قوم ورنگ کی آبادی کے آگے جاکر مشرق کی طرف گھوم گیا ہے - کہتا ہے '

ویخرج منہ خلیج عظیم فی شمال الصقالبۃ و یمتد الی قرب ارض بلغار المسلمین ' و یعرفونہ ببحر ورنک ' .... ثم ینحرف وراءھم نحوالمشرق '	اور اُس (بحر شمالی) سے ایک بڑا خلیج ' صقالبہ کے شمال میں نکلتا ہے ' جو مسلمانان بلغار کی زمین کے قریب تک پھیلتا چلا گیا ہے ' اُس کو بحر ورنگ کہتے ہیں' ....پھر وہ اُن (قوم ورنگ) کے آگے بڑھ کر مشرق کی طرف گھوم گیا ہے '

طوسی لکھتے ہیں -

وکبحر ورنک من جانب الشمال '	اور جیسے شمال کی طرف بحر ورنگ '

قزوینی کی آثارالبلاد میں لکھا ہے '

ان البحرالمحیط من جانب الشمال خرج منہ خلیج الی نحوالجنوب'	بحر محیط سے'' شمالی جانب سے ایک خلیج جنوب کی طرف نکلا ہے '

اِسی مصنف نے عجائب المخلوقات میں تقریباً وهی خیال ظاهر کیا هے جو بیرونی کا هے -

قطب شیرازی لکھتے هیں '

ان المحیط المغربی ایضاً اذا جاوز اندلس نحو الشمال دخل قطعة منه فی المعمورة ممتدة فی شمال ارض الصقالبة الی ارض مسلمی بلغار ' ...... واذا جاوز عن ورنک نحو المشرق امتد وراء اراضی الترک ...... الی حدود اراضی الصین '

محیط مغربی (اوقیانوس یا اتلانتک) بهی جهاں اندلس سے گزر کر شمال کی طرف پھیلا هے تو اُس کا ایک حصه آبادی کے اندر چلا آیا هے جو ارض صقالبه کے شمال میں مسلمانان بلغار کی سر زمین تک پھیلتا چلا گیا هے ' ...... اور جهاں وہ ورنگ سے مشرق کی طرف بڑھا هے تو آراضی ترک کے آگے...... آراضی چین کی حدوں تک پھیل گیا هے '

دمشقی کا قول هے -

و فی الشمال والمغرب بحر الظلمة و بحر ورنک والمحیط الشمالی '

اور (بحر محیط کا نام) شمال و مغرب میں بحر ظلمت' بحر ورنگ اور محیط شمالی هے '

دوسری جگه لکھا هے '

ثم تمتد سواحل المحیط من حدود هذة الجزرة والی ان تعطف فی جهة الشمال بغرب ' و هناک بـرزته الکبری الـتی تـسمی بـحـر

پھر محیط کے سواحل اِس رودبار (بحر انگلترة) کے حدود سے پھیلتے هوئے شمال کی سمت میں مغرب کی طرف گھوم جاتے هیں '

ورنگ ' ...... و هذه الجزة هی بحر الظلمة الشمالی '	اور وهیں اُس کی وہ بڑی رودبار هے جو بحر ورنگ کہلاتی ہے ' ...... اور یہی رودبار (بحر ورنگ) شمالی بحر ظلمت هے '

ابوالفدا کی تقویم البلدان میں هے '

یخرج من البحر المحیط الشمالی الی جهة الجنوب '	وہ (بحر ورنگ) بحر محیط شمالی سے جنوب کی طرف نکلتا هے '

گذشتہ بیانات میں بحر ورنگ کے حدود یہ هیں ' مسعودی نے اُس کے شمال میں بحر ظلمت اور جنوب میں بحر ونجل بتایا هے - بیرونی اور قطب شیرازی نے اُس کے جنوب میں صقالبہ کا ملک ' اور مغرب میں سرزمین ورنگ قرار دی هے - طوسی نے اُس کو شمال کی طرف اور دمشقی نے شمال و مغرب کی طرف بتلایا هے - قزوینی اور ابوالفدا نے لکھا هے کہ بحر شمالی سے نکل کر جنوب کی طرف آیا هے - اب صرف مستوفی باقی رہ جاتا هے ' جس نے نہایت وضاحت کے ساتھ اِس سمندر کی حدیں بتلائی هیں - اُس کے رو سے بحر ورنگ کے مشرق بلغار ' بدریہ ' بودہ ' قرقیز اور ورانگ کے ممالک هیں - جنوب کی طرف دشت خزر هے - مغرب میں فرنگستان (یورپ) ' جنوب و مشرق میں بحر الکاهل اور شمال و مشرق میں بحر شمالی هے - اور یہ بالکل بیرونی کے نقشے کے مطابق هے -

رقبہ

ابوالفدا نے تقویم البلدان میں بیرونی کے حوالے سے لکھا هے '

ولہ طول و عرض صالحان '	اور اُس (بحر ورنگ) کی لمبان اور چوڑان اچھی خاصی هے '

حالانکہ بیرونی کی تفہیم میں جو عبارت ہے وہ بالفاظہا اوپر نقل کی گئی ہے - اُس میں کہیں یہ فقرہ نہیں ہے - واقعہ یہ ہے کہ نصیرالدین طوسی نے تذکرے میں جہاں بحر جنوبی کے چار خلیجوں کا ذکر کیا ہے ' وہیں یہ الفاظ لکھے ہیں '

ولکل واحد منها طـول و عـرض صالحان '	اور اِن (خلیجوں) میں سے ہر ایک کی لمبان اور چوڑان اچھی خاصی ہے'

ابوالفدا نے چونکہ نصیر طوسی کا تذکرہ بھی دیکھا تھا اس لیے عبارت وہاں سے نقل کی اور سہواً اُس کو بیرونی کی طرف منسوب کر دیا ' جس سے دوسری غلطی یہ پیدا ہو گئی کہ جو عبارت بحر جنوبی کے خلیجوں کی نسبت تھی وہ بحر ورنگ کے حال میں درج ہو گئی - نیز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفدا نے اپنے ماخذوں کی عبارت نقل کرتے وقت غور و فکر سے بالکل کام نہیں لیا ' اُس نے اِس سمندر کے جو ناتمام حدود لکھے ہیں ' اُن کا دونوں ماخذوں میں پتا نہیں ہے -

بہر حال رقبے کے لیے ابوالفدا کی عبارت بیکار ہے - البتہ قطب الدین شیرازی نے اِس سلسلے میں جو الفاظ لکھے ہیں اُن پر یقیناً رقبے کا اطلاق ہو سکتا ہے - وہ کہتے ہیں '

طولها من المغرب الی المشرق مائة فرسخ و عرضها ثلاثة و ثلاثون فرسخا'	اُس کا طول پچھم پورب سو فرسخ ' اور اُس کا عرض تینتیس فرسخ ہے '

ایک فرسخ اگر تین میل کا فرض کیا جائے تو لمبان تین سو میل اور چوڑان ننانوے میل ہوئی ' اِس طرح اُنتیس ہزار سات سو میل مربع کل رقبہ ہوا - اگر فرسخ چھہ میل کا مانا جائے تو چھے سو میل طول ' ایک سو اٹھانوے میل عرض ' اور اُنسٹھہ ہزار چار سو میل مربع رقبہ ہوگا -

جانور

اِس سمندر کے اژدھوں کا ذکر دمشقی نے نخبة الدهر میں کیا ہے - کہتا ہے '

والتنّين يوجد فی البحر الرومی و بحرالخزر و بحر ورنک بکثرة '	اور اژدھے...... بحر ورنگ میں بکثرت پائے جاتےهیں '

دریا

بحر ورنگ میں بعض دریا بھی گرتے ھیں- مستوفی نے لکھا ھے '

و از آب نہرها بعضے در بحر عالاطیقون کہ آنرا نیز دریاے ورانگ می گویند ' و بعضی در بحر شرقی می ریزد '

بحر ورنگ اور بحر مشرقی کا اتصال

اِس مسئلے کے متعلق قطب شیرازی نے عجیب بات لکھی ھے '

ولکونها غیر مسکونة ایضا و امتناع إجراءالسفن فیه لما مر ' لم یعلم اتصاله بالمحیطالمشرقی '	اور چونکہ یہ زمینیں غیر آباد بھی ھیں ' اور جیسا کہ اوپر گزرا محیط مغربی میں کشتیوں کا چلنا دشوار ھے ' اِس لیے یہ ابتک معلوم نہوسکا کہ وہ محیط مشرقی سے ملا ھے یا نہیں ؟

محیط مشرقی سے بحرالکاہل (Pacific Ocean) مراد ھے - علامہ کو سنہ ۷۱۰ ھ تک یہ معلوم نہ تھا کہ محیط مغربی (اور بحر ورنگ) بحرالکاہل سے ملا ھے ' حالانکہ اُن سے بہت قدیم ماخذوں میں اِس کی تصریح موجود ھے - مسعودی (سنہ ۳۴۶ ھ) نے ایک " راس " کو شمال میں بحر ظلمت اور جنوب میں بحر ونجل سے متصل مانا ھے - بیرونی نے بحر ورنگ کا مشرق کی طرف گھوم جانا بتصریح لکھا ھے' اور نقشے میں اُس کو محیط مشرقی یعنے بحرالکاہل سے ملا دیا ھے -

طوسی نے تذکرے میں خشکی کے اندر والے اُن سمندروں کے نام گنائے ہیں ' جو بحر محیط سے مل گئے ہیں ' اُنہیں میں بحر ورنگ بھی ہے '

وکبحر ورنک من جانب الشمال ' | اور جیسے بحر ورنگ ' جو شمال کی جانب ہے '

زکریا قزوینی کے الفاظ اور زیادہ صاف ہیں -

ان البحر المحیط من جانب الشمال خرج منه خلیج الی نحو الجنوب-

بعد والوں میں دمشقی نے بحر محیط کے متعلق لکھا ہے کہ اُس کے مختلف سمتوں میں مختلف نام ہیں ' چنانچہ شمال و مغرب میں اُس کو بحر ظلمت ' بحر ورنگ اور محیط شمالی کہا جاتا ہے '

مستوفی نے لکھا ہے '

درمیان بحر شرقی و دریاے ڤالا طیقون | یہ (آبادیاں) بحر شرقی اور بحر ورنگ کے درمیان واقع ہیں '

اِن حوالوں سے علامہ قطب الدین شیرازی کی غلطی صاف واضح ہو جاتی ہے -

بحر ورنگ کے متعلق اسلامی جغرافیے کی اِن تمام تفصیلات کے بعد اب انسائیکلو پیڈیا بر ٹانیکا کا یہ بیان پڑھیے !

" بحر ورنگ ' بحرالکاہل کا شمالی جانب اتصال ہے ' جس کی وجہ سے اُس کی حدبندی جزائر الیو شین کے طویل سلسلے سے ہوتی ہے - اُس کے حدود یہ ہیں ' مشرق الاسکا ' مغرب سواحل سائبیریا و کمچاٹکا اُس کا رقبہ تخمیناً آٹھ لاکھ ستر ہزار میل مربع ہے - شمال اور مشرق میں اُس کے اندر بہت سے جزائر ہیں ' ...... یہ سمندر شمال کی طرف بذریعۂ آبنائے بیرنگ ' بحر منجمد (شمالی) سے مل گیا ہے " الخ -

بعض قدیم و جدید نظریات کی تطبیق

ورنگ کے متعلق اِس قدر عرض کرنے کے بعد اب کچھ چیزیں

ایسی باقی رہ گئی ہیں جن کو یکجا طور پر ایک عنوان میں لکھنے کی ضرورت ہے -

(۱) سب سے پہلا مسئلہ ورنگ کی آبادی کا ہے - اوپر دکھایا گیا ہے کہ بیرونی ' دمشقی ' زیات اور مستوفی ' وہاں آبادی کے قائل ہیں - بلکہ موخرالذکر دو مصنفین کثیر آبادی مانتے ہیں - اِس کی موجودہ جغرافیے سے یوں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ وہاں اِس وقت بھی آبادی موجود ہے - چنانچہ " ایس۔ی کیپ " سے " لوپاٹکا کیپ " (C. Lopatka) تک جتنا علاقہ ہے ' اُس میں کہیں کہیں آبادی ہے اور " کمچاٹکا " (Kamchatka) کے دونوں حصوں میں بھی کچھ شہر موجود ہیں - یہی وہ مقامات ہیں جو قوم ورنگ کا مسکن تھے -

(۲) اوپر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ قزوینی نے ورنگ کی آبادی سے قطعاً انکار کیا ہے - آثارالبلاد میں یہ عبارت ہے '

لایصلح للنبات ولا للحیوان '	وہ (ورنگ) نباتات اور حیوان کے مناسب نہیں '

اگر ورنگ سے جزائر اور آبنائے کا قریبی حصہ مراد لیا جائے تو اِس عبارت کے دونوں ٹکڑے صحیح ہیں - جزائر میں نباتات نہ ہونے کے متعلق انسائکلو پیڈیا میں تصریح ہے کہ " جزیرے بے شجر ہیں " - حیوانات نہونا اِس سے ظاہر ہے کہ " انادر " (Anadir) " اور کوریاکس " (Koriaks) کا تمام ساحلی علاقہ آبادی سے خالی ہے -

(۳) بحر ورنگ کے رقبے میں تحفۂ شاہیہ اور انسائکلو پیڈیا میں جو اختلاف ہے ' اُس کے کئی سبب ہوسکتے ہیں '

اولاً — جغرافی حدود کا اختلاف - ہر زمانے میں سیاسی حالت کی وجہ سے جغرافی حدود بدلتے رہتے ہیں - پہلے بحر ورنگ ' بحر

شمالی کے اُس حصے کا نام تھا جو ملک ورنگ کے آس پاس یعنی موجودہ بیرنگ اسٹریٹ اورکمچاٹکا کے درمیان واقع ہے ؛ اور ایک طرف شمال میں بحر منجمد سے اور دوسری طرف مشرق میں بحرالکاہل سے مل جاتا ہے ' لیکن جب امریکا دریافت ہوا تو بحر ورنگ جزائر الیو شین (Aleutian I^s.) کے پاس سے ایشیا اور امریکا کے درمیان پھیلا دیا گیا- اِس طرح اُس کو جو وسعت میسر آئی وہ قدیم وسعت سے بہت زیادہ تھی -

ثانیاً — تحفۂ شاہیہ میں جو پیمائش لکھی گئی ہے وہ بیرونی کے نقشے کے مطابق ہے ' جس میں بحر ورنگ کی شکل ایک خلیج کی ہے جس کے ایک طرف ورنگ اور دوسری طرف صقالبہ و روس آباد تھے پس جو حصہ اِن آبادیوں کے بیچ میں پڑتا تھا اُس کو ایک فرضی خط کے ذریعے بحر شمالی سے الگ کر کے بحر ورنگ کہدیا گیا ' اور باقی حصوں کو بحر شمالی اور بحر شرقی میں داخل سمجھا گیا - اِس حصے کی اگر آج بھی پیمائش کی جائے تو عجب نہیں کہ وہی ہو جو تحفے میں ہے -

ثالثاً — مسلمان بحر ورنگ تک جس راستے سے بھی جاتے ہوں ' یہ ابھی تک ثابت نہیں ہے کہ جزائر الیوشین کے قریب پہنچ کر جو وسعت اِس سمندر کو ایشیا اور امریکا کے درمیان ملتی ہے ' وہ اُس سے واقف تھے - اس لیے تحفۂ شاہیہ میں اِس سمندر کے صرف اُسی حصے کی پیمائش درج ہے جو ایشیا سے متصل اور ملصق تھا - اور یہ حصہ اُس حصے سے بہت چھوٹا ہے جو امریکا کی طرف مانا گیا ہے - جدید نقشوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ سمندر نصفانصف ایشیا اور امریکا میں تقسیم نہیں ہوا ہے - بلکہ جزیرۂ سینٹ لارنس (St. Lawrence I.) سے اِدھر یعنی جنوب مغرب کا حصہ ایشیا میں ہے ' اور خود یہ جزیرہ مع آگے کے

جنوبی و مشرقی حصے کے امریکا میں ہے ' اِس طرح امریکا کی طرف کا حصہ بہت بڑا ہو گیا ہے '

رابعاً — ممکن ہے کہ قدیم پیمائش غلط ہو ' جس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آج کل کی پیمائش صحیح نہو - شمال کے سمندر اور خشکی کی پیمائش صحیح طور پر اب تک نہیں ہو سکی ہے ' البتہ مقامات کی تعیین اور آبادیوں کی جگہ صحیح دکھائی گئی ہے -

(۴) مستوفی نے جو یہ لکھا ہے کہ بحر ورنگ میں بہت سے دریا گرتے ہیں ' اِس کی بھی موجودہ جغرافیے سے تائید ہوتی ہے - لیکن چونکہ اُن میں کوئی بڑا اور قابل ذکر دریا نہیں ہے اس لیے ہم اُن کے نام قلم انداز کرتے ہیں -

تذکرۂ کتب

(اردو ادب کی رفتار ترقی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے نہ صرف یو پی، بلکہ کل ہندستان کی مطبوعات کے اعداد و شمار ضروری ہیں - لیکن دقت یہ ہے کہ صوبۂ سرحد اور بہار میں ویسے بالکل نہیں چھپتے- سی پی ، بمبئی ، مدراس اور سندھ میں اردو کتابیں بہت خال خال نکلتی ہیں - اب صرف پنجاب ، یو پی اور بنگال باقی رہ جاتے ہیں جہاں معقول تعداد میں اُن کے چھپنے کی امید کی جاسکتی ہے - اِس دفعہ پنجاب اور یوپی کی شائع شدہ اردو مطبوعات پیش کی جاتی ہیں - " مرتب ")

اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع سے دسمبر سنہ ۱۹۳۷ع تک -

پنجاب

میں افسانے پر سب سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں - اُس کے بعد شاعری پھر زبان پھر مذہب کا نمبر رہا -

اِن چیزوں کے بعد بہ ترتیب تاریخ و جغرافیہ ، ریاضیات ، سیاست ومتفرقات ، طب و سوانح ، ڈراما ، نیچرل سائنس کی کتابیں چھپیں - آرٹ ، قانون ، فلسفہ ، میکانک اور سفر نامے پر کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی -

اِن سب کتابوں کی تعداد (۲۲۵) اور فن وار تفصیل حسب ذیل ہے :—

سوانح	۲	ڈراما	۴
افسانہ	۵۴	تاریخ و جغرافیہ ...	۱۳

زبان	۳۹	طب	۲
متفرقات	۹	شاعری	۵۱
سیاست	۹	مذہب	۴۲
ریاضیات	۱۲	نیچرل سائنس وغیرہ ...	۳

ہندی مطبوعات بھی اِنہیں عنوانات پر چھپی ہیں جن کی تعداد (۶۵) ہے -

اِسی عرصے میں یو ' پی میں زبان پر سب سے

یو ' پی

زیادہ کتابیں چھپیں - اُس کے بعد شاعری پھر تاریخ و جغرافیہ اور ریاضیات و میکانک کا نمبر رہا - سوانح ' سیاست اور فلسفے پر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی - اِس سہ ماہی میں اگلی سہ ماہی سے زیادہ کتابیں چھپی ہیں -

علوم کے لحاظ سے کتابوں کی تفصیل یہ ہے :—

آرٹ	۲	متفرقات	۳
ڈراما	۱	شاعری	۱۴
افسانہ	۳	مذہب	۴
تاریخ و جغرافیہ ...	۹	ریاضیات و میکانک ...	۸
زبان	۲۳	نیچرل سائنس وغیرہ ...	۳
قانون	۵	سفر نامہ	۱
طب	۲		

اِن سب کتابوں کی تعداد (۷۹) ہے -

ہندی مطبوعات میں سیاست پر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی - بقیہ سب عنوانات' اور فلسفے میں نفسیات و اخلاقیات پر کتابیں اور رسالے چھپے ' جن کی مجموعی تعداد (۵۲۷) ہے -

دونوں صوبوں کی اردو مطبوعات یکجا طور پر درج ذیل هیں :—

"سوانح"

(۱) محبوب خدا :— از چودھری افضل حق - آنحضرت کی سوانح عمری - امرت الکٹرک پریس لاهور -

(۲) پیام محبت :— آنحضرت ' حضرت مسیح ' گرو نانک ' سوامی دیا نند وغیرہ مذہبی رهنماؤں کے مختصر قصے - طبع دوم - مرکنٹائل پریس لاهور -

"افسانے"

(۳) چغتائی کے افسانے ' حصۂ دوم :— از مرزا عظیم بیگ چغتائی - اتحاد پریس لاهور -

(۴) سیه کار اور دوسرے افسانے :— از ملک محمدباقر نسیم ' ایم اے - کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاهور -

" ڈراما "

(۵) شہزادی شب نور :— از خاں محبوب طرزی - ایک رومانی ناول - یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ -

(۶) سوتیا چاہ :— از جناب شوکت تھانوی - یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ -

(۷) بزبھس :— یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ -

" تاریخ و جغرافیه "

(۸) مقالات شبلی ' جلد ششم :— از علامۂ شبلی نعمانی - علامۂ مرحوم کے تاریخی مقالات کا حصۂ دوم - معارف پریس اعظم گڈھ -

(۹) قید یاغستان :— از جناب محمد اکرم ' میونسپل کمشنر لاهور - سنه ۱۰-۱۹۱۱ ع کے واقعات جو مصنف کو افغانستان کی قید میں پیش آئے - آر ' گیلانی الکٹرک پریس لاهور -

"زبان"

(۱۰) افسانہ :— از جناب احمد صدیق مجنوں گورکھپوری ' ایم اے - اردو کے مختصر قصوں پر تنقید - آسی پریس ' گورکھپور -

"طب"

(۱۱) کتاب العین :— از ڈاکٹر عطاءاللہ بٹ ' ایم ڈی ' بی ایس سی - آنکھ کے امراض اور علاج - ڈسٹرکٹ گزٹ پریس علی گڈھ -

(۱۲) خواص الادویہ :— از ڈاکٹر ایچ ' ڈی ' مکرجی - بریلی الکٹرک پریس بریلی -

"متفرقات"

(۱۳) فلسفۂ انسان 'حصۂ اول :— از جناب پرس رام - سوشیالوجی پر ایک کتاب - مفید عام پریس لاهور-

(۱۴) پریم شاستر :—از جناب رام رکھا مل - طبع هفتم - مرکنٹائل پریس لاهور —

"شاعری"

(۱۵) مہرشی درشن :— از منشی تلوک چند محروم ' بی اے — سوامی دیا نند اور آریہ سماج کي تعلیمات پر نظمیں - گیلانی الکٹرک پریس لاهور -

(۱۶) زادالآخرۃ :— از سید ذوالفقار علی - واقعات کربلا پر نظمیں - علمی پرنٹنگ پریس لاهور -

(۱۷) نغمۂ فردوس ' حصۂ اول :— از چودھری خوشی محمد "ناظر" بی اے - نیچرل نظموں کا مجموعہ - گیلانی الکٹرک پریس لاهور-

(۱۸) دیوان ثاقب :— از جناب ذاکر حسین ثاقب - نظامی پریس لکھنئو -

" سیاست "

(۱۹) مقالات ، مجلد اول :— از جناب عنایت اللہ خاں مشرقی - تحریک " خاکسار "اور ہفتہ وار " الاصلاح " میں چھپے ہوئے مضامین کا مجموعہ - آر ، حجازی پریس لاہور -

" مذہب "

(۲۰) کوکب دری فی فضائل علی :— از سید شریف حسین - مولانا سید محمد صالح کشفی کی عربی کتاب مناقب مرتضوی کا ترجمہ - ہندا الکٹرک پریس جالندھر -

(۲۱) قادیانی مذہب :— از پروفیسر الیاس برنی - قادیانی اصول و عقائد کی تنقید - طبع پنجم - عمدۃالمطابع برقی پریس لکھنو -

" سفر نامہ "

(۲۲) خوفناک دنیا ، افریقہ کے جنگلوں میں سفر اور شکار :— از محمد علی شاہ - مشرقی افریقہ کے سفر اور شکار کے حالات - برکات اکبر پریس الہ آباد -

---

تبصرے

بچوں کی کتابیں

[از جناب سورج نرائن ماتھر ، بی اے ، ال ٹی ، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ
نارمل اسکول، الہ آباد]

" مرغی اجمیر چلی " - جناب رقیہ ریحانہ نے اِس میں " مرغی
یر چلی " اور " جھوٹ " دو چھوٹی بڑی کہانیاں لکھی ہیں - پہلی
ی لمبی ہے اور دوسری بہت چھوٹی - دونوں بچوں کے لیے دل چسپ
- پہلی کا ڈراما بھی کرایا جاسکتا ہے - طرز بیان اور زبان دونوں سہل
- تصویریں متحرک ہیں ، جو بچوں کو پسند آئیں گی - اور اگر اُن
رنگ بھروا دیے جائیں تو بچے خوش ہونگے -

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یہ " پرانی بے معنی کہانی " کہلاتی ہے -
بتدائی درجے کے بچوں کا تلفظ درست کرانے کے لیے بنائی گئی تھی-
کہانی میں چھوٹے چھوٹے جملے بار بار دہرائے گئے ہیں - مشکل
وں کی ملاوٹیں دلکش پیرائے میں پیش کی گئی ہیں - جملوں
پہچان کے بعد الفاظ کی پہچان اور الفاظ میں آوازوں اور اُن کے
ف کی پہچان کرائی گئی ہے - جانوروں کی آوازوں کو بار بار ادا کرنے
بچوں کا لب و لہجہ درست ہوتا ہے - آوازوں اور حروف کے پہچاننے
پڑھنے لکھنے کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہے - کہانی کا مکالمہ اور ڈراما
سے لڑکوں میں گفتگو کرنے اور سمجھ کر پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا
اُن میں چستی ، چالاکی، دلیری اور بیباکی نمایاں ہوجاتی ہے -

اِس کہانی میں اُن خوب‌صورت اور دل‌کش جملوں کی تکرار نہیں پائی جاتی جو اصل میں عمداً رکھی گئی تھی - کرداروں کے ناموں میں صرف دو آوازیں یعنی ' ک ' ق ' غالب ہیں - مثلاً کت - کت - کتاک - ککڑوں کوں - کری کا کا - بی قیں قیں - لیکن اِن کے مقابلے میں ھیلی پھلی - کوکی لوکی - ڈکی ڈیڈل اور گوزی پوزی میں گونا گوں آوازوں کا دل چسپ تسلسل بھی نظر انداز کرنے قابل نہ تھا - چند رنگین تصویریں بھی ہونی چاھیے تھیں- قیمت ۲ آنہ -

" نیت کا پھل "

مرزا مظفر حسین بیگ سیفی دھلوی نے اِس کو مرتب کیا ھے - ٹائیٹل پیج کی تصویر کہانی کا سچا مرقع ھے - " نیت کا پھل " " بکری دو کانو کھا گئی " اور " چھپر پھاڑکر دے گا تو لوں گا " جرأت افزا ' جرأت‌آزما اور دلفریب عنوان ھیں - اور کہانی شروع سے آخر تک اِن کی بدولت جاذب توجہ ہو گئی ھے -

درجہ سوم اور چہارم کے لڑکے پڑھیں گے تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ کالی نانی ابھی بقید حیات ھیں - تمباکو کا بٹوا سنبھالے ' پان کا ٹکڑا منہ میں رکھے ' کہانی سنانے آموجود ہوئی ھیں - الفاظ کا انتخاب ' فقروں کی چستی ' محاورات کی بندش خوب ھے - زبان اور طرز بیان میں کہیں لغزش نہیں آئی ھے - کہانی کے پیراگرافوں کی تقسیم نفاست سے کی گئی ھے -

ٹائیٹل کے سوا تصویر کا کہیں نام نہیں - یہ بڑی کمی ھے - خیالات کو ذہن‌نشین کرنے کے لیے تصاویر کی ضرورت تھی - قیمت ۴ آنہ -

"چھدو اور دوسری کہانیاں"

از رقیہ ریحانہ و دیگر حضرات - اِس کتاب میں ۶۴ صفحے ھیں

"چھدو" کی کہانی ۱۷ صفحوں میں ختم ہوئی ہے - "باچھو" کی کہانی ۱۹ صفحے کی ہے- "آخری قدم" نے ۲۱ صفحے لیے ہیں- اور "پان کو" ۹ صفحوں کی کہانی ہے - "چھدو" اور "باچھو" بچوں کے منھولے ہیں - خیالی سیر و سیاحت کی فطرت اوائل عمر ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے - "سبحکنگھو" بچے چپ چاپ اِنہیں خیالات میں بنت بلے کھیلتے رہتے ہیں - اُنہیں دنیا اور مافیہا کا ہوش ہی نہیں ہوتا - مصنفہ اِنہیں خیالات کو زنجیر میں باندھ کر بچوں کے سامنے لے آئی ہے - اُن کو پا بہ زنجیر دیکھ کر اور کہانیوں کو سن کر بچوں کے دلوں کے کنول کھل جائیں گے - کہانی کہنے کا طرز ' بیان کی روانی ' تصورات کی دل کشی ' قابل تعریف ہے - البتہ تصویروں نے ساتھ نہیں دیا ہے - "آخری قدم" میں بچوں پر اِتنی مشکلیں پڑی ہیں کہ آسان نہیں ہوئیں - یہ دور از فہم تجربات عمر بھر کی کشاکش کے بعد اُن کی سمجھ میں آئیں گے - بچوں کو موجودہ زمانے کی خوشی پسند آئے گی نہ کہ آخری مسرت - "پان کو" کی تمہید لمبی ہے - دنیا کی پیدائش کا خیال اِسی قسم کے دوسرے خیالات کے مقابلے میں دل چسپ معلوم ہوتا ہے ورنہ نہیں - بچوں میں اِتنی سوجھ بوجھ کہاں کہ وہ اپنے خیالات سے ' مقابلہ اور موازنہ کر کے ' لطف اندوز ہو سکیں - یہ تو بالغوں کا کام ہے - آخری دونوں کہانیاں مشکل ہیں کیا زبان کے لحاظ سے اور کیا مضمون کے لحاظ سے - قیمت ۳ آنہ -

"بچوں کی کہانیاں"

از عبدالواحد صاحب سندھی - اِس کتاب میں چار کہانیاں ہیں - پہلی کہانی چڑیا ' طوطے اور کوے کی ہے - اِن پرندوں سے بچے آشنا ہیں - مگر اِن کی کہانی میں اُن کا دل کوئی نئی بات ڈھونڈھتا

چاہئیے جو اس کہانی میں موجود نہیں - جملے آسان ، فقرے درست ، الفاظ منتخب ، طرز بیان بچوں کے لائق مگر مضمون ندارد ، اختتام بے اثر اور مدعائے تعلیم غائب ! دوسری راج ہانس کی کہانی ہے - بچے راج ہنس اور اس کی عادات سے ناواقف ہیں - یہ کہانی ہے یا خبر ؟ جذبات کی مصوری کے بجائے واقعات نگاری کی گئی ہے - تیسری کہانی " چڑیا اور طوطے کی آئینے کے سامنے حیرت " کا واقعہ ہے - بچوں کو اصل کی نقل سالنے میں مزہ نہ آئے گا - چوتھی کہانی " آصفہ کا طوطا " ہے - آج کل طوطے پالنے کا رواج بہت کم ہوگیا ہے - بہت کم بچوں کو طوطوں کی بولیاں سننے کا موقع ملتا ہے - اس قسم کے تجربات کے بیان کا مزہ انہیں بچوں کو حاصل ہوسکتا ہے جنہوں نے اپنے گھروں میں طوطوں کے پڑھانے کے حالات دیکھے ہوں -

آسان جملے ، مانوس ماحول ، معلوم الفاظ سے ، پڑھنے میں روانی پیدا ہوگی - بیان کی مصوری سے جی خوش ہو گا - کتابت کی صفائی ، جلی قلم کی لکھائی اور اچھی چھپائی بچوں کو پسند آئے گی - تصاویر عموماً صاف اور روشن ہیں - قیمت ۲ آنہ -

" ننھی مرغابی "

از عبدالواحد صاحب سندھی - یہ تین کہانیوں کا مجموعہ ہے - اس میں پہلی کہانی " فے بل " ہے - دوسری " ریڈ رائیڈنگ ھڈ " کے طرز کی ایلیگری (تمثیل) ہے اور تیسری مزاحیہ - پہلی کہانی (میاں مٹھو کی ہوشیاری) میں جملے لمبے لمبے ہیں ، جو بھرتی کے فقروں کی وجہ سے بوجھل ہیں - مثلاً " ارے یارو بتاؤ تو " - " معلوم ہوتا ہے " - " بی بکری اور اے میاں بندر " وغیرہ - یہ نہ تو دل چسپ ہیں اور نہ مفید - مصنف بچوں کی بولی اور اُن کی دل چسپیوں سے کچھ ناآشنا سے معلوم ہوتے ہیں - کہانی کا انجام بھی بے اثر ہے - اس کا توازن بھی

بھدا معلوم ہو گا - دوسری کہانی کی زبان سجل ہے - جملے چھوٹے چھوٹے پیرایہ قدرتی ، مضمون دلکش اور انجام پر اثر - توانا کرانے کے لائق ہے - تیسری کہانی نہایت بے ڈھنگی ، اور دور از فہم ہے - نتیجہ مذاقیہ ہے جو بوڑھوں کے بھی مشکل سے سمجھ میں آئے گا - بچے تو اُس پر کیا خاک ہنسیں گے - اِس کتاب کی تصویریں دلکش ہیں، لیکن زبان ناہموار ہے - قیمت ۲ آنہ -

" چھوٹا چوہو "

از محمد حسین حسان ، اِس میں ایک نافرمانبردار چوہے کے بچے کی کہانی ہے - نافرمانبرداری کا انجام ، اور اپنی حرکتوں پر پشیمانی ۴۹ صفحے پڑھنے کے بعد خدا معلوم بچوں پر کہاں تک اثر کرے گی ؟ ماشاء اللہ ، ہنسوڑ ، مشغلہ ، فارغ ، مذاقیہ ، خالہ ، تسبیح ، اسپرنگ ، بوڑی ، غم گین ، بے اختیار ، قیدی ، آزادی ، قلق ، داستان ، حماقت ، وغیرہ مشکل الفاظ ہیں - اِن میں چند ایسے ہیں جن کے آسان اُردو مترادف ملنے مشکل نہ تھے - درجۂ اول و دوم کے بچوں کے لیے اِن کا استعمال غیر ضروری ہے -

اِس کہانی میں تعلیمی اصول بہت کم پیش نظر ہیں - تصویریں بھی خراب ہیں - صاف صاف دکھائی نہیں دیتیں - بچوں کی کتابوں میں چند رنگین تصویریں بھی ہونی چاہئیں - اِن تصویروں میں بچے رنگ بھی نہیں بھر سکتے - لکھائی بری ، حاشیہ لاحاصل ، الفاظ ننھے ننھے - تصویروں کے گرد مضمون ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کی دقت بڑھ گئی ہے - قیمت ۲ آنہ -

" دنیا کے بچے "

از محمد حسین حسان (جامعی) - اِس کتاب میں جغرافیائی

کہانیاں ہیں - افریقہ کی ایک کہانی ہے - امریکا کی بھی ایک کہانی ہے - یورپ کی قسمت میں نو کہانیاں آئی ہیں اور ایشیا کے حصے میں صرف تین -

کہانیوں کے پس پشت کوئی اصول معلوم نہیں ہوتا - نہ تو خطوں کا لحاظ رکھا ہے ، نہ براعظموں کی عظمت کا ، اور نہ مانوس و نامانوس کا - ہندی کا رسالہ " بال سنسار " میرے سامنے ہے - یہ " دنیا کے بچے " سے دوگنی ضخامت کا ہے - اِس میں بھارت ورش کی تیس کہانیاں ہیں اور ایشیا کی چار - چند عنوان نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں :—
پنجاب کا دھیان سنگھ ، نیپال کا جنگ بہادر ، بنگال کا انیل بوس وغیرہ -آخر کوئی تو جغرافیے کا اصول پیش نظر ہے - گھر سے قدم اُٹھا ہے پھر ہندوستان سے نکل کر ایشیا میں پڑا ہے -

کتاب کی تمہید کے کچھ حصے بچوں کے لیے مشکل ہیں- کہانیوں میں انشا پردازی کے اصولوں کا خیال اکثر کم رکھا ہے - پیراگرافوں کا تسلسل کہیں کہیں ٹھیک نہیں - صفحت کے فقروں سے ترجمے کا رنگ جھلکتا ہے- اکثر خیالات پیچیدہ ، تصورات تاریک اور تفصیلات پھیکے ہیں - اِن میں جان ڈالنے کے لیے اشکال اور تشریحِ عملی کی ضرورت باقی ہے -

جغرافیے کی بنیاد قائم کرنے کے لیے کہانیوں کا چلن ہو گیا ہے جو درجۂ دوم کے طلبا کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہیں - اس لیے اِن کہانیوں میں غیر ملکوں کے لوگوں کے رہنے سہنے ، غذا ، کوڑے ، رسم و رواج ، نباتات و حیوانات ، اخلاق و آداب کے تصورات پیدا کرنے کے لیے آسان تشبیہات ، مقابلہ و موازنہ ، شکلوں اور تصویروں کی ضرورت ہوتی ہے - اِن کے بغیر بچے تعلیمی مفاد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے - اردو میں اِس کتاب سے بہتر کتابیں موجود ہیں اور نصاب تعلیم میں داخل ہیں - قیمت ۲ آنہ -

"کائنات"

از محمود علی خاں جامعی - اجرام فلکی کا تصور کرانا آسان کام نہیں - بغیر تجربات اور مشاہدات کے ایسی باتیں ذہن نشین نہیں ہو سکتیں - مصنف نے آسان تشبیہوں کے ذریعے اِس مشکل کو حل کیا ہے - موسموں کی تبدیلی ' بدر و ہلال ' سورج اور چاند گہن ' طوفان ' نظام فلکی ' سیارے اور دمدار تارے ' قطب ستارے کی پہچان ' برجوں کا حال ' کہکشاں ' موسموں کے لحاظ سے آسمان میں ستاروں کے نقشے ' بڑے دل چسپ مضمون ہیں - مگر یہ نقشوں اور آلات کی مدد سے بھی ہائی اسکول کے طلبہ کی سمجھ میں بہ مشکل آتے ہیں - صرف سمجھ دار بالغ ہی آسمان کے مشاہدے سے اِن کی نسبت کچھ قیاس کر سکتا ہے -

یہ کتاب اُن پڑھے لکھے نوجوانوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہوگی ' جنھیں جغرافیے اور سائنس کے مضامین مدرسوں میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا - اِس سے اُن کے دل میں علم نجوم اور ہیئت کے مطالعے کا شوق پیدا ہوگا - کہیں کہیں تجربات اور آلات کا ذکر بھی کردیا جاتا اور اُن کے اشکال سمجھا دیے جاتے تو تصورات میں صفائی پیدا ہوجاتی - برجوں کے نام اور دیگر اصطلاحات انگریزی میں حاشیے پر درج کیے جاتے تو تلفظ میں آسانی ہوجاتی - قیمت ۵ آنہ -

صیغۂ تعلیمات کے مقررہ نرخ سے ہر کتاب کی قیمت زیادہ ہے !

یہ سب کتابیں جامعہ ملیہ اسلامیہ ' قرول باغ دہلی سے ملتی ہیں -

---

چند کتابیں اور رسالے

[از اڈیٹر]

سراج سخن :— ملنے کا پتا : مکتبۂ ابراھیمیہ ' حیدرآباد دکن - قیمت ۱۲ آنہ -

دکن کے اھل قلم کی وہ جماعت جس کے پیشرو یقیناً مولوی عبدالحق صاحب ھیں ' تمام ملک کے شکریہ کی مستحق ھے کہ اُس نے قدیم اساتذہ کے دواوین ' تصنیفات اور تذکرے چھاپ چھاپ کر وقف عام کردیے ھیں ' اور اِس طرح اِن ادبی جوھر پاروں کو زمانے کی دست برد سے بچا لیا ھے - " سراج اورنگ‌آبادی " دکن کے اُن چار شاعروں میں ھیں جنکا کلام میر تقی " میر " کو بے ربط نہیں معلوم ھوتا - اُنھوں نے یہ بھی لکھا ھے کہ سراج کا کلام مزے سے خالی نہیں ھے - اِس سے بہر حال سراج کی استادی مسلم ھوجاتی ھے ! ھماری زبان کے مایۂ ناز انشاپرداز ' مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے اِس رسالے میں اُن کا کلام منتخب کر کے چھاپا ھے ' جو بہت بڑی ادبی خدمت ھے - اُمید ھے کہ تمام علمی اور ادبی حلقوں میں اِس خدمت کا عملی اعتراف کیا جائےگا - مقدمے میں کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ھیں مثلاً مشائخین' برادر طریقی ' وغیرہ - طبع ثانی میں اِن کو درست ھونا چاھیے -

سب رس (ماھانہ) :— ملنے کا پتا : رفعت منزل ' خیریت آباد حیدرآباد ' دکن - سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے -

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ' ایم- اے ' پی ایچ ڈی (لنڈن) کی نگرانی میں یہ رسالہ نکلنا شروع ھوا ھے - اِس زمانے میں جب کہ مستقبل کی شاھراہ ادب اور انسانیت کی ھم‌آھنگی کے اندر تلاش کی جارھی ھے ' " سب رس " کے ذریعے ایسا ادب پیش کرنا جس سے

انسانوں کو پہچاننے اور سماج کی نبض پر هاتھ رکھنے کا ولولہ پیدا هو ' بلا شبہہ ایسا بلند مطمح نظر هے جس سے اُمید هے کہ ایک طرف سماج کی ترقی میں مدد ملے گی ' اور دوسری طرف انسانیت کے همدم اور غمگسار ادیب پیدا هوں گے - رسالہ اپنے قابل مدیر کی نگرانی میں اِس مقصد میں خاصا کامیاب هے - ڈاکٹر زور اسم بامسمی هیں - وہ ایسا رسالہ نکال رهے هیں جو "سب رس" هے ! اور شائد یہی اُس کی وجہ تسمیہ بھی هے !

رسید کتب و رسائل

شرح مجھدی منظوم — از مولوی محمد سلمان احمد هلالی ' بی اے ' ایل ایل بی - عثمانی پریس' بدایوں ' قیمت درج نہیں -

اسلام اور موجودہ مدنی مسائل — از مولوی حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری - جامعہ برقی پریس ' دهلی - قیمت ۸ آنہ -

جامع التاریخ — از جناب اظہر آلہ آبادی - تاج پریس ' چھتہ بازار ' حیدرآباد دکن - قیمت درج نہیں -

پیام تعلیم (سالگرہ نمبر) — جامعۂ ملیۂ اسلامیہ ' دهلی - قیمت ۱۲ آنہ -

علی گڈہ میگزین (تعطیلات نمبر) — مسلم یونیورسٹی علی‌گڈھ - قیمت درج نہیں -

ادب لطیف (سالنامہ) - لاهور — قیمت ایک روپیہ -

اداریہ

ہندستانی

[از جناب صدر ادارہ]

" ہندستانی " لفظ کا استعمال اُس زبان کے لیے جسے ہندستان کے باشندے زمانۂ متوسط میں بولتے تھے اور جس کے ذریعے آپس میں خیالات کا تبادلہ کرتے تھے کب سے شروع ہوا ' ابھی تک قطعی طور پر معلوم نہیں – آج کل کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستانی' اردو کا مترادف ہے ؛ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا - اُردو اور ہندی دونوں ہی کے معنوں میں ہندستانی مستعمل تھا - ہندستانی سے وہ زبان مراد تھی جو عربی اور فارسی کے علاوہ استعمال میں آتی تھی اور جسے ہندو اور مسلمان دونوں سمجھتے تھے -

اِس سوال پر اہل یورپ کے مراسلات کچھ روشنی ڈالتے ہیں - اُن میں سب سے پہلے پرتگیز ہندستان میں آئے اور اُنھوں نے مغربی ساحل پر کوٹھیاں بنائیں اور مقبوضات حاصل کیں - " گوا " اُن کا مرکز تھا جہاں پرتگیز گورنر رہتا تھا - حکومت کے سلسلے کے ساتھ مذہبی اور تبلیغی کاروائی بھی شروع ہوئی اور رومن کیتھلک پادری اور سوسائٹی اوف جیسس (Society of Jesus) کے راہب بھی آنے لگے - سولھویں صدی میں اکبر نے حقیقت کی تلاش میں مختلف مذہبوں کے نمائندوں کو دعوت دی اور اُس کے دربار میں عیسائی پادری اور راہب گوا سے حاضر ہوئے - اُن کے خطوط اور تحریریں پرتگال کے کتب خانوں میں محفوظ

ہیں - ہندستان کی تاریخ کے متعلق اُن سے بہت سی ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں - چنانچہ ہندستانی زبان کا تذکرہ بھی اکثر خطوط میں ملتا ہے - اُن کے علاوہ یورپ کے ملکوں سے ہندستان میں سیاح ' تجار ' سفیر ' وغیرہ اِسی زمانے سے آنے لگے اور اُنہوں نے بھی یہاں کے حالات کا تذکرہ کیا ہے -

اُن کے بیانوں سے ذیل میں اقتباس دیے جاتے ہیں جو دل‌چسپی سے خالی نہیں ہیں -

سنہ ۱۵۸۲ ع میں پادری ایکوا ویوا (Aqua Viva) نے ایک خط پادری روئی وین‌سینٹ (Ruy Vincente) کے نام لکھا - روئی وین سینٹ گوا میں رہتا تھا اور اِس صوبے کا صدر (پرانونشل) تھا - اِس خط میں ایکوا ویوا نے یہ تجویز کی کہ گوا میں ایک مدرسہ قائم ہونا چاہیے جس میں مسلمانوں کے لیے فارسی اور دیگر مذہب والوں کے لیے ہندستانی کی تعلیم ہو - ظاہر ہے کہ ہندستانی سے مدعا وہ زبان ہے جو ہندو بولتے تھے - ایکوا ویوا کے بارے میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب وہ اپنے ترجمان ڈومنگو پیریز (Domingo Pires) کا ایک ہندستانی عورت کے ساتھ نکاح پڑھا رہا تھا تو اُسے فارسی زبان استعمال کرنی پڑی اور اکبر بادشاہ جو وہاں موجود تھا فارسی کے فقروں کا ہندستانی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا -

سنہ ۱۵۹۸ ع میں جیروم زیویر (Jerome Xavier) نے لاہور سے ایک مراسلہ سوسائٹی اوف‌جیسس(Society of Jesus)کےصدر اعلی(General) کے نام بھیجا جس میں یہ فقرہ ملتا ہے " کچھ نوجوانوں نے فارسی زبان میں جس میں کہیں کہیں ہندستانی (Industani) ضرب‌المثلیں کھپائی گئی ہیں ایک مناظرہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بارے میں منعقد کیا " -

سنہ ۱۶۰۴ ع میں اِسی جیروم زیویر نے آگرے سے ایک خط میں پادری کورسی (Corsi) کے بارے میں لکھا - " اُس نے فارسی زبان سیکھ لی ہے اور ہندستانی کا سیکھنا شروع کردیا ہے جو اِس ملک کی زبان ہے - اُس کی تحصیل علم کی قابلیت اور خواہش اِس درجہ ہے کہ وہ جلد عربی پر بھی عبور حاصل کر لے گا " -

اکبر کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد پادری انٹنی بوتلہو (Antony Botelho) جو صوبے کا صدر تھا ' بیجا پور کے عادل شاہی سلطان کے ساتھ اپنی گفتگو کا بیان لکھتا ہے اور سلطان کا یہ سوال اُسی کی زبان میں تحریر کرتا ہے - " سچ ہے کہ بڑا بادشاہ اکبر کرستان ہوا کہ ناں ؟ " (Sachehe qui barà Batxa Hacabar Christân muhâ qui nan ?)

سنہ ۱۶۱۵ ع کے ۱۰ ویں اپریل کے خط میں دے کاسٹرو (De Castro) لکھتا ہے کہ آگرے کے پادری ' عیسائیوں سے ہندستانی زبان (Industan) میں گناہوں کا اعتراف کراتے تھے -

ٹیری (Terry) نے سنہ ۱۶۱۶ ع کے واقعات میں لکھا ہے کہ " ٹوم کوریات (Tom Coryate) نے اِس کے بعد ہندستانی (Indostan) پر یعنی عوام کی زبان پر بڑی قدرت حاصل کر لی - ایک عورت جو شاہی سفیر کے ہاں دھوبن (Landress) تھی [۱] اِس قدر آزادہ‌رو اور زبان دراز تھی کہ صبح سے شام تک لوگوں کو جھڑکتی ' پھٹکارتی اور بدلاتی رہتی تھی - ایک روز کوریات نے اُسی کی زبان میں اُسے آڑے ہاتھوں لیا - اور آٹھ بجے تک اُس کی ایسی خبر لی کہ بیچاری دم بخود ہوگئی اور پھر ایک لفظ زبان سے نہ نکال سکی " - ٹیری اِس زبان کے متعلق یہ بھی خبر دیتا ہے کہ یہ بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی ہے -

---

[۱]—یہ laundress کی قدیم شکل ہے - [ادارہ] -

سنہ ۱۶۳۲ ع میں یہ فقرہ ملتا ہے - " پادری سائمن دے فگیوریڈو (Simon de Figeiredo) ہندستانی زبان جانتا ہے " - یہ فقرہ پادری بے سے (Besse) کی اُس فہرست سے لیا گیا ہے جو اُس نے صوبۂ ملا بار کے پادریوں کی جدولوں سے تیار کی ہے -

سنہ ۱۶۵۰ ع میں پادری کیشی (Ceschi) اطلاع دیتا ہے کہ اُس نے مشکل ہندستانی (Industani) زبان کو سیکھا ہے -

سنہ ۱۶۷۳ ع میں فرائر (Fryer) لکھتا ہے - " دربار کی زبان فارسی ہے اور عوام میں جو بولی رائج ہے وہ ہندستانی (Indostan) ہے -

سنہ ۱۶۷۷ میں ایک خط انگلستان سے کمپنی کے ڈائرکٹروں نے فورٹ سینٹ جارج بھیجا - اُس میں اِس اعلان کا اعادہ ہے " جو شخص ہندوؤں (Gentoo) کی زبان یعنی ہندستانی (Indostan) میں قابلیت دکھلائیگا اُسے بیس پونڈ انعام دیا جائیگا " -

هیجیز (Hodges) اپنے روزنامچے میں ۹ مارچ سنہ ۱۶۸۵ کی تاریخ میں تحریر کرتا ہے - " میں نے ایک پرتگیز ملاح کے ساتھ جو ہندستانی (Indostan) بولتا تھا یعنی وہ زبان جو اِن جزائر کی بولی ہے ، مہارت حاصل کی - "

والین تین (Valentijn) سنہ ۱۶۹۷ ع میں ہندوستانی زبان (Hindoestanze taal) کا ذکر کرتا ہے - اور لکھتا ہے کہ ملک حبش (Abyssinia) کا ایلچی اِس زبان میں گفتگو کرتا تھا اور تھیوپیا کے گورنر کا سکریٹری اُس کی ترجمانی کرتا تھا -

یہی والن تین سنہ ۱۷۲۶ع میں لکھتا ہے " یہاں کی زبان ہندستانی یعنی مور (Moor) ہے - گو جو عربی فارسی سے ناواقف ہیں وہ جاہل مطلق سمجھے جاتے ہیں - "

ہوملٹن سنہ ۱۷۲۷ع کے واقعات کے متعلق بیان کرتا ہے - " یہ ایرانی اور میں اپنے معاملات کے بارے میں ہندستانی (Indostan) زبان میں گفتگو کررہے تھے- یہ مغلوں کی وسیع سلطنت میں مروجہ زبان ہے - "

گارساں دے تاسی نے اپنے تذکرے میں بنجامن شولز (Benjamin Schulz) کی ہندستانی صرف و نحو (Grammatica Hindostanica) کا ذکر کیا ہے جو سنہ ۱۷۴۵ع میں تیار ہوئی تھی -

اورم (Orme) جو اٹھارویں صدی کی برطانوی مہموں اور فتحوں کا مورخ ہے سنہ ۱۷۶۳ع میں لکھتا ہے "پانڈیچری کے دو کونسلی کیمپ میں گئے - اُن میں سے ایک اچھی طرح ہندستانی (Indostan) اور فارسی جانتا ہے - کیوں‌کہ مسلمان سلطانوں کے دربار میں یہی دونوں زبانیں مستعمل ہیں - "

سنہ ۱۷۷۸ ع میں اٹلی کے دارالخلافۃ روم میں ہندستانی صرف و نحو (Grammatica Indostana) کے طبع ہونے کا حال ملتا ہے -

ژاک موں (Jacquemont) کے مراسلات میں جو سنہ ۱۸۳۰ ع کے لکھے ہوئے ہیں یہ تحریر ملتی ہے - " یہ عوام کی بولی ہندستانی (Hindoustani) جو یورپ واپس جانے پر میرے کسی کام نہ آئے گی مشکل ہے " -

سرچالس نیپیر (Sir Charles Napier) ۱۲ فروری سنہ ۱۸۴۴ ع میں کراچی سے رقم‌طراز ہیں " افسوس ہے کہ گورنر نہ ہندستانی (Hindoostanee) نہ فارسی نہ مرہٹی اور نہ کسی اور مشرقی زبان سے واقف ہے - اس لیے وہ کلکٹروں ، اُن کے نائبوں ، اُن افسروں سے جو فوجی عدالتوں کی کارروائیاں تحریر کرتے ہیں اور دیگر فوجی عمال سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے مراسلے انگریزی زبان میں اِس طرح تحریر

کریں کہ اُن میں اجنبی زبانوں کے الفاظ جہاں تک ممکن ہو کم ہوں- بجائے اِس کے کہ وہ حسبِ معمول اپنی وہ زبان استعمال کریں جو اِس قسم کی ہندستانی ہے جس میں کہیں کہیں انگریزی لفظ بھی آگئے ہیں " -

(ماخوذ از جرنل رایل سوسائٹی اوف بنگال سنہ ۱۸۹۶ ع

ہابسن جابسن)

ہندستانی اکیڈیمی کی چھٹی کانفرنس

[از اڈیٹر]

امسال اکیڈیمی کی چھٹی سالانہ ادبی کانفرنس ۱۹ ' ۲۰ مارچ کو سنیچر اور اتوار کے دن الہ آباد میں منعقد ہوئی - وقت کے حالات اور حالات کی نزاکت کے باعث اگرچہ امید کے مطابق مجمع نہ تھا ' تاہم باہر سے تشریف لانے والے ' نیز مقامی حضرات نے جو دل چسپی ظاہر فرمائی وہ ہماری امید سے زیادہ تھی - اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ علم و ادب کا ذوق مصائب کی ہولناکیوں سے کس قدر بےپروا ہے ! میور کالج کا " وجیا نگرم ہال " جو اجلاس کا مقام تھا ' بہت سے مشاہیر علم و ادب کی موجودگی پر ناز کر رہا تھا !

علامۂ سید سلیمان ندوی ' مولوی عبدالحق صاحب بی اے ' مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعرالہند ' سر لیاقت علی وزیر ریاست بھوپال ' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی ' ڈاکٹر تارا چند جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی ' پنڈت امر ناتھ جھا صدر شعبۂ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی ' پرنسپل ہیرا لال کھنّا ' پنڈت منوہر لال زتشی ' مسٹر عبدالماجد دریابادی ' مسٹر رشید احمد صدیقی ' مولوی ضیاءالحسن علوی ' مولوی محمد حلیم ردولوی ' ڈاکٹر زبید احمد ' ڈاکٹر محمد حفیظ سید ' ڈاکٹر سعیدالحسن اور مولانا سید اسحاق علی وغیرہ اِس اجلاس میں رونق افروز تھے -

یونیورسٹیوں کے نمائندوں میں ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا الہ آباد یونیورسٹی سے ' مسٹر دین دیال گپتا لکھنئو یونیورسٹی سے ' ڈاکٹر ایشوری پرشاد آگرہ یونیورسٹی سے ' اور مسٹر آل احمد سرور علی گڈھ یونیورسٹی سے ' تشریف لائے تھے - کلکتہ یونیورسٹی کا بھی ایک برقی پیغام آیا تھا - کان پور کے ڈی اے وی کالج کی طرف سے ٹھاکر جے دیو سنگھ اور پنڈت هری هر ناتھ هکو شریک تھے - اُدے پرتاپ کالج بنارس نے ٹھاکر مارکنڈے سنگھ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا -

۱۹ - مارچ کی شام کو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے صدر منتخب ' اکیڈیمی کے صدر مستقل ' رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ تشریف لائے ' اور کانفرنس کا افتتاح فرمایا - یہ دوسرا موقع تھا کہ اکیڈیمی کی سالانہ کانفرنس کو آپ کی صدارت کا اعزاز حاصل هوا - پہلی کانفرنس بھی موصوف هی کی صدارت میں منعقد هوئی تھی -

آپ کی فصیح و بلیغ اردو تقریر ' صدر استقبالیہ اور صدر کانفرنس دونوں کی حیثیتوں لیے هوئے تھی - سب سے پہلے اکیڈیمی کے طریقۂ کار پر آپ نے روشنی ڈالی -

معترضین کے اِس اعتراض کا کہ "هندستانی اکیڈیمی نے کم کام کیا هے" - جواب دیتے هوئے آپ نے " فرنچ اکیڈیمی " کی بے پایاں دولت و ثروت ' وسیع سلسلۂ عمارات ' اور شاندار کتب خانوں کا تذکرہ فرمایا - اُس کی عزت و وقعت بیان کرتے هوئے آپ نے بتلایا کہ اُس میں اعلیٰ درجے کے لکھنے والوں کو بھی مشکل سے جگہہ ملتی تھی - چنانچہ " اناطول فرانس " چالیس سال کی مشاقی اور شہرت کے بعد کہیں اُس کا ممبر بن سکا تھا ! بخلاف اِس کے هندستانی اکیڈیمی محض نام میں اُس کی شریک هے ! اور چیزوں

میں اُس سے کوئی نسبت نہیں رکھتی! اِس کا سرمایہ محض حکومت کی امداد ھے - اِس کے پاس اپنی عمارت تک نہیں ھے - اِس کا کتب خانہ بڑا نہیں - اِس کی ممبری بہت آسان ھے! حکومت کا مختصر سا عطیہ اب پہلے کی بہ نسبت آدھا رہ گیا ھے- پبلک سے اکیڈیمی کو کوئی امدادی رقم نہیں ملی ھے - اِن حالات میں جتنا کام کیا گیا وہ بہت کچھ قابل تعریف ھے!

اِسی سلسلے میں آپ نے دوسری بات یہ بتلائی کہ کام کی کمّیت کے بجائے اُس کی کیفیت پر نظر کرنی چاھیے! ایک ذھنی ماحول کی پیدائش اور اعلیٰ ادبیات کی نشوونما بڑا وقت چاھتی ھے - اکیڈیمی کی عمر بہت ھی مختصر ھے! اِتنی سی عمر میں کوئی آئیڈیل فضا پیدا نہیں ھو سکتی! آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اکیڈیمی کی تصنیفات کا مقصد جلب منفعت یا مادی فوائد کا حصول نہیں ھونا چاھیے! ایسے کام محض علم و ادب کی سر پرستی اور ترقی کے لیے ھوتے ھیں!

اِس کے بعد آپ نے اکیڈیمی کے آئندہ طریقۂ کار کی وضاحت فرمائی -

" اردو ھندی " کے مسئلے پر آپ نے فرمایا کہ دونوں زبانوں کی جداگانہ ترقی ھی عملاً درست معلوم ھوتی ھے ' کیوں کہ اب دونوں زبانوں کو ملا کر ایک کرنا غیر ممکن ھے! متحدہ زبان یعنی " ھندستانی " کا خیال سو برس پہلے کی بات ھے -

اردو طرز تحریر پر رائے ظاھر کرتے ھوئے آپ نے مولوی عبدالحق صاحب کے طرز کی مدح فرمائی - اِسی ضمن میں اور دو چار رسالوں کا بھی آپ نے نام لیا - بعض رسالے ایسے بھی بتائے جن کی زبان اور طرز تحریر سے آپ کو اختلاف ھے - آپ نے فرمایا کہ زبان میں اردو اور ھندی

الفاظ کا فی صدی حساب لگانا ایک بیکار سی چیز ہے - آپ نے سادہ طرز تحریر پر زور دیا مگر اُسی حدتک کہ انشا پردازی کی خوبیاں باقی رہیں !

خطبۂ صدارت کے بعد ، شعبۂ ہندی کے صدر راؤراجا راے بہادر ڈاکٹر شیام بہاری مسرا ، ایم اے ، ڈی لٹ نے اپنا خطبہ ارشاد فرمایا - یہ بھی زبانی تھا - اور نہایت پرلطف اور دل چسپ تھا - اردو ہندی کے قضیے میں آپ نے بھی وہی راے ظاہر کی جو محترم صدر کانفرنس ظاہر فرما چکے تھے - آپ نے بتایا کہ اردو اور ہندی زبانیں در اصل ایک تھیں، پھر یہ کیوں علحدہ ہو گئیں ؟ اِس کا سبب زیادہ تر سیاسی اور معاشرتی ہے ! ادبی نہیں ! آپ نے خواہش ظاہر کی کہ جو خلیج دونوں کے درمیان پیدا ہو گیا ہے اُس کو پاٹ دیا جائے ، اور بتایا کہ اکیڈیمی ایسا ہی کر رہی ہے ! آپ کی راے ہے کہ اگر ہندو مسلمان اپنے فریقانہ شکوک و شبہات چھوڑ دیں اور متفق ہوکر کام شروع کریں تو مسئلۂ ادب کی گتھیاں بہت آسانی سے سلجھ سکتی ہیں !

اردو کا خطبۂ صدارت ، ہماری زبان کے مایۂ ناز انشاپرداز سید سجاد حیدر " یلدرم " بی اے (علیگ) نے پڑھ کر سنایا - آپ کا خطبہ ادبی لطائف سے معمور ، اور آپ کی عام تحریری روش کے بر خلاف بہت سنجیدہ اور وزنی ہے ! اِس میں بھی زبان کے متعلق وہی خیالات ہیں جو اگلے دو خطبوں میں ظاہر کیے گئے ہیں - " بے عمل " شاعروں کا توارد تو بہت کم نتیجہ خیز ہوا کرتا ہے ، لیکن " با عمل " انشاپردازوں کا یہ " توارد " عجب نہیں ، کچھ نہ کچھ مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہو -

صدارتی خطبوں کے بعد اکیڈیمی کے فاضل جنرل سکریٹری عالی جناب ڈاکٹر تاراچند ایم اے - ڈی ، فل - (آکسن) نے اپنی عالمانہ تحریر پڑھی ، جس میں " شکریے " کے علاوہ آپ نے بتایا ہے کہ اکیڈیمی

نے اب تک (۸۰) سے اوپر کتابیں تصنیف اور (۱۰) کتابیں ترجمہ کرائی ہیں ! ترجمہ کے قدیم آسان فارسی ، اردو علمی اصطلاحات نمونے کے طور پر پیش کرتے ہوئے آپ نے تجویز کیا ہے کہ اِس زمانے میں بھی اِسی طرز پر اصطلاحات وضع کی جائیں !

" شعبۂ اردو کا اجلاس "

۲۰ - مارچ کو ۹ بجے صبح شعبے وار اجلاس شروع ہوئے - اردو کے اجلاس میں حاضرین کی تعداد اگلے اجلاسوں سے کسی طرح کم نہ تھی - " حیدرآباد " سے مولوی عبدالحق صاحب بی اے ، " بھوپال " سے سر لیاقت علی ، " علی گڈھ " سے رشید صاحب اور مسٹر آل احمد سرور تشریف لائے تھے - " اعظم گڈھ " سے علامہ سید سلیمان ندوی گویا سارے گھر سے شریک تھے ! دارالمصنفین کے تین صاحبوں نے اِس جلسے میں شرکت فرمائی تھی - اِس خلفشار اور بدامنی کے زمانے میں جب کہ خود " آلہ آباد " کے باشندے ، یہاں کے گلی کوچوں میں نکلنے کی ہمت نہیں کرتے تھے ، اِن حضرات کا ایسے دور و دراز مقامات سے تشریف لانا اِن کی گہری دل چسپی کا بیّن ثبوت ہے !

مذکورۂ بالا حضرات کے علاوہ اِس اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ڈاکٹر تارا چند ، ڈاکٹر زبید احمد ، ڈاکٹر محمد حفیظ سید ، ڈاکٹر سعیدالحسن ، پنڈت منوہر لال زتشی ، مولوی ضیاءالحسن علوی مولوی نعیم‌الرحمان وغیرہ بھی شریک تھے - ہندی اجلاس کے خاتمے پر شعبۂ ہندی کے صدر راؤراجا راےبہادر ڈاکٹر شیام بہاری مسرا بھی تشریف لائے تھے -

اِس اجلاس میں پڑھے جانے والے مضامین کی ایک لمبی فہرست تھی ، لیکن جو پڑھے گئے یا وصول ہوئے وہ درج ذیل ہیں -

۱—بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق—از علامہ سید سلیمان ندوی -

۲—اردو کے قدیم کتبے—از مولوی عبدالحق صاحب ' بی اے -

۳—اردو نثر کے ایک منتخب مجموعے کی ضرورت—از مولانا عبدالسلام ندوی -

۴—اقبال اور ابلیس—از جناب آل احمد سرور ' ایم اے -

۵—اردو شاعری پر ہندو تہذیب و معاشرت اور ہندستان کے جغرافی اثرات—از مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی -

۶—نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی—از جناب لطیف الدین احمد اکبرآبادی -

۷—تاریخ اودھ—از جناب محمد تقی احمد ' ایم اے ' (لکھنؤ) -

علامۂ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون بڑی توجہ سے سنا گیا - آپ کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے اپنا مضمون پڑھا - مولوی صاحب موصوف اُس کے ثبوت کے لیے کتبوں کے عکس بھی ساتھ لائے تھے ' مجمع نے اُن کو بڑے شوق سے دیکھا - آل احمد صاحب سرور کا مضمون دل چسپ تھا - اُنھوں نے " ملٹن " کے شیطان اور " اقبال " کے شیطان کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال کے شیطان کی برتری ظاہر کی ! شاہ معین الدین صاحب ندوی کا مضمون بھی جامع اور مدلل تھا - یہ تمام مضامین پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ سنے گئے - اور آئندہ ہدیۂ ناظرین کیے جائیں گے -

خطبۂ صدارت

از

عالی جناب سید سجاد حیدر " یلدرم " بی اے ' (علیگ)

صدر اجلاس ششم ' شعبۂ اردو - ہندستانی اکیڈیمی '

صوبجات متحدہ

الہ آباد

(مع تکملہ)

خطبۂ صدارت

جو

جناب سید سجادحیدر یلدرم ' بی ' اے (علیگ) نے بحیثیت صدر شعبۂ اردو '
هندستانی اکیڈیمی کی چھٹی ادبی کانفرنس میں بمقام الٰہ آباد پڑھا -

معزز حاضرین !

هندوستانی اکیڈیمی نے مجھے اِس جلسے کا صدر قرار دے کر ' اپنی توهین کی اور مجھے عزت بخشی ! اِس توهین کے آپ سزاوار هیں' اِس عزت کا میں مستحق نہیں !

مجھکو جب یہ حکم ملا کہ میں آپ کے سامنے خطبۂ صدارت کی شکل میں ' اپنے خیالات ظاهر کروں ' تو میں نے سوچا کہ میں کوئی عالمانہ خطبہ تو ارشاد نہیں فرماسکتا ' جو آپ کےلیے شمع هدایت کا کام دے سکے - یہ تو میرے بس کی بات نہیں ! لہذا میں نے دل سے کہا یہی مناسب هے کہ زبان اور ترقی زبان کے متعلق تو جو کچھ سوچتا رہا هے ' اور گزشتہ ایک چوتھائی صدی کے عرصۂ دراز میں ' ملک کی ادبی و لسانی تحریکات نے تجھ پر جو اثر ڈالا هے ' اُسے اپنی عامیانہ زبان میں بیان کر دے !

هندوستانی اکیڈیمی ' اِس صوبے کی دو زبانوں کی رقابتوں اور کشمکشوں کو دور کرنے کے لیے عالم وجود میں آئی تھی ' مگر کیا اِس رقابت اور کشمکش میں کوئی کمی آئی ؟ میں سمجھتا هوں کہ نہیں ! دو سال قبل هی کی بات هے کہ دو زبردست هستیوں نے

اِسی اکیڈیمی میں دو متضاد خیالات کا اظہار فرمایا تھا -

مولانا عبدالحق نے فرمایا تھا : میں اِس وقت اُس کے (یعنی ہندستانی اکیڈیمی کے) کاموں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا ' لیکن اکیڈیمی کے کار فرماؤں کی خدمت میں اِس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جب اکیڈیمی نے ہندوستانی کا لقب اختیار کیا ہے اور ہندوستانی کے رواج کا بیڑا اُٹھایا ہے تو کیوں اب تک کچھ کتابیں ایسی تالیف نہیں کرائی گئیں اور کوئی رسالہ ایسا شائع نہیں کیا گیا جو ہندوستانی زبان میں ہو اور بجنسہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے دونوں رسم الخط میں لکھا جا سکے ...... اِس سے بھی زیادہ مفید کام جو اکیڈیمی کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسی زبان میں ریڈریں تیار کرائے جو دونوں رسم خط میں لکھی جائیں اور مدارس میں رائج کی جائیں' اِس سے وہ دو رنگی جو اِس وقت اِس صوبے کے مدارس میں پائی جاتی ہے خود بخود اُٹھ جائے گی ...... ہندوستانی کے رواج کا سب سے بڑا ذریعہ یہ مدارس ہو سکتے ہیں - جب زبان ایک ہو جائے گی تو رسم خط کی نزاع آپ سے آپ اُٹھ جائے گی- ابھی زبان ہی ایک نہیں ' رسم خط کی بحث کیسی ! "

اُسی دن اور اُسی مقام پر ' ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا نے بحیثیت صدر شعبۂ ہندی کے فرمایا :

جب تک ہم عملی حالت میں ہیں ' اختلاف ماننا ہی پڑے گا اور اُسی کے مطابق کام بھی کرنا ہوگا ......، اُن سرکاری احکام کو جن کے مطابق اِن صوبوں میں ہندی اور اردو کو متحد کرنا ٹکسٹ بک کمیٹی کا سب سے بڑا فرض تھا ' اُس وقت سے متحد کرنے کی کوشش کو خود اور روایتی طور سے دیکھتا اور بھگتتا رہا - اِس تجربے سے یہ اصول میرے

دل میں جاگزیں ہوگیا کہ معمولی بول چال میں " میں کھاتا ہوں ' میں جاتاہوں " وغیرہ کے استعمال تو ایک قسم کے ہیں اور ایک قسم کے ہوتے رہیں گے ' لیکن مضمون‌نگاری اور تصنیف کے عمل میں یکسانیت قطعاً ناممکن ہے ' غیر ممکن ہی نہیں بلکہ برباد کن ہے ...... اور اِن زبانوں کا اتحاد اُسی وقت ممکن ہوگا ' جب پانی کے کل دھارے ' وجود مطلق کے بحر بے پایاں میں محو ہو جائیں گے ...... جس آدمی کے دل میں یہ اصول جاگزیں ہوگیا تھا ' اُسے دونوں زبانوں کے متحد کرنے والے ادارے کو دیکھ کر تعجب ہونے لگا ' اپنے اصول پر شبہہ ہونے لگا ...... لیکن کچھ ہی دنوں - مہینے سے بھی کچھ کم میں یہ دکھائی دیا کہ ہندی اور اردو کے دونوں دھاروں کا پریاگ پر سنگم نہیں ہو رہا ہے اور دونوں دھارے ساتھ ساتھ مگر الگ الگ چل رہے ہیں اور چلائے جارہے ہیں - دونوں زبانوں میں علحدہ علحدہ کتابیں تیار ہو رہی ہیں اور آخر میں اِس ادارے کے آرگن تماہی رسالے بھی الگ الگ نکل رہے ہیں-

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں: آج ہندوستانی اکیڈیمی کے اندر اردو اور ہندی کے الگ الگ اجلاسوں کو دیکھکر اور اِس سے اپنے اصولوں کی تائید پاکر میں کتنا مسرور ہوں ' میں کہہ نہیں سکتا! جیسا ہوا ہے ویسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا! یہی مناسب تھا ' اور یہی مناسب ہے!"

آپ نے دیکھا اور آپ نے غور فرمایا! اِن دونوں بزرگ ہستیوں کے ارشادات میں کیا فرق ہے؟ میرے نزدیک فرق صاف ظاہر ہے -

ایک آرزو بیان کر رہا ہے ' دوسرا حقیقت جسے وہ اپنی آرزو کے ہمعنان پاتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی کی شاہراہیں ' بالکل علحدہ علحدہ ہو گئی ہیں - ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا فرماتے ہیں ' یہی مناسب تھا اور یہی مناسب ہے - ڈاکٹر عبدالحق شاہراہوں کے

علحدہ علحدہ ہونے سے انکاری ہے نہیں ، مگر وہ کہتے ہیں کہ دونوں زبانوں کو ایک راستے پر ڈال دینا چاہیے -

اِن دو شاہراہوں کو دیکھکر ہمارے قابلِ تعظیم اور اتحاد پسند صدر ، ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے یاس انگیز خیال ظاہر کیا کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں ، تو وہ دن دور نہیں کہ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے لیے ہندو مسلمانوں کو ایک ایک ترجمان ساتھ رکھنا پڑے گا - جب اتحاد کے امکان کو اِن الفاظ میں بیان کیا جائے کہ اِن زبانوں کا اتحاد اُسی وقت ممکن ہوگا جب پانی کے کل دھارے وجود مطلق کے بحر بے پایاں میں محو ہو جائیں گے تو کوئی تعجب نہیں کہ اردو کے انتہاپسند بھی یہ کہیں کہ اردو کو آسان کرنے کی کوشش بے سود ، بے سود ہی نہیں مضر ہے - اُسے اگر محض بازار کی زبان سے اوپر کرنا ہے تو اُسے فارسی و عربی کے اُن الفاظ سے جو بلند خیالات کو ظاہر کرسکیں مالا مال کرنا ہوگا - مگر میں کہتا ہوں کہ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ آپ اردو کو ہندی سے ، یا ہندی کو اردو سے بالکل بے نیاز کردیں جب تک کہ آپ ایک ملک میں رہتے ہیں ، ایک دوسرے کے ہمسائے اور پڑوسی ہیں ، یہ ممکن نہیں کہ ایک دوسرے کی معاشرت ، ایک دوسرے کی زبان ، یا بہ الفاظ دیگر ایک دوسرے کی رفتار و گفتار سے متاثر نہ ہوں - جب یہاں پہنچ کر مسلمانوں کا لباس و خوراک ، طرز بود و ماند یہانتک کہ مذہبی مراسم میں مقامی رنگ آگیا ، اور مقامی اثرات کی جھلک دکھائی دینے لگی ، تو زبان تو بہت جلد اثرپذیر ہوتی ہے - اور ہندوؤں نے بھی اِسی حد تک بلکہ اِس سے زیادہ مسلمانوں کا اثر قبول کیا - اور یہ اثر ایک دوسرے پر پڑتا رہیگا جب تک کہ آپ دونوں قوموں کے درمیان ایک دیوار آہن کھڑی نہ کردیں -

اب تو دونوں ایک جگہ رہتے سہتے ہیں - جب مسلمان ہندوستان میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے اُس زمانے میں بھی ایک دوسرے کی زبان اور لٹریچر سے ایسے بیگانہ نہ تھے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

ایک پر از معلومات و پر از تحقیقات مقالے میں ' جو پنڈت برج موہن دتاتریہ نے علی گڈھ میں پڑھا تھا ' یہ ثابت کیا تھا کہ فارسی کا پڑھنا ہندوؤں میں مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے جاری تھا ' گو عام نہ ہو ' اور ہندوستان کے ہندو راجہ قبل اِس کے کہ مسلمان یہاں حملہ آور ہوئے کابل اور وسط ایشیا کی اسلامی سلطنتوں سے ' فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے ' اور ہندو دربار کے ہندو منشی اُن مراسلات کو فارسی میں لکھتے تھے - ہند و عرب کے تعلقات میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے بتایا ہے کہ جنوبی ہند میں عرب تاجروں اور عرب جہازرانوں کی بدولت مسلمانوں اور وہاں کے ہندوؤں میں معاشرتی اور تجارتی تعلقات مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہونے سے قبل قائم ہوچکے تھے - اِسی طرح فارسی زبان کا "بت" اصل میں بدھ ہے ' یعنی حضرت گوتم بدھ کا مجسمہ ' اور یہ تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ نیپال جو کبھی مسلمانوں کے زیرنگیں نہیں رہا وہاں بھی ' شمشیر جنگ رانا ' ببر جنگ رانا ' تیغ بہادر رانا ' جیسے نام بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی زبان کا اثر ' ان کے سیاسی اثر کے حدود سے باہر پہنچ گیا تھا -

ایسی حالت میں میں نہیں مان سکتا کہ اردو جو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ' اگرچہ اُس میں فارسی اثر زیادہ ہے ' وہ محض مسلمانوں میں محدود ہو کر رہ جائیگی ' یا ہندی کو مسلمان نہ سمجھ سکیں گے ' آخر اب بھی تو ہندی ٹھمریوں اور گانوں کو مسلمان

سکتے ہیں اور اُن سے لطف اُٹھاتے ہیں - اُردو کا اثر مسلمانوں اور ہندؤں پر کم و بیش ہوگا ' ہندوؤں پر کم ' مسلمانوں پر زیادہ - اِسی طرح ہندی کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر ہوتا رہے گا ' مسلمانوں پر کم ' ہندوؤں پر زیادہ -

مگر جب عمداً یہ کوشش کی جائے کہ دونوں زبانیں اِس قدر علحدہ ' اور ایک دوسرے سے دور ہو جائیں کہ اُن میں مشارکت کا امکان ہی باقی نہ رہے ' رسم‌الخط تو علحدہ ہے ہی ' الفاظ بھی ۹۹ فیصدی علحدہ ہوں تو پھر اگر آئندہ کی طرف سے ناامیدی کی جائے تو کوئی جاے تعجب نہیں -

اردو سے اُن فارسی الفاظ کے نکالنے کی کوشش جو اُس کے جسم و جان میں پیوست ہو گئے ہیں ' ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے -

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو لکھنؤ کی ہندوستانی کانفرنس میں گزشتہ سال ارشاد فرمایا تھا ' کہا تھا کہ اردو نے جن فارسی الفاظ کو اپنا لیا ہے ان کو اُنہیں معنوں میں ' اور ویسے ہی تلفظ اور املا کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے جن معنوں اور جیسے تلفظ اور املا کے ساتھ اردو میں وہ رائج ہوگئے ہیں - مولانا نے اِس کی مثالیں بھی دی ہیں ؛ مثلاً مواد ' اصل ' شہوت ' مشکور ' مسالہ مشال ؛ اِسی طرح سنسکرت کے الفاظ جس طرح اردو میں یا ہندوستانی میں رائج ہیں اُن کو چھوڑ کر ' اصلی سنسکرت کے تلفظ کے ساتھ اُن کو بولنے کی کوشش کو بھی بالکل بجا طور پر ادبی پاپ قرار دیا ہے -

اُن فارسی الفاظ سے جنھیں ہم فارسی سمجھ کر فارسی میں استعمال کرتے ہیں ' اہل ایران اُن پر چونکتے ہیں اور ہماری ہنسی اُڑاتے ہیں ' یعنی وہ الفاظ فارسی نہیں رہے - ہم نے اردو میں اُن کو دوسرے

معنے دے دیے ھیں ' اور اب وہ لفظ بالکل ہمارے ہو گئے ھیں - آپ اُن کو اپنی زبان سے نکال دیجیے ' آپ کے ھاں سے نکل کر وہ بالکل نکھرے ہوجائیں گے ' کیوں کہ فارسی یا عربی اِن معنوں میں اُنھیں قبول نہ کرے گی -

مثلاً اِن دو لفظوں کو لیجیے ' جن کو فارسی میں استعمال کرنے میں جب کہ وہ ایران میں سفر کرتے ھیں ' اہل ھند ٹھوکر کھاتے ھیں :

	اصل معنے	اردو میں
تکلیف ...	فرض ' ذمے داری ...	زحمت
خفا ...	گلا گھونٹنا ...	ناراض ہونا

یہ نہ خیال کیجیے کہ ہم نے الفاظ کے معنے بدل دیے ' ایرانیوں نے بھی ایسا کیا ھے ' مثلاً ناخوشی ' ہم اصلی معنے " ناراضی " میں استعمال کرتے ھیں ' ایرانیوں نے نا خوشی کو بیماری کے معنے دے دیے ھیں -

اِس سلسلے میں ایک لطیفہ عرض کروں - بغداد میں ایک نوجوان ایرانی جو ھندوستان میں رہ چکے تھے ' مجھ سے تعریضاً کہنے لگے کہ ھندوستانیوں کے کیرکٹر کا اِس سے پتا چلتا ھے کہ تکلیف یعنی فرض اور ذمے داری کو وہ زحمت سمجھتے ھیں ' اور اُس سے گریز کرتے ھیں ! میں نے کہا کہ ڈیوٹی کم ایسا ہوتا ھے کہ آرام کی چیز ہو ' لیکن اگر کوئی ڈیوٹی کو آرام کی چیز نہ کہے تو اُس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ھے کہ وہ اُس سے گریز کرتا ھے - برخلاف اِس کے ایرانیوں کے خصائص ملی اور اُن کی ہمت و بہادری کا اِس سے اندازہ ہوتا ھے کہ لفظ " تیغ " تلوار کے مفہوم سے گھٹ کے اور اُتر کے اُسترے کے معنے میں رہ گیا ھے ! ایرانی اُسترے کو شمشیر کے برابر خطرناک ہتھیار سمجھتے ھیں !

ایک ھی لفظ اردو میں ایک معنے دیتا ھے اور دوسری زبان میں

بالکل دوسرے معنی ' اِس کی ایک اور پر لطف مثال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں : ظریف و متین دو لفظ ہیں - ظریف ہم اُس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق و خوش طبعی ہو ؛ متین ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں- لیکن ایک ترکی اخبار میں ایک جوتا بیچنے والے کے اشتہارات میں نے دیکھے جو کہتا ہے کہ اُس کے جوتے نہایت ظریف و متین ہیں ! کیا سمجھے آپ ؟ یہ یک وقت یہ جوتے آپ سے مذاق بھی کریں گے اور نہایت متانت سے بھی پیش آئیں گے - لیکن اشتہار دینے والے کا یہ مطلب نہیں - وہ تو یہ اعلان کر رہا ہے کہ اُس کے جوتے ظریف یعنی خوبصورت بھی ہیں اور متین یعنی مضبوط بھی ! ایک اور لفظ کا قصہ عرض کروں ' جس میں کوئی مذاق کا پہلو نہیں ' مگر جس نے ایک موقع پر ایک بے خودی کی کیفیت مجھ پر طاری کردی - عرصے کا لفظ ' ہماری زبان میں مدت وقت کے لیے مستعمل ہے : " آپ سے بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی" استنبول میں ایک قطعۂ زمین پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا ' " یہ عرصہ برائے فروخت ہے " - یہ پڑھتے ہی مجھے داغ کا شعر یاد آگیا اور میں نے مزے لے لے کر اُسی مقام پر اُسے پڑھا '

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھرو ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

یہ جو عام شکایت کی جاتی ہے کہ آج کل اردو لکھنے والے جان جان کر ' غیر مانوس اور سخت عربی فارسی کے الفاظ اپنی تحریروں میں ٹھونستے ہیں ' اور روز مرہ کے سادہ الفاظ کے استعمال کو اپنے خلاف شان سمجھتے ہیں ' یہ ایک حد تک صحیح ہے - مگر میرا خیال ہے کہ ایک زندہ اور ترقی کرنے والی زبان ' ہمیشہ نئے نئے لفظ اپنے میں جذب

کرتی رهتی هے ' اِس کو قطعاً روکنے کی کوشش کرنا مضر هو گا - اب یہ مذاق سلیم اور هندوستانی اکیڈیمی کے احکامات پر موقوف هے کہ لکھنے والا کون سے لفظ اختیار کرے اور اُن کو رواج دینے کی کوشش کرے - نان کواپریشن کے زمانے میں اخبارات اور تقریروں میں " عدم تعاون " اور " مقاومت مجہول " پڑھنے اور سننے میں آتے تھے - مقاومت مجہول لا حول ولا قوۃ ! سوائے اِس کے کہ (Passive resistance) کا ایک بھونڈا سا ترجمہ کر دیا ' مکھی کی جگہ مکھی ماردی ' مگر سننے والا خاک نہیں سمجھا کہ یہ مقاومت مجہول کیا بلا هے ! میں اب بھی کہتا هوں کہ اگر ذهن میں (Passive resistance) کے الفاظ پیشتر سے نہیں تو کوئی عربی داں بھی اِس کے وہ معنے نہیں بتا سکتا جس کے لیے مقاومت مجہول گڑھا گیا - بہر حال مقاومت مجہول اپنی موت مرگیا ' مگر عدم تعاون زندہ و قائم هے - اِسی طرح مندوب ' مبعوث ' نمائندہ ' تین لفظ نکلے ' یہ اردو میں (delegate یا representative) کے معنوں میں نئے لفظ تھے - مندوب و مبعوث کا استعمال اِس قدر کم هے کہ بمنزلہ نہ هونے کے هے' مگر نمائندہ چل پڑا هے - ایکٹنگ کی جگہ " ادا کاری" نے لی هے اور یہ اچھا لفظ هے -

بعض اچھے خاصے لفظ چھوڑ کر ' نئے لفظ محض اس لیے کہ وہ شاندار هیں اختیار کیے جارهے هیں ' " ناظرین " قریب قریب مرحوم هے ' اُس کی جگہ قارئین کرام نے لی هے - هیرو کو چھوڑ کر بطل کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی ' مگر شکر هے کہ اُس میں کامیابی نہیں هوئی !

میں نے ایک اصول قائم کیا هے' یا یوں کہیے کہ یہ میرا ایک نظریہ هے ' عربی کے جو الفاظ فارسی کے ذریعے سے هم تک پہنچے هیں اردو

اُنھیں ھضم کر لیتی ھے - مگر جو الفاظ براہ راست عربی سے لیے جاتے ھیں اردو کا معدہ اُنھیں قبول کرنے سے انکار کرتا ھے - فارسی بھی سعدی و حافظ کی نرم و شیریں فارسی ' نہ کہ آج کل کی کرخت ایرانی - اب تو فارسی کے لیے عربی کے لفظ کا استعمال ہی ممنوع ھے ' چنانچہ بطل فکاھات ' شذرات ' ھضم نہ ھوسکے - اِس بات پر غور کرنا بھی دل چسپ ھے کہ نیپال میں ' شمشیر جنگ ' تیغ بہادر ' بیر جنگ تو چلا ' سیف الملک و ضیغم الدولہ نہ چلا -

یہ الزام بھی غلط ھے کہ ھندی کے لفظ جان جان کر نکالے جارھے ھیں - سماج (بمعنی سوسائٹی) ' پرچار ' چناؤ ' شانتی ' جو پہلے استعمال نہ ھوتے تھے اب مسلمانوں کی تحریروں میں ملتے ھیں - بلکہ میں تو کہہ سکتا ھوں کہ ھندو لکھنے والے فارسی کے مروجہ اور زبان زد خاص و عام الفاظ کے ساتھ زیادہ عدم تعاون برتتے ھیں!

اور یہ بات کہ مسلمانوں کی اردو میں فارسی الفاظ نسبتاً زیادہ ملتے ھیں - اور ھندوؤں کی زبان میں سنسکرت کے ' قدرتی بات ھے - جس لٹریچر اور زبان سے جو شخص زیادہ متاثر ھوا ھے اُس کی تحریر وتقریر میں اُسی کی جھلک پائی جائے گی-

پارسیوں کی گجراتی ھندوؤں کی گجراتی سے ایک حدتک مختلف ھوتی ھے - پارسیوں کی گجراتی میں فارسی اور اردو کے الفاظ زیادہ ھوتے ھیں - " جام جمشید " جو پارسیوں کا مشہور اخبار ھے اور گجراتی میں شائع ھوتا ھے ' اگر آپ کے سامنے پڑھا جائے تو آپ اُس میں بہت سے الفاظ ایسے پائیں گے جنھیں ھم بولتے ھیں اور لکھتے ھیں - اخبار کا نام ھی فارسی ھے - " سانجھ ورتمان " جو ھندوؤں کا کثیرالاشاعت گجراتی زبان کا اخبار ھے اُس میں فارسی اور اردو کے

الفاظ کم ھیں ' وجہ یہ ھے کہ باوجودیکہ پارسیوں نے گجراتی زبان اختیار کرلی ھے ' لیکن اُن میں ایک کافی تعداد اب بھی فارسی پڑھتی ھے ' اور اُس کی تحریر و تقریر میں اُس کا اثر نمایاں ھوتا ھے - اِسی طرح قاضی " نذرالاسلام " جو بنگال کے نوجوان شاعروں میں بےحد شہرت و مقبولیت حاصل کررھا ھے ' کہا جاتا ھے کہ اُس کی شاعری میں گل و بلبل زلف و کاکل ' ساغر و شراب اور اِسی قسم کے اور فارسی الفاظ کثرت سے آتے ھیں - صرف دیکھنا یہ چاھیے کہ جان جان کر اور تعصب سے تو الفاظ کا اِستعمال نہیں کیا جارھا - اگر بےساختہ زبان پر آتا ھے ٹھیک ھے-

یہ کوشش کہ ھندی سے فارسی کے الفاظ یعنی بدیسی الفاظ خارج کردیے جائیں ' نیشنلسٹ شراب کے نشے کا نتیجہ ھے - ایران و ترکی کے قوم پرور بھی اِسی نشے سے بدمست ھیں - فارسی سے عربی الفاظ کو دیس نکالا مل رھا ھے - ترکی میں یہ اِس کا زور ھے کہ فارسی اور عربی دونوں کو نکال دو ! میرا خیال ھے کہ ترکوں اور ایرانیوں کی یہ کوشش کامیاب ھوتی نظر نہیں آتی - شروع شروع میں تو میں نے دیکھا کہ ایسی ترکی لکھی جاتی تھی جس کا سمجھنا ازبس دشوار تھا ' مگر اب میں دیکھتا ھوں کہ پھر ' وھی معمولی ترکی ھے جس میں فارسی کے لفظ بھی ھیں اور عربی کے بھی - ھندی کی اِس نیشنلسٹ تحریک جدید کا کیا حشر ھوگا ' اِس کے متعلق اِس وقت کوئی اندازہ نہیں لگایاجا سکتا ' مگر میرا دل گواھی دیتا ھے کہ یہ شدت ' یہ تعصب قائم نہیں رھے گا-

اِس موقع پر ' خالدہ خانم ادیب کی راے کا نقل کردینا نامناسب نہ ھوگا - خالدہ خانم اپنے ملک میں بھی سخت قسم کی

نیشنلسٹ ھیں ' اور ھندوستان کی سیاحت کے بعد جو کتاب (Inside India) اُنھوں نے لکھی ھے اور جو ابھی شائع ھوئی ھے ' اُس کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ اُن کی ھمدردی تمام تر ھندوستان کی نیشنلسٹ تحریک کے ساتھ ھے ' اور اکثر اُنھوں نے مسلمانوں کو مورد الزام قرار دیا ھے - اُن کے خیالات یہ ھیں :

اول اُنھوں نے اپنے کسی مسلمان دوست کے خط کا اقتباس دیا ھے ' جس میں اُس نے لکھا تھا کہ

" آپ کے جانے کے بعد نیشنلزم نے زبان کے معاملے میں مسلمانوں کو سخت ضرب لگائی ھے - یہ تاریخی واقعہ ھے کہ شمالی ھندوستان کی تمام وہ زبانیں جو بولی جاتی ھیں اپنی ترقی و اُرتقا کے لیے مسلمانوں کی حمایت کی مرھون اِحسان ھیں ' لیکن نیشنلزم نے یہ فیصلہ کیا ھے کہ تمام بدیسی الفاظ ' قومی زبان سے خارج کردیے جائیں اور اِسی قومی زبان کا نام ھندوستانی قرار دیا جائے اور نیشنلزم نے یہ بھی فیصلہ کیا ھے کہ نہ صرف تکنیکل اصطلاحات کے لیے بلکہ روز مرہ کے الفاظ کے لیے ' سنسکرت کو ھی منبع و مرجع قرار دیا جائے ' وہ سنسکرت جو کبھی ملک میں بولی نہیں گئی ! "

اِس اقتباس کے بعد خالدہ خانم اپنی راے دیتی ھیں '

" میں اُس مسلک کی متبع ھوں جو خالص زبان کا حامی ھے ' اور اِس بنا پر مجھے ھندوؤں کا طرفدار ھونا چاھیے تھا - مگر میں اُن کی طرف نہیں ھوں ' اور اِس کی وجہ یہ ھے کہ خالص زبان میں اُسے سمجھتی ھوں جس میں تحریر کی زبان جہانتک ھو سکے اُس زبان سے جو بولی جاتی ھے قریب لائی جائے - تکنیکل اصطلاحات کے بارے میں میں اِنٹرنیشنل یعنی بین الممالک اتحاد کی قائل ھوں " -

آگے چل کر وہ فرماتی ھیں '

" ھندو جن الفاظ کو (عربی و فارسی کے الفاظ کو) غیرملکی قرار دیتے ھیں ' وہ غیرملکی نہیں رہے - جن لفظوں کا استعمال ایک ہزار برس سے ہورہا ہے اُن کی جڑ کہیں کی ہو ' اہل ہند اُن سے بمقابلہ غیرمانوس سنسکرت الفاظ کے زیادہ آشنا ہیں ! "

میں اُن کے اصلی الفاظ آپ کی اجازت سے پڑھ کر سنا دینا چاہتا ہوں۔

(اِس موقع پر آپ نے کتاب سے انگریزی عبارت پڑھی ' جس کا ترجمہ ابھی گزر چکا ہے ')

مشترک زبان کا حل میرے نزدیک یہ نہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے جو نہ آج کل کی سخت اردو ہو ' اور نہ آج کل کی سخت ہندی ' کیوں کہ جب ایسی ریڈریں تیار کی جاتی ہیں تو دونوں طرف سے اُن پر اعتراض شروع ہوتے ہیں ' اردو والے کہتے ہیں کہ مشترک زبان کے پردے میں ہندی کو رواج دیا جارہا ہے ' ہندی والے کہتے ہیں کہ یہ تو وہی اردو رہی - میرے نزدیک اِس مشکل کا حل یہ ہے کہ ہر طالب علم کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے سیکھنے پر مجبور کیا جائے ' پھر آہستہ آہستہ خود بخود ایک گھلی ملی زبان پیدا ہو جائے گی - علی گڈھ یونیورسٹی نے اردو کے ایم - اے کے نصاب میں ' اِسی اصول کو مد نظر رکھ کر ہندی کا ایک لازمی پرچہ بھی رکھا ہے - مجھ سے ایک صاحب نے کہا (میں نہیں جانتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے ' کیونکہ وہاں کا نصاب میری نظر سے نہیں گزرا) کہ اِسی کو نظیر قرار دے کر ' لکھنئو کے ہندی ایم - اے کے نصاب میں اردو کا پرچہ شامل کیے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا ' مگر وہ مسترد کردیا گیا ؛ اگر یہ صحیح ہے تو اِس غلطی کی تلافی ہونی چاہیے -

شائد یہ کہا جائے کہ طالب علم پر کتنی زبانیں سیکھنے کا بار ڈالا جائے گا ' اِس کا میرے پاس یہ جواب ہے کہ اردو اور هندی دو مختلف‌الاصل زبانیں نہیں ہیں - جب جنوبی افریقہ میں ڈچ اور انگریزی ' اور کنیڈا میں فرنچ اور انگریزی پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں ' حالانکہ انگریزی اور ڈچ ' اور فرنچ اور انگریزی دو بالکل جدا جدا زبانیں ہیں' تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو و هندی جو حقیقت میں ایک ہی زبان ہے ' کیوں ساتھ ساتھ نہ چل سکیں گی -

هندو مصنفین سے میری درخواست ہے کہ وہ ایسی اردو لکھیں جیسی میرے دیرینہ محسن مکرم منشی دیا نرائن صاحب نگم ' پنڈت کول ' پنڈت زتشی لکھتے ہیں - مسلمان ایسی لکھیں جیسی سید سلیمان صاحب ندوی ' مولوی عبدالحق ، حسن نظامی ' ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں - کاش منشی پریم چند جیسے مصنفین هم میں پیدا ہوں ' جن کی قادرالکلامی اردو اور هندی زبانوں میں یکساں تھی ' اور جنھیں اردو اور هندی اپنا سب سے بڑا ادیب شمار کرنے میں مسابقت کر رہی ہیں -

ایک حد تک یہ مسئلہ فرسودہ ہوگیا ہے ' میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے هندوستانی اکیڈیمی قائم ہوئی ہے ' اُس کے ہر سالانہ جلسے میں ' ہر خطبۂ صدارت میں اِس کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے - سرتیج بہادر سپرو ' مسٹر سچیدا نند ' مولوی عبدالحق صاحب ' مولانا سید سلیمان ندوی ' ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا ' اکیڈیمی میں اور اکیڈیمی کے باہر ' بطور قول فیصل کے پنڈت جواہر لال نہرو نہایت قابلیت مگر نہایت ٹھنڈے دل سے اِس مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈال چکے ہیں - لیکن مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ہمارے مفکرین کی توجہ تمام تر اُس کی

طرف ہے ' پھر بھی کوئی معقول حل ' ایسا حل جسے عام رائے خوشی سے قبول کرلے نظر نہیں آتا ' تو پھر اِس گتھی کو سلجھانے کا کیا دعوی کرسکتا ہوں ! لیکن اپنی بساط بھر کوشش میں نے بھی کی -

حضرات ! ہندوستانی اکیڈیمی کی علمی اور ادبی خدمات قابل تحسین ' اِس قلیل عرصے میں اُس نے بہت کیا ہے ' لیکن کام کی ابتدا ہی ہے ' اور اِس وقت ہی اگر اپنا پروگرام پورے غور و خوض سے معیّن کر لیا جائے تو بہتر ہے -

ہماری زبان کے لیے ' یہ دور دور ترجمہ ہے ؛ عثمانیہ یونیورسٹی ہو کہ انجمن ترقی اردو ' ہندوستانی اکیڈیمی ہو کہ کوئی اور جماعت دوسری زبانوں کے بلند پایہ مصنفین کی کتابوں کے ترجمے سے وہ بے نیاز نہیں ' یہی نہیں کہ بے نیاز نہیں بلکہ اُن کی کوششوں کے بیشتر حصے کا انحصار عمدہ کتابوں کے ترجمے کرانے یا ایسی تالیفات پر ہو جن کا ماخذ کوئی مستند کتاب یا مستند مصنف ہے - اور یہ طریق عمل صحیح بھی ہے - تخلیقی دور ' ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے - پہلے اپنی زبان کے خزانے اُن جواہرات سے بھر لیجیے جو آپ کو آسانی سے مل سکتے ہیں' پھر نئی کانوں کی تلاش میں نکلیے گا - لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اِس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ سائنس اور فلسفے کی کتابوں کا ہی ترجمہ کیا جائے - بے شک اُن کا ترجمہ لابدی اور ضروری ہے ' مگر دوسری زبانوں کے لٹریچر سے ہمیں بے خبر نہیں رہنا چاہیے - انسانی روح کی تڑپ اور اُس تڑپ سے جو سوز و گداز قوموں میں پیدا ہوا ہے وہ ہمیں لٹریچر ہی میں ملتا ہے -

سید حسین بلگرامی مرحوم نے علی گڈھ میں ایک لیکچر کے دوران میں کس قدر صحیح فرمایا تھا کہ عربوں نے یونانیوں کے علوم و فنون

حکمت و فلسفہ ' منطق و طب کو اپنی زبان میں منتقل کر کے ' اُن کے دماغ ' اُن کے گوشت و پوست کو لے لیا ' مگر اُن کے لٹریچر سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے یونان کی روح ' یونان کے دل تک اُن کی رسائی نہیں ہوئی - یونان کی خشکی و یبوست تو اُن میں آگئی مگر یونان کی لطافت ' حسن و جمالیات کی فریفتگی کی اقلیم سے وہ دامن کشاں نکلے چلے گئے ' اس لیے وہ ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رہے -

یورپ جب قرون وسطیٰ کے خواب سے بیدار ہوا تو انسانیت پرستی کی لہر ' اِسی لٹریچر کے مطالعے سے اُس میں دوڑ گئی ' اِس لٹریچر کو اُس نے Humaniti s [۱] کے نہایت موزوں نام سے یاد کیا -

اِس لیے میری عرض ہے کہ آپ لٹریچر کے ترجمے کی اہمیت کو معمولی نظر سے نہ دیکھیں ' اور یونان اور قدیم روما کا لٹریچر ہماری زبان میں منتقل ہونا چاہیے -

جس لٹریچر نے بائرن کو یونان کا ایسا عاشق بنا دیا کہ اُس نے اُس کے لیے اپنی جان دے دی ' وہ کچھ جادو اپنے اندر رکھتا ہوگا - بائرن ہی کیا ' انگلستان اور یورپ کے کل شاعروں ' کل ادیبوں کو اِسی لٹریچر سے الہام ہوا ہے ' ملٹن ' کیٹس ' شیلی کی شاعری میں یونان و روما کے لٹریچر سے متاثر حصے کو نکال ڈالیے تو پھر کیا رہ جاتا ہے ؟ غرض کہ ہومر ' ورجل ' ہیر ڈوٹس ' سافوکلس او ر دیگر خدایان سخن کی تصانیف ہماری زبان میں براہ راست آنی چاہییں -

میں نے براہ راست عمداً کہا - مجھے ہنسی آتی ہے جب میں پڑھتا

---

[۱]—وہ چیزیں جن کا تعلق انسان کی تہذیب سے ہے - [ادارہ]

ہیں کہ روسی و فرانسیسی ادبیات کے شاہکاروں کے ترجمے اردو میں ہو رہے ہیں - جب دیکھیے تو مواد یہ ہے کہ میکسم گورکی ' تالستائے ' چیخوف ' اناطول فرانس کے جو ترجمے انگریزی میں ہوئے ہیں ' اُن میں سے کچھ کتابیں ' یا کچھ فسانے اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں - یعنی ترجمہ در ترجمہ !

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہترین ترجمہ ' اصل کی خوبیوں کا دھندلا سا نقشا ہوتا ہے ' یہ نقشا اور بھی دھندلا ہو جاتا ہے ' جب وہ کسی ترجمے کا ترجمہ ہو - اکیڈیمی کو اِس قاعدے کی سختی سے پابندی کرنی چاہیے کہ وہ کسی ترجمے کو قبول نہ کرے جب تک کہ وہ اصل زبان سے اردو میں نہ کیا گیا ہو - افسوس ہے کہ اردو میں خود ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لٹریچر کے ترجمے انگریزی سے کیے جاتے ہیں -

ٹیگور نے اپنی تصانیف کے انگریزی ترجمے خود کیے ہیں ' لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ترجمے نہیں ہیں ' اُس کی تصنیفیں ہیں ؛ اس لیے ٹیگور کی انگریزی تصانیف سے ترجمہ کرنا جائز ہے - لیکن بنکم چندر اور دیگر بنگالی مصنفین کی جو کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ' میرا خیال ہے کہ وہ اُن کے انگریزی ترجموں سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں - غضب خدا کا ! میں نے الف لیلہ کا ایک ترجمہ دیکھا جو انگریزی سے کیا گیا تھا ! میری التجا ہے سنسکرت لٹریچر کے ترجمے بھی ' اردو اور سنسکرت کے عالم اردو میں کر کے ہم کو عنایت کریں-

اردو کے قدیم اُستادوں کے کلام کو اور بعض جو اُستاد تھے بھی نہیں اُن کو اُستاد بنا کر پیش کرنا اور اُن کے متعلق ' تنقیدی مضامین لکھنا '

اور اُن کی یکساں اور گوشۂ عـزلت کی زندگی ' ایسی زندگی جو ہنگامہ و تلاطم سے دور رہی ہو ' جن کے کلام نے تو معاصرین کی زندگی پر یا آئندہ نسلوں پر کوئی اثر ڈالا ہو تو ہو ' گو یہ بھی بہت مشتبہ ہے ' مگر جن کی زندگی نے مطلق کوئی اثر نہیں ڈالا ' ایسی زندگیوں کے حالات کد و کاوش سے ڈھونڈنا ' ایک دل چسپ مشغلہ ہے ' اور آپ کے اصرار سے میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ اردو ادب کی خدمت ہے ' مگر ہندستانی اکیڈیمی کا کیا یہی مطمح نظر ہونا چاہیے ؟ اُس کے رسالے " ہندستانی " کو مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کے " اردوے معلیٰ " کا نقش ثانی نہیں ہونا چاہئے ' ضرورت ہے کہ اِس قسم کے مضامین زیادہ چھپیں جیسے مولوی نعیم‌الرحمان صـاحب یا ڈاکٹر صدیقی صاحب نے لکھے ہیں -

حضرات ! ہندوستانی اکیڈیمی نے ایک کمیٹی اِس غرض سے قائم کی تھی کہ وہ اِس مسئلے پر غور کرے کہ ایک مشترک زبان کس طرح عالم وجود میں لائی جاسکتی ہے ؟ اِس کمیٹی نے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ع کو اپنا اجلاس منعقد کیا اور اپنی رپورٹ تیار کی - اکیڈیمی کی کونسل میں ۷ مارچ ۱۹۳۲ع کو یہ رپورٹ پیش ہوئی ؛ اور کونسل نے رپورٹ سے اتفاق رائے کرتے ہوئے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ اکیڈیمی ایک ایسی ڈکشنری شائع کرے جس میں اردو اور ہندی کے تمام وہ الفاظ ہوں جو روز مرہ کی بول چال میں اِستعمال کیے جاتے ہیں - ۱۲ جنوری ۱۹۳۷ع کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسے آسان ہندی لفظوں کا ایک لغت فارسی خط میں لکھا جائے اور اُن کے ہم‌معنی ہندوستانی لفظ لکھے جائیں ' تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی میں شامل ہوسکیں- میری درخواست اِس سے زیادہ ہے !

ایک مکمل هندی ڈکشنری فارسی خط میں چھاپی جانی چاهیے - هندی الفاظ کو خطوط وحدانی میں ناگری حروف میں بھی لکھ دیا جائے ' مگر معنے اور تشریح سب فارسی خط اور هندوستانی میں هو -

حضرات ! جب تک آپ لیتھو کے شکنجے سے اپنے اخبارات ' اپنی کتابوں کو آزاد نہ کریں گے ' میری رائے میں اردو پوری ترقی نہیں کرسکتی !

آپ لیتھو کے ذریعے سے کسی کتاب یا کسی اخبار کو لاکھوں کی تعداد میں چھاپ ھی نہیں سکتے - چند ہزار کاپیوں کے بعد ' حرف اُڑنے لگتے ھیں - علاوہ ازیں کتابت اُس سرعت سے ھو نہیں سکتی ' جس سرعت سے کہ ٹائپ کمپوز کیا جاتا ھے - پھر ہر وقت آپ کو یہ آسانی ھے کہ چھوٹے چھوٹے آپ کسی عبارت کو نکال سکتے ھیں - بڑھا سکتے ھیں ' گھٹا سکتے ھیں - اخبار کی تیاری اور اِشاعت میں اِس آسانی کو بہت بڑا دخل ھے - اخبار چھپ رہا ھے ' آپ کے پاس ایک خبر آئی ' آپ پریس کو روک کر' اخبار کے کسی پیریگراف کو نکال کر' ورنہ جیسا کہ عام قاعدہ ھے (Stop Press) کی جگہ میں جو پہلے ھی سے اِسی غرض سے خالی رکھی جاتی ھے ' اُس خبر کو چھاپ سکتے ھیں - کاپیوں کی کتابت کی غلطیوں کے درست کرنے میں جو دیر لگتی ھے ' یہی اُسے مردود و مطرود قرار دینے کے لیے کافی ھے !

اِن تمام آسانیوں اور خوبیوں کی وجہ سے سوائے هندوستان کے ' اور هندوستان میں بھی سوائے اردو کے ' کہیں اخبار اور کتابیں لیتھو میں نہیں چھاپی جاتیں - ایران ' مصر' ترکی ' عربستان ' اور تو اور افغانستان ' حجاز ' اِن تمام ممالک نے لیتھو کی چھپائی یک قلم موقوف کردی - اِن ملکوں کی تمام کتابیں ٹائپ میں چھپتی ھیں -

لیکن همارا هندوستان ' میں نے غلط کہا ' هماری اردو ' ابھی

تک پتھر کے هی زمانے میں هے ! اُس سے آگے نہیں بڑھی ! هندوستان کی تمام زبانیں بنگالی ، مرهٹی ، گجراتی ، تیلیگو ، ملیالم ، کناری، اپنے اخبارات اور اپنی کتابیں ٹائپ میں چھاپتی هیں ، الاماشاء اللہ همارے اردو ! سندهی تک ، جو اُسی رسم الخط میں لکھی جاتی هے جیسے اردو ، اُس کے تمام اخبارات اور کتابیں ٹائپ میں چھپتی هیں -

سب سے بڑی رکاوٹ جو ٹائپ کے چھاپے کی راہ میں سمجھی جاتی هے، وہ یہ هے کہ اردو کے پڑھنے والے ٹائپ کے چھاپے کے پڑھنے کے عادی نہیں - نہ معلوم یہ دلیل کن صاحب نے ایجاد کی هے ! میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا کہ ٹائپ کے پڑھنے میں اُسے کوئی غیر معمولی دقت محسوس هوتی هے - جب مولانا ابوالکلام آزاد نے " الہلال " ٹائپ میں شائع کرنا شروع کیا ، تو کیا ٹائپ کی وجہ سے اُس کی اشاعت ، اُس کی مقبولیت ، اُس کی مانگ میں کسی قسم کی کمی آئی ؟ وہ هزاروں کی تعداد میں هاتھوں هاتھ بکا اور اب بھی آنکھیں اُسے ڈھونڈھتی هیں ؛ اور مثل گفتۂ سعدی " مثل کاغذ زر می برند ! "

انجمن ترقی اردو کا رسالۂ " اردو " یا رسالۂ " سائنس " یا همارا "هندوستانی" اِس وجہ سے کم فروخت نہیں هوتا کہ وہ ٹائپ میں چھپتا هے - اِن رسالوں کی اشاعت محض اِس وجہ سے محدود هے کہ پبلک ابھی علمی رسالوں کی قدر هی نہیں کرتی -

مولانا محمد علی مرحوم نے " همدرد " ٹائپ میں نکالا ، وہ هاتھوں هاتھ لیا گیا - لوگ اڈیٹر کی شخصیت اور مضامین کی دل کشی و دل چسپی کو دیکھتے هیں ! ٹائپ و لیتھو کو نہیں دیکھتے ! جب اِس وجہ سے مجبور هوکر کہ کافی ٹائپ اُن کے پاس نہ تھا ، مرحوم مولانا نے ، همدرد لیتھو میں چھاپنا شروع کیا ، تو خریداروں کی تعداد میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں هوا -

گورنمنٹ گزٹ ، سرکاری رپورٹیں اور اعلانات - ٹائپ میں شائع ہوتے ہیں ، یہاں تک کہ مسی اور سفینے ، گانو والوں اور کم پڑھے لکھے آدمیوں تک کے پاس ٹائپ کے چھپے ہوئے ہی جاتے ہیں - لوگ اُنہیں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے عادی کر دیے گئے ہیں -

لیتھو کے طرفدار اور اُس کے شیدائی اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ اردو نستعلیق میں لکھی جاتی ہے اور نستعلیق لیتھو میں ہی چھپ سکتا ہے - یہ صحیح ہے کہ اچھا نستعلیق ٹائپ اب تک نہیں بن سکا ' اور میرا خیال ہے کہ بن سکتا نہیں - اُس کے دائرے ، اُس کی نوک پلک ، اتنے جوڑ توڑ مانگتے ہیں کہ اُن کو ٹائپ میں ڈھالنا ، اور اُن ٹکڑوں کو محدود تعداد میں رکھنا تکلیف مالایطاق ہے - حامیان لیتھو کہتے ہیں کہ جب نستعلیق کا اچھا ٹائپ نہیں بن سکتا تو لامحالہ اردو ، نسخ میں چھاپی جائے گی - اور خوبصورت اور دیدہ زیب نستعلیق ، جس میں ہندوستان نے اِتنی ترقی کی ہے یک قلم معدوم ہو جائے گا -

یہ اعتراض صحیح ہے ؛ مگر فن خطاطی و خوشنویسی ، جو بجائے خود ایک فن لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت ہندوستان و ایران میں حاصل کر چکا تھا ، وہ کب کا رخصت ہو چکا ! لیتھو نے اُس کے گلے پر چھری پھیر دی ! یہ خیال غلط ہے کہ لیتھو سے خطاطی اور خوشنویسی قائم ہے - نستعلیق کی ایک بگڑی ہوئی شکل اب بھی موجود ہے - بس اِتنا ہے کہ خوشنویس یہ چاہتا ہے کہ اُس کا خط صاف پڑھا جا سکے - روزانہ اخباروں کی اشاعت ، کاتب سے جلد سے جلد لکھنے کا مطالبہ کرتی ہے ؛ ایسی حالت میں مطبع کا خوشنویس ، اُن مشہور خوشنویسوں کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے جو ایک ایک وصلی ، ایک ایک قطعہ لکھنے میں مہینوں لگا دیتے تھے ؛ اور جو اپنی اُنگلیاں نرم کرنے کے

لیے هندوں هاتھوں پر حلوا باندھتے تھے ! اب تو " کاتا اور لے دوڑی " پر عمل ہے ! علاوہ ازیں نستعلیق اپنی جگہ خوشنما ہے ' مگر نسخ ' اچھا نسخ کچھ کم دلربا نہیں - نسخ قدرتاً ٹائپ میں اچھا ڈھل سکتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اُن ممالک نے بھی جو نستعلیق استعمال کرتے تھے ' نسخ کو اختیار کر لیا - ایران میں تو نستعلیق پیدا ہی ہوا ; وہاں کے خطاط ' نستعلیق کے لکھنے میں جو کمال دکھا چکے ہیں وہ ہندوستان کے بہت کم خوشنویسوں کو نصیب ہوا - اور اب بھی اِس فن کے ماہر وہاں ملتے ہیں - بااینہمہ ایران نے نستعلیق کو چھوڑ کر اپنی کتابیں ' اپنے اخبارات تمام تر ٹائپ میں چھاپنے شروع کردیے ہیں - ایران کے بعد افغانستان کو دیکھیے ; یہ قدامت پسند ملک بھی ' طباعت میں جدت طراز و جدت آشنا ہے - وہاں بھی کتابیں اور رسالے نسخ ٹائپ ہی میں شائع ہوتے ہیں - میں نے دیکھا ہے ! وہاں کا مشہور رسالہ مجلۂ " کابل " عمدہ ٹائپ میں چھپتا ہے !

ترکی نے ٹائپ سب سے پہلے قبول کیا تھا - اور وہاں کا نسخ ٹائپ میری رائے میں تمام دوسرے ممالک کے ٹائپوں سے ' خوبصورت و خوشنما اور فن کے لحاظ سے مکمل تھا - ترکوں کا مذاق لطیف تر ہے ' حسن و زیبائی کا احساس (Aesthetic Sense) ہم سے زیادہ بڑھا ہوا ہے ' اسی لیے اُن کا ٹائپ بھی خوبصورت تھا - ہائے ! " اسٹنبول " کے حسین ٹائپ کے وہ حسین حروف ' نمعلوم اب کیا ہو گئے ہوں گے ؟ غالباً اُن کا سیسہ گلا کے ' رومن حروف ڈھال لیے ہوں گے ! کاش ! وہ خرید کر یہاں منگا لیا جاتا ! مجھے حیرت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سے صحیح المذاق آدمی نے الہلال اُسی ٹائپ میں چھاپا جو عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے - وہ اسٹنبول یا مصر کا ٹائپ منگا سکتے تھے -

ہمارا ٹائپ سب سے بدتر اور گرا ہوا ہے ! اگر یہاں کے لوگ اِس ٹائپ کو دیکھ کر، ٹائپ کے چھاپے کو ناپسند کریں اور لیتھو کو ترجیح دیں تو کوئی تعجب نہیں - رسالوں میں تصویروں کا رواج اب ہوچلا ہے، مگر ہوتا کیا ہے کہ علحدہ اوراق پر تصاویر بلاک سے چھاپی جاتی ہیں اور اُن کے نیچے عبارت ٹائپ میں ہوتی ہے، اور وہ رسالے کے اندر مختلف اوراق کے درمیان لگا دی جاتی ہیں - کسی صفحے پر جس پر لیتھو کی چھپی عبارت ہو عمدہ بلاک کی تصویر نہیں ہو سکتی -

یہ کوشش بےسود ہے کہ عمدہ نستعلیق ٹائپ ایجاد ہو ! سالہا سال سے "حیدرآباد" وغیرہ میں اِس پر روپیہ اور وقت ضائع کیا جارہا ہے- وہ محنت اگر نسخ کے ٹائپ کے رواج پر کی جاتی تو بار آور ہوتی !

مولانا سلیمان ندوی صاحب سے مجھے شکایت ہے کہ "معارف" اور دارالمصنفین کی کتابیں، وہ ٹائپ میں کیوں نہیں چھاپتے ؟ اِس تحریک کا سردار اُن کو ہونا چاہیے ! "جامعۂ ملیہ" دہلی کے مطبع میں جو ٹائپ ہے، میری رائے میں وہ اُس ٹائپ سے جس میں کہ "اکیڈیمی" کی مطبوعات اِس وقت چھپ رہی ہیں، بہت بہتر ہے - میرے خیال میں اکیڈیمی کا رسالہ اور تمام کتابیں، اِس ٹائپ میں چھپنی چاہییں -

حضرات ! ایک چیز جو بظاہر خفیف ہے، آپ کی توجہ کی مستحق ہے - ہماری مطبوعہ کتابوں میں، اعراب، زبر، زیر، پیش کا استعمال زیادہ ہونا چاہیے - ہمارے رسم‌الخط پر یہ الزام ہے کہ اُس میں جو عبارت لکھی جاتی ہے اُس کے صحیح پڑھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والا عبارت کے الفاظ کے صحیح تلفظ سے پہلے سے واقف ہو

ورنہ مُلک کو وہ مَـلَک ، مَلِـک ، اور مِلک پڑھ سکتا ھے - یہ اعتراض بالکل صحیح ھے اور اِسی کے رفع کرنے کے لیے اعراب ایجاد کیا گیا - مگر ھم نے اِس ضروری چیز کا استعمال بالکل چھوڑ رکھا ھے ، اور اِس کی وجہ سے اچھے پڑھے لکھے آدمی ، عبارت کے پڑھنے میں غلطیاں کرتے ھیں - میں یہ نہیں چاھتا کہ لفظ کے ھر حرف پر قرآن کریم کی آیتوں کی طرح اعراب لگائے جائیں - نہ اِس کی ضرورت ، نہ اِس کی مہلت ھے - مگر اُن حرفوں پر لگا دینے سے جنہیں تلفظ کی کنجی کہنا چاھیے ، عبارت کے صحیح پڑھنے میں بہت مدد ملے گی : مثلاً یہ فقرہ لیجیے ، " مولانا عبدالحق نے فرمایا " اِس میں " مولانا " پر کسی اعراب کی ضرورت نہیں ؛ " عبدالحق " میں " ع " پر زبر اور " د " پر پیش اور " ح " پر زبر کافی ھے ؛ یعنی ۱۳ حروف کے فقرے میں صرف تین جگہ اعراب لگانے کی ضرورت ھے - یا مثلاً " ھندوستانی " کی کتابوں کے اشتہارات میں چھپتا ھے ، سول ایجنسی کتابستان ، یہ Sole اور Civil بھی پڑھا جاسکتا ھے ، اب اگر " واو " پر ساکن کی علامت لگا دی جائے تو سُوْل ، سِوِل نہیں پڑھا جائے گا -

حضرات ! ایک اور خیال میں نے بار بار آپ کے سامنے پیش کیا ھے - جب " اکیڈیمی " قائم ھوئی اُس کی ابتدا ھی میں یعنی ۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء کو میں نے ایک رزولیوشن رومن حروف کے رواج دینے کے متعلق پیش کیا تھا - پھر گزشتہ سال لکھنئو میں ھندستانی اکیڈیمی کے اردو سیکشن میں اِس کے متعلق ایک مقالہ پڑھا ، اب پھر آپ کو بھکانے اور آپ کے درد سر کا باعث ھونے کے لیے میں اُسی راگ کو الاپتا ھوں !

لیکن اِس مرتبہ ، میری ھمت بڑھی ھوئی ھے ! ھندوستان کی اُس عظیم‌الشان جماعت کے صدر نے (جس کے ھاتھ میں اِس ملک کے

سات صوبوں کی حکومت کی باگ ھے) " ھری پورہ کانگرس " کے پلیٹ فارم سے اِس مسئلے پر اظہار خیال فرما کے ' اِس کی اھمیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا - " مسٹر سوبھاش بوس ' رومن حروف کے رواج کے حامی ھیں " یہ آواز تمام ملک میں گونج رھی ھے - اِس مسئلے پر جو اور آوازیں ' کمزور آوازیں ' کمزور آدمیوں کی طرف سے اُٹھتی تھیں ' اُن کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی تھی - لیکن جب ایک بڑے گرجا کے بڑے آرگن کی پر عظمت آواز سے وھی لے نکل رھی ھے تو مجھے یقین ھے کہ وہ عقیدت و احترام سے سنی جائے گی !

میں نے جو پارسال کہا تھا ' وھی اب بھی کہہ سکتا ھوں - صرف الفاظ بدل سکتا ھوں - اس لئے میں یہ مناسب سمجھتا ھوں کہ جو مقالہ میں نے پارسال پڑھا تھا ' اُس کو بطور ضمیمے یا تتمے کے اِس خطبے کے ساتھ شامل کردوں -

لیکن نہائت مختصر طور سے یہ عرض کردوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ " ترکی " کی طرح قانوناً " ھندوستانی " کا فارسی حروف یا ناگری حروف میں لکھنا بند کر دیا جائے ' اور ھر شخص مجبور کیا جائے کہ وہ " رومن " میں لکھے پڑھے - نہیں ' میری غرض یہ ھے کہ موجودہ فارسی خط اور ناگری خط جاری رھے ' مگر ساتھ ھی اِس کے رومن کو بھی رواج دینے کی کوشش کی جائے ' اور اردو و ھندی کی کتابیں اور اخبارات اِن حروف میں بھی چھاپے جائیں ' تا کہ ملک کے اُس طبقے تک جو ھندوستانی زبان بولتا اور سمجھتا ھے مگر بہ سبب اِس کے کہ فارسی رسم الخط اور ناگری رسم الخط سے نابلد ھے اُسے پڑھ نہیں سکتا ' ھمارے لٹریچر کی رسائی ھوسکے -

خاتمۂ کلام پر ' میں اردو اور ھندی کے ھمہ گیر اثر کے متعلق

عرض کرنا چاہتا ہوں - اِس میں تو کوئی کلام نہیں کہ وہ زبان جسے اردو کہئے یا ہندی ' یا صلح‌جویانہ طریقے سے ہندوستانی ' اِس ملک کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی ہے اور چھاتی جاتی ہے - لیکن میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں زبان کا بھی فیڈ ریشن (Foderation) ہوگا' لیکن یہ دو فیڈ ریشن ہوں گے - پنجاب ' سندھ ' صوبۂ سرحد ' اردو کے فیڈریشن میں شامل ہوں گے ' یہاں اردو حاکم اعلیٰ ہوگی - مقامی حکومت خود اختیاری ' پنجاب میں پنجابی کو ' سندھ میں سندھی کو ' صوبۂ سرحد میں پشتو کو دی جائے گی - بلوچستان کے متعلق میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا کہ آیا وہ اِس فیڈریشن میں شامل ہوگا یا نہیں -

دوسرا ' ہندی کا فیڈریشن ہوگا ' اِس میں ممالک متوسطہ ' مہاراشٹرا ' بمبئی ' شامل ہوں گے - ہمارا صوبہ اور بہار ہندی کے فیڈریشن میں ہوگا ' مگر اردو کا فیڈریشن یہاں حملہ آور رہے گا ' اور بہت ممکن ہے کہ یہاں لسانی طوائف‌الملوکی (Linguestic Anarchy) رہے - جس طرح بلوچستان کے متعلق میں کوئی رائے نہیں دے سکتا ' بنگال کے متعلق بھی میں نے کوئی رائے قائم نہیں کی -

بلوچستان کا اردو کے فیڈریشن میں شامل ہونا اس لیے مشتبہ ہے کہ وہاں زبان و لسان کے بارے میں کوئی احساس ' کوئی بیداری نہیں -

بنگال کی حالت اُس کے بالکل خلاف ہے ؛ وہاں خود داری کا احساس اِس قدر تیز ہے کہ بنگالی ' ہندی کے فیڈریشن میں شامل ہونا اپنی کسر شان سمجھے گا !

جنوبی ہند اِن دونوں فیڈریشنوں سے کلیتاً آزاد رہے گا - مسٹر

گویالا چاریا ' جنوبی ہند میں ہندی کی ترویج کی کوشش کر رہے ہیں ' مگر " اینٹی ہندی کانفرنس " کے قیام نے اُنہیں ثابت کر دیا ہوگا کہ وہ جنوبی ہند میں بہ جبر ہندی کو رواج نہیں دے سکتے - اِس کی وجہ یہ ہے کہ گو ہندو مذہب کی وجہ سے ' ہندو معاشرت کا اثر وہاں حاوی ہے اور سنسکرت لٹریچر ' وہاں عقیدت اور شوق سے پڑھا جاتا ہے ' لیکن چونکہ وہاں کی زبانیں " دراویڈین " ہیں ' وہ اپنے کو ہندی سے بالکل علحدہ اور دور پاتی ہیں - رسم الخط ' الفاظ ' گرامر ' ہر چیز علحدہ ہے !

صوبۂ سرحد کے اُس بدنام " اینٹی ہندی سرکلر " ہی کو لیجئے ' جس کی وجہ سے اخبارات کے سیکڑوں کالم سیاہ ہوئے اور سیکڑوں پروٹسٹ رزولیوشن پاس ہوئے - نتیجہ کیا ہوا ؟ سرحد میں نہ ہندی رہی نہ اردو ! وہاں کی اِسمبلی کے ایک نیشنلسٹ ممبر نے یہ رزولیوشن اسمبلی میں پیش کردیا ہے کہ وہاں کی مادری زبان پشتو ہے ' لہذا وہاں ذریعۂ تعلیم پشتو ہی ہو !

میں نے جو یہ کہا کہ صوبۂ سرحد ' پنجاب اور سندھ میں غالباً اردو کامیاب ہوگی ' یہ اِس بنا پر کہا کہ وہاں کے باشندے (میں اکثریت کا ذکر کر رہا ہوں) جس رسم الخط میں اپنی اپنی زبان پڑھتے لکھتے ہیں وہ وہی رسم الخط ہے جس میں اردو لکھی جاتی ہے ' علاوہ ازیں اُن کی زبانوں میں فارسی و عربی الفاظ اُسی نسبت سے شامل ہیں جس نسبت سے کہ اردو میں ' اِس لئے وہ اردو کو بمقابلہ ہندی کے اپنی زبان کے قریب تر پائیں گے-

اِسی بناپر صوبۂ متوسط ' برار ' بمبئی ' مہاراشٹرا کے لوگ ہندی کو اپنی زبان کے قریب تر پائیں گے -

فرض کہ ہر جگہ جہاں ہندی کامیاب ہوگی ' وہاں سمجھنا

چاھیے کہ اردو بھی کامیاب ھوگی ! اِسی طرح جہاں اردو نے گھر کرلیا ' وھاں ھندي بھی داخل ھوگئی ! مدراس کا رھنے والا جو تیلیگو یا تمارِي یا ملایالم بولتا ھے ' جب ھندي بولنے اور پڑھنے لگے گا تو کیا وہ اردو نہیں سمجھے گا ؟

میں نے آپ کا بہت وقت لیا ' لیکن میں نے سوچا کہ جب آپ نے موقع دیا ھے تو کیوں اُس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاؤں ! پھر ایسا موقع ھاتھ آئے نہ آئے - دل کی بھڑاس تو نکال لوں !

" انیس " جمع ھیں احباب ' درد دل کہدے
پھر التفات دل دوستاں رھے ' نہ رھے !

(ضمیمہ)

اردو ہندی کے لیے رومن حروف کا استعمال

یہ مسئلہ ہندوستانی اکیڈیمی کے سامنے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا جارہا - اِس سے قبل بھی سنہ ۱۹۲۸ع میں میں نے ' اکیڈیمی کی کونسل میں ایک رزولیوشن پیش کیا تھا کہ اکیڈیمی کے مطبوعات ' اردو ہندی کے علاوہ رومن حروف میں بھی چھاپے جایا کریں - اکیڈیمی نے اُس وقت اِس تجویز کو مسترد کردیا - لیکن تھوڑے ھی دنوں کے بعد یہ مسئلہ دوسرے مقامات پر با اثر شخصیتوں کی طرف سے اُٹھایا گیا ' اور پریس میں ' اور لیکچروں اور مقالات کے ذریعے پبلک کے سامنے کافی نمایاں شکل میں آیا -

ایک عرصے تک الہ‌آباد کے مقتدر اخبار لیڈر میں یہ بحث چھڑی رہی - اور پروفیسر سیشادری نے قابلیت کے ساتھ اور عالمانہ طریقے سے اُس کی حمایت میں مضامین لکھے - غالباً شانتی نکیتن میں بھی اِس کی تائید میں ایک مضمون پڑھا گیا ' گو وہ میری نظر سے نہیں گذرا - اور سب سے آخر میں جواہر لال نہرو کی سی محترم اور ہردلعزیز ہستی نے بھی اپنی سوانح عمری میں اِس پر اظہار خیال فرما کر اِس کی اہمیت کو دوبالا کر دیا -

اُس وقت کہ یہ مسئلہ اکیڈیمی کی کونسل کے حضور ایک کم سواد شخص کی طرف سے پیش ہوا تھا ' اُس کی ہنسی اُڑائی گئی تھی - لیکن میں امید کرتا ہوں کہ شائد اب کے ' یہ کانفرنس اِس پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائے -

میں ابتدا ہی میں یہ عرض کردوں کہ میں انتہا پسند مسلک کا پیرو نہیں ' اور شائد اِسی وجہ سے میں ازیں‌سو راندہ وزاں‌سو درماندہ ہوں ! اگر میں یہ کہتا کہ عربی اور دیوناگری حروف کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے ' اور بہ جبر رومن حروف کو رواج دیا جائے تو غالباً لوگ بھڑکتے ' اور شدت سے میری مخالفت کی جاتی اور جیسا کہ مخالفت کا اکثر نتیجہ ہوا کرتا ہے ' چلد شدید حمائت کرنے والے بھی مجھے مل جاتے - پہلی مرتبہ بھی میں نے صاف طور پر یہ کہدیا تھا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ عربی اور دیوناگری حروف میں کتابیں چھاپنا یک قلم موقوف کر دیا جائے ' اور اب بھی یہی کہتا ہوں -

اور صاف تو یوں ہے کہ ہمارے ملک میں خوش قسمتی سے یہ ممکن بھی نہیں - یہ باتیں تو وہیں ہو سکتی ہیں جہاں "ڈکٹیٹر شپ" ہے ' جہاں کسی آمر مطلق کا حکم چلتا ہے - ترکی اور سوویت روس میں اِس قسم کے احکام نافذ کیے جاسکتے ہیں اور کیے گئے ہیں - کم سے کم میں تو اِس قسم کی ڈکٹیٹر شپ کا ہندوستان کے لیے آرزومند نہیں - رسم‌الخط کی جنگ ' اِن صوبجات میں کم و بیش تیس پینتیس سال سے جاری ہے - رسم‌الخط کے ساتھ زبان کی جنگ بھی ہے - مگر یہ عربی حروف اور دیو ناگری حروف اور اردو زبان اور ہندی زبان کی جنگ تھی - میدان میں اب ایک چھوٹا سا پچھمت اور کود پڑا ہے - اور وہ رومن رسم‌الخط ہے - یہ توقع کرنا کہ عربی اور دیو ناگری حروف ' ہندوستان سے اٹھ جائیں گے ' یا اِسکی کوشش کرنا قطعاً بے سود ہے - دوبڑی قوموں کی معاشرت ' تہذیب وتمدن ' تاریخ و روایات کے یہ حروف حامل ہیں - جن قوموں کے پاس ایسی عظیم‌الشان ' ایسی روشن تاریخ و روایات نہ ہوں ' ایسا مالامال لٹریچر نہ ہو ' وہ آسانی سے زبان چھوڑ سکتی ہیں '

رسم‌الخط چھوڑ سکتی ھیں ' اپنی معاشرت چھوڑ سکتی ھیں - صحرائے افریقہ کے زولو اور بانٹو کو جو حروف چاھیے ' سکھا دیجیے ' جوزبان چاھیے اُس کی زبان قرار دے دیجیے ' گو وہ بھی بخوشی اپنی زبان چھوڑ نے پر تیار نہ ھوگا ' لیکن ھم کیسے چھوڑ دیں ؟ اور حقیقت یہ ھے کہ جب تک قرآن کریم عربی حروف میں ' اور وید مقدس دیوناگری حروف میں محفوظ ھیں ' کسی کے گوشۂ دماغ میں بھی اِس خیال کا گزر نہیں ھو سکتا - دیوناگری اور عربی حروف قدیم تہذیب و تمدن کی یادگار ھیں - اور اپنی اپنی جگہ پر انسانی ارتقا کا اعلیٰ نمونہ ھیں - وہ انسانی آواز کو مقید اور ظاھر کرنے کے ایسے ھی عجیب اور مکمل طریقے ھیں جیسا کہ رومن حروف - مکمل اور بے عیب رسم‌الخط ' نہ عربی حروف ھیں نہ دیونا گری اور نہ رومن ! اِن تینوں میں اِن کی مخصوص خوبیاں اور مخصوص عیوب ھیں -

ناگری رسم‌الخط ' بشرطیکہ تمام ماتروں کے ساتھ لکھا جائے ' آسانی سے پڑھا جاتا ھے - اُس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ پڑھنے والا تحریر شدہ لفظ کو پہلے سے جانتا ھو تو صحیح پڑھ سکے - مگر وہ بہت دیر میں لکھا جاتا ھے - برخلاف اِس کے عربی رسم‌الخط مختصر نویسی کا ایک عمدہ نمونہ ھے - یہ مختصر نویسی اُس وقت سے صدیوں پہلے ایجاد ھوئی جب کہ پٹمین (Pitman) کے دماغ میں " شارٹ ھینڈ " کا خیال پیدا ھوا - مگر اُس کے الفاظ کو صحیح پڑھنے کے لیے اُن الفاظ کا تلفظ پہلے سے جاننا ضروری ھے - اعراب اِس عیب کو دور کردیتے ھیں ' مگر اعراب سے اِس خط کی زودنویسی میں فرق آجاتا ھے - اِن دونوں رسم‌الخطوں کی قصیدہ خوانی کے بعد بھی اگر میں رومن رسم‌الخط کی حمایت کرتا ھوں تو کیوں ؟ اِس لیے کہ موجودہ حالات میں ھندوستانی زبان کی ترویج کا یہ بہترین ذریعہ ھے !

اسلام جہاں گیا ، اپنے حروف ساتھ لیتا گیا - جس ملک کو اُس نے فتح کیا ، یا جہاں وہ پہیلا وہاں کی زبان پر اُس نے گہرا اثر ڈالا - بعض ملکوں نے تو اسلام کے ساتھ عربی زبان کو بھی اختیار کر لیا جیسے کہ مصر و شمالی افریقہ - اکثر نے حروف ضرور لیے ، ایران ، افغانستان ، سندھ ، بلوچستان ، کردستان ، ترکستان اور غالباً جاوا ، سماترا ، وہ ممالک ہیں جنھوں نے اپنی زبان تو نہ چھوڑی ، لیکن مذہب کے ساتھ عربی رسم الخط کو اختیار کر لیا - شاید چین ہی وہ ملک ہے جہاں عربی رسم الخط نے وہاں کے مسلمانوں میں رواج نہ پایا -

ہندوستان کی آرین قوم نے اپنے مفتوحہ ممالک نیز اُن میں جو اُس کے زیر اثر آئے اپنے رسم الخط کو ملوا لیا - اِس براعظم کے مختلف صوبوں میں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک اقلیم ہے ، رسم الخط دیوناگری یا اُس کی ترمیم شدہ شکل کا ایک رسم الخط ہو گیا - جنوبی ہند کی زبانوں ، لٹریچر اور مختلف رسم الخطوں نے بھی اِس قومی اثر کو محسوس اور قبول کیا - تیلیگو اور کناری خطوں نے اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھی ، لیکن دیوناگری رسم الخط کا اثر اُن میں بھی نمایاں ہے -

اب اِس وقت ایک اور رسم الخط کا ہمہ گیر اثر تمام براعظم ہند پر طاری ہے - یہ رسم الخط رومن رسم الخط ہے - بنگالی ، سندھی ، پشتو ، تلنگی ، کناری ، گجراتی ، مرہٹی بولنے والا اپنی زبان اپنے حروف میں پڑھتا ہے ، لیکن اُس کا تعلیم یافتہ طبقہ ، روز افزوں تعداد میں رومن حروف سے لا محالہ واقفیت پیدا کرتا ہے - ہندوستانی زبان کی رسائی اِس طبقے تک ، رومن حروف کے واسطے سے نہایت آسان ہوگی - بمبئی کے پارسی ، اور اُس پریسیڈنسی کے اور شہروں کے رہنے

والے' کلکتے اور بنگال کے بڑے شہروں کے باشندے' ہندوستانی زبان سے' جس طرح کہ وہ عام‌طور پر بولی جاتی ہے عموماً واقف ہوتے ہیں - علاوہ ازیں ہندی بھجن اور ٹھمریاں ' اور اردو غزلیں ہندوستانی زبان کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلاتی ہیں - مگر بمبئی اور بنگال اور دوسرے صوبوں کے ہندوستانی سمجھنے والے لوگ دیوناگری یا عربی رسم‌الخط نہیں جانتے اور اِس لیے عموماً اردو ہندی کے اخبار اور کتاب نہیں پڑھ سکتے - انگریزی دانی کے " عالم شمول " اثر کی وجہ سے اُنھیں رومن حروف سے عموماً واقفیت ہوتی ہے - اُن سے یہ توقع کرنا تو زیادتی ہوگی کہ وہ عربی یا دیوناگری حروف سیکھیں لیکن اگر رومن حروف میں کتابیں چھپی ہوں تو وہ بلا کسی محنت و مشقت کے اُنھیں پڑھ سکیں گے - ایک زمانہ تھا کہ انگریز ہندوستانی زبان اور اُس کے لٹریچر سے اچھی طرح شناسا تھے - یہاں تک کہ اُن میں سے بعض ذہین اور طبّاع حضرات تو شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے - چنانچہ اردو کے تذکروں میں ایسے یوروپین حضرات کے نام بھی ملتے ہیں جو اردو میں اچھی نظم و نثر لکھنے پر قادر تھے - لیکن غدر کے بعد سے جو ہندوستانیوں سے خلا ملا کی پالیسی یکقلم موقوف کردی گئی اور رعایا پر رعب اور سفید نسل کی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کے لیے اُن سے کامل علحدگی اختیار کی گئی ' اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبان اور لٹریچر کا پڑھنا انگریزوں میں کم ہو گیا - گو اِس ملک میں رہنے کی وجہ سے زندگی کی ضروریات اُنھیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ اہل ملک کی زبان نوکروں کے ذریعے سے ہی سیکھیں - اِس طبقے کے لیے بھی ہندوستانی کتابوں کا رومن میں چھپنا مفید ہوگا -

رومن حروف کا رواج بغیر کسی با قاعدہ رزولیوشن کے پاس کرنے

شکریہ

از

عالی جناب ڈاکٹر تاراچند، ایم اے - ڈی فل - (آکسن) -

جنرل سکریٹری، ہندستانی اکیڈیمی،

یوپی - الہ آباد -

شکریہ

٭[از جناب ڈاکٹر تاراچند ' ایم اے ' ڈی فل ' آکسن]٭

اِس سال ھندستانی اکیڈیمی کے جنم کے دس برس پورے ھوئے ھیں - اِن برسوں میں اکیڈیمی نے کہاں تک اپنے مقصدوں کو پورا کیا ؟ کس حد تک ھندی اور اُردو بھاشا کی سیوا کی ؟ پرانے ساھتیہ کی رکھشا اور نئے ساھتیہ کی رچنا کے لیے کیا کیا یتن کیے ؟ یہاں اِن سب باتوں کا تھوڑا برنن ساھتیہ کے گاھکوں کے جاننے کے لیے ضروری ھے -

اکیڈیمی کے سامنے جو کام ھے اُس کی کٹھنائی وھی لوگ بھلی بھانت جان سکتے ھیں جنھیں اِس طرح کے کام کا کچھ تجربہ ھے - ساھتیہ ایسی چیز تو ھے نہیں کہ اُسے مشین میں ڈھال کر ترت تیار کر لیا جائے - ساھتیہ نہ روپیہ کے زور سے ' نہ نام کے لالچ سے بن سکتا ھے - اور نہ یہ ممکن ھے کہ مدرسوں اور پاٹ شالاؤں میں ساھتیہ کے رچنے والے کاریگروں کی طرح سکھا پڑھا لیے جائیں - ساھتیہ کی روح اپنی اِچھا سے جہاں چاھتی ھے بچرتی ھے - من مانے آتی اور جاتی ھے - نہ اُسے کوئی طاقت پکڑ سکتی ھے نہ کوئی بندھن باندھ سکتا ھے - کس دیس میں ' کس سمے ' کیوں ساھتیہ کے بادشاہ پیدا ھوتے ھیں ' اِس کا نہ کوئی قاعدہ معلوم ھوتا ھے نہ قانون - چودھویں ' پندرھویں صدی میں اٹلی کے سماج کی حالت بہت گری ھوئی تھی - لیکن ساھتیہ آسمان کی چوٹیوں سے باتیں کرتا تھا - "ڈانٹے" "پٹرارک" "ایریو آسٹو" "بکاچو" نے اطالوی بھاشا کا

ماتھا اونچا کیا تھا - اٹھارھویں صدی کے اخیر اور انیسویں کے شروع میں ھندستان کی حالت کہنے کے لائق نہ تھی - لیکن اِسی اندھیرے زمانے میں میر و غالب سریکھے کوی پھل پھولے - اٹھارھویں صدی انگلستان کی تاریخ میں وہ زمانہ ھے جس میں سمندروں اور مہادیپوں پر اُس کا سامراج قائم ھوا - لیکن اِسی صدی کا انگریزی ساھتیہ بالکل ھی روکھا اور پھیکا ھے -

اِس سے یہ نتیجہ نکلنا کہ اکیڈیمی ایک بیرتھ سنستھا ھے ٹھیک نہیں - کیونکہ اگر کوی ، ناٹک کار ، ناول لکھنے والے ، بنائے سے نہیں بنتے ؛ قدرت کی اپنی مرضی سے پیدا ھوتے ھیں ؛ تو اِس کا ارتھ یہ نہیں کہ فلسفہ (درشن) ، اتیہاس (تاریخ) ، سماج وگیان (مدنیات و سیاسیات) ، جوتش (نجوم) ، گنت (ریاضیات) ، جیسے انیک شاستروں پر کتابیں لکھنے والے پیدا نہیں ھو سکتے - یہ ضرور ھے کہ اِن وشیوں پر اچھے لیکھک آسانی سے نہیں مل سکتے - کیونکہ ابھی تک ھمارے دیس میں اپنی بھاشا میں اونچے درجے کی سکچھا نہیں ھوتی- اور علم کی کتابوں کے پڑھنے والوں کی بہت کمی ھے- لیکن ایسی کتابوں کو تیار کرانا اور اس طرف لوگوں کی رچ موڑنا اکیڈیمی جیسی سنستھاؤں کا کام ھے-

یہ کتابیں کئی طرح کی ھوسکتی ھیں - کچھ تو انگریزی یادوسری بھاشاؤں سے ترجمہ کر کے ، کچھ انگریزی کتابوں کے سہارے لکھ کر ، اور کچھ سرے سے نئے اور مولک ڈھنگ پر تیار کی جا سکتی ھیں - ھندستانی اکیڈیمی نے پچھلے دس برس میں اِنہیں طریقوں پر کام کیا ھے - اور ساھتیہ یعنی ادب کی چھ ، جیون چرتر (ادبی سوانح عمری) کی پانچ ، پرانے ساھتیہ کی نو ، اتیہاس (تاریخ) کی تیرہ ، اور اتیہاس کے نیتاؤں (تاریخی رھنماؤں) پر پانچ ، وگیان کی چھ ، کاریگری کی

فین اور درشن (فلسفے) پر چار ' سماج وگیان پر آٹھ ' اور چترکلا (مصوری
پر دو ' هندی اور اردو کی کتابوں کی جانچ پر دو ' کل جوڑ کر (۸۱
کتابیں چھپوائی هیں -

ساهتیه یا ادب کی آٹھ اور وگیان کی دو کتابوں کا ترجمه اِس
علاوہ ہے -

ساهتیه کی طرف لکھنے والوں کا دھیان دلانے کے لیے " تینتیس
انعام پانچ پانچ سو روپے کے اور " آٹھ " سو سو روپے کے بانٹے هیں - اپنے وقت
کے پنڈتوں اور عالموں سے لکچر دلوائے هیں - اور کانفرنسوں میں هندی ا
اردو سے دل‌چسپی رکھنے والوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے - اور ا
جلسوں میں بھاشا (زبان) اور ساهتیه (ادب) کے بڑے بڑے سوالوں پر وچ
هوا ہے - هندستان بھر میں اپنی بھاشا اور اپنے ساهتیه کی انّت کے لـ
بڑے زور کی کوشش هو رهی ہے - اِس میں هندستانی اکیڈیمی نے جو بھاگ
لیا ہے وہ سراهنے یوگ ہے - اکیڈیمی نے نه کیول گیان کے بھنڈار میں اچ
اضافه کیا ہے ' اِس نے اُن رکاوٹوں کی طرف کے دھیان دلایا ہے جو همارے آ
بڑھنے کے راستے میں بادھا ڈال رهی هیں -

اُن میں سے دو تین کا ذکر کردینا انچت نہیں هو گا
پہلی کٹھنائی جس کا سامنا کرنا ہے ' وہ هندی اور اردو لپی ی
رسم‌الخط سے سمبندھ رکھتی ہے - یه وچار دن پر دن پھیلتا جاتا ہے ؛
هندی اور اردو ایک هی طرح لکھی جائیں ' تو اِس سے دیس کی بہت
بھلائی هوگی - دیس کے نیتاؤں میں کئی نے یه خیال ظاهر کیا ہے ؛
ناگری اور عربی خطوں کی جگه رومن خط اختیار کرلینا چاهیے - اِس
میں فائدے بہت سے هیں - لکھنے اور چھاپنے کے لیے رومن لپی اردو
سے کہیں اچھی ہے - اِس میں ورن تھوڑے هیں - اس لیے بچوں کو سیکھنا

میں آسانی ہے - دنیا کی سبھی اگوا قومیں رومن کا استعمال کرتی ہیں - ایشیا میں ترکوں نے اسے اپنایا ہے اور جاپان میں یتن ہو رہا ہے کہ رومن لپی جاپانی کی جگہ لے لے - ہندستان میں رومن کے چھبیس ورنوں سے آسانی سے کام نہیں چل سکتا ' اس لیے اس میں کانٹ چھانٹ کرنی پڑے گی - اور ورن بڑھانے ہوں گے - اس پر بھی بہت سے لوگ اپنی پرانی جانی بوجھی لپیوں کو چھوڑنا پسند نہیں کریں گے - اس میں بہت سے تو لکیر کے فقیر ہیں - لیکن بہت سے سچ مچ ناگری کو اور لپیوں کے مقابلے میں زیادہ ویگیانک سمجھتے ہیں -

یدی ہم ابھی اس بات کے لیے تیار نہیں کہ بالکل نئی لپی کو سویکار کر لیں ' تو بھی ہمیں ناگری اور اردو کے سدھار کی کوشش کرنی چاہیے - ناگری کے لکھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ سمے ادھک لگتا ہے اور اس کے چھاپنے میں بڑی کٹھنائیاں ہیں - اس میں کئی ورن ہماری بولی کے لیے فضول ہیں ' جیسے ङ (ناں) ' یاں ' ष (کھ یا ش) ' رِ ' لرِ ؛ اور کئی ضروری سو اور ونجن نہیں ہیں ' جیسے آو ' اور اَے ' قَ ' خَ ' غَ ' وغیرہ -

اردو رسم الخط میں اور بھی زیادہ دوش ہیں - ث ' س اور ص کے لیے ہمارے گلے سے ایک ہی آواز نکلتی ہے ؛ اسی طرح ز اور ذ اور ض کے لیے ' اور ت اور ط کے لیے ورنوں کی بہتایت سیکھنے والوں کی دقتوں کو بڑھاتی ہے - اردو کا املا جیسا کٹھن اور بے قاعدہ ہے اسے سبھی جانتے ہیں - لپی ایسی ہونی چاہیے ' جس میں ایک ورن ایک آواز کے لیے نیت ہو - نہ کئی آوازوں کے لیے ایک ورن اور نہ ایک آواز کے لیے کئی ورن ہوں - ناگری اور اردو دونوں کو ہی اس طرف دھیان دینا اچت ہے -

اردو لپی کی بڑی خرابی یہ ہے کہ لکھی تو جاتی ہے نستعلیق طرز میں اور جب سیسے کے حرفوں میں چھپتی ہے تو نسخ کے طرز

میں - بہت سے لوگ جن کی آنکھیں نستعلیق کی عادی ہیں ' نسخ کو پسند نہیں کرتے - اِسی وجہ سے پرانی پتھر کی چھپائی ابھی تک جاری ہے ' اور اردو کو نہ لائنو ٹائپ نصیب ہے اور نہ اور چھاپے کی سوبیدھائیں - نتیجہ یہ ہے کہ بڑی تعداد میں اردو کی چیزوں کا چھاپنا اور سستے داموں بیچنا اسمبھو سا ہے - اِس حالت پر غور کرنے کی ضرورت ہے -

دوسرا پرشن املا کا ہے - ہندی اور اردو دونوں میں حرفوں کے جوڑنے اور استعمال کرنے کے بارے میں مت بھید ہے - سنسکرت سے جو شبد آئے ہیں اُنہیں جیوں کا تیوں رکھا جائے ' یا اُس طرح جیسے وے اب بولے جاتے ہیں - ناک سے نکلنے والی آواز کے لیے سنسکرت میں پانچ چھے حرف ہیں ' ہندی میں اُن سب کی ضرورت نہیں - رام لکھنا ہو تو "آ" کی ماترا ' را کے بعد لگتی ہے ؛ اور رِم لکھنا ہو ' "اِ" کی ماترا ' را سے پہلے آتی ہے - ریف کا بھی جھگڑا ہے ' بھرم میں بہ رِ نیچے اور مرم میں م کے اوپر ' یہ ایسی کٹھنائیاں ہیں جن کے سلجھانے کی ضرورت ہے -

اردو کے املا کا حال اور بھی بے ڈھب ہے - عربی کے شبد عربی کے طریقے پر ' فارسی کے مطابق ' اور ہندستانی ہندی ڈھنگ پر لکھے جاتے ہیں - لیکن تلفظ (اُچارن) سب کا ہندستانی ہے ' اور اِس کارن عربی فارسی سے انجان لوگوں کے لیے اُن کے ہجے کرنے میں بڑی کٹھنائی ہوتی ہے - بہت سے ہندی شبد بھی فارسی ڈھنگ پر لکھے جاتے ہیں - اردو کے پھیلاؤ کے لیے یہ بڑی رکاوٹ ہے - سب جانتے ہیں کہ امریکا میں انگریزی کے املا کے سدھار کی کوشش ہو رہی ہے - کتنا اچھا ہوتا کہ ہم بھی اِس طرف توجہ دیتے -

تیسرا سوال زبان کا ہے - کئی سال سے اِس پر بحث جاری ہے -

تھوڑے دن ھوئے "بہار" کی سرکار نے ایک کمیٹی اِس پر غور کرنے کے لیے نیت کی ہے - سوال بڑے مہتّو کا ہے - کیوں‌کہ اِس کے ٹھیک ٹھیک حل ہونے پر ہماری شکشا کا بھوش منحصر ہے - اِس سوال کے کئی پہلو ہیں - اِن میں سے ایک اصطلاحوں (پاربھاشک) کا ہے - ہندی اور اردو کی وگیان کی پستکوں کے لیے الگ الگ پاربھاشک شبد (اصطلاحیں) گھڑے جائیں یا ایک سمان ؟ پرشن کٹھن ہے ' لیکن نیا نہیں - دنیا کی اور زبانوں کے سامنے بھی یہ اُٹھ چکا ہے - جن ملکوں میں سمجھ‌دار اور ودوان جاتیں ہیں اُنھوں نے دوسری زبانوں سے اصطلاحوں کے لیے مادے لیے اور اُنھیں سودیشی سانچوں میں ڈھالا - مثال کے طور پر انگریزی ہے - اِس کی اصطلاحوں کا سوتا لاطینی اور یونانی بھاشائیں ہیں - مگر اِن زبانوں کے لفظوں کو ٹھونک پیٹ کر انگریزی بنا لیا ہے - یہی حال یورپ کی دوسری بھاشاؤں کا ہے !

ایشیا کی زبانوں کا اتیہاس کچھ انوکھا ہے - عربی نے سیرین اور یونانی سے پار بھاشک شبد لیے - عربی : سمیٹک اور یونانی آرتھن ہے - لیکن عربوں نے اِس کا کچھ خیال نہ کیا - جب پرانی پہلوی کی جگہ فارسی نے لی تو کچھ ہی عرصے میں مسلمانوں نے ایران فتح کر لیا - فارسی پر جو آری بھاشا ہے عربی کا رنگ چڑھنے لگا - فردوسی نے کوشش کی کہ اِس جھکاو کو روکے - اُس نے عربی کی جگہ ٹھیٹ فارسی کی اصطلاحوں کا استعمال کیا - جیسے

مادہ (عربی)	سرمایہ
عنصر	گوھر
سکون	آرام
دوران	گشت

فنا	تباہی
وجود	توانائی
حرکت	جنبش
متحرک بالارادہ	پوئندہ
تغیر	فرسودن

افسوس ہے کہ فردوسی کی کوشش نہ‌پھل ثابت ہوئی - لیکن ہزار برس پیچھے آج ایران اور ترکی میں فردوسی کی نیت پر ہی اصطلاحوں کا چلاو ہو رہا ہے -

ہندوستان میں کئی بار ایسی گھٹنائیں ہوئی ہیں - جب بدھ نے اپنا مت چلایا ' تو اس نے سنسکرت چھوڑ عام لوگوں کی بولی کو پرچار کا ذریعہ ٹھہرایا - اس کے چیلوں نے اسی بولی میں درشن اور دھرم کی پستکیں رچیں - ان کی اصطلاحیں سنسکرت کی نہیں - پالی بھاشا کی ہیں' جیسے -

दुग्गल	(Soul)
अत्तन	(Soul)
धम्म	(धर्म)
सरंवार	(संस्कार)
कम्म	(Action)
कप्प	(Cycle)
मेत्ता	(friendship)
फस्स	(Contact)
सञ्ञा	(Perception)

तन्हा	(तृष्णा)
वितक्का	(Attention)
पीति	(Pleasureable anticipation)
छन्द	(Desire)
विन्नान	(Cognition)

اِسی طرح جینیوں نے ابھیدھرم اور کیمبر اور سنت مارگ والوں نے بول چال کی بھاشا سے پاربھاشک شبد لیے - جب غدر بعد بہار اور اُتری ہندوستان میں نیچے ' بیچ کے اور اونچے درجے کی سکچھا کا بندوبست ہونے لگا اور بیچ کے درجے کی کتابوں کی دیس کی بولی میں ضرورت ہوئی تو سوال اصطلاحوں کا اُٹھا - راجہ شیو پرشاد نے تاریخ کی ایسی کتابیں لکھیں جو سب پڑھ سکیں اور جن کی زبان ایک ہو - اُنہوں نے اِن کتابوں کے آرمبھ میں کیول ۲۴ یا ۲۵ شبدوں کی فہرست لگادی جو اردو اور ہندی میں الگ الگ تھے - مرزا قتیل نے منطق (ترک) کی اصطلاحیں بنائیں ' اُن کا نمونہ یہ ہے -

Judgment	تصدیق	جیوں کا تیوں
Object	محصول	پھیرپھیر
Negative	سالبہ	پورا توڑ
Absolute General and Particular	عموم و خصوص مطلق	اکہری اونچ نیچ
Term	حد	اصل اصل
Subject	موضوع علم	ٹھکانا
	خاصہ	اپنا اپنا کام

بول	موضوع	Subject
پورا جوڑ	موجبہ	
اچھوتی	جزئی	Particular
دھری اونچ نیچ	عموم و خصوص من وجہ	
باھر باھر	وسم	
مراد کا گھر	معنی	Import
وہ اور وہ اور	تباین	Difference

اِس طرح کی اور بھی کوششیں ہوئیں ' لیکن سپھل نہیں ہوئیں - نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اپنی بھاشا کے ' شکشا انگریزی کے ذریعے ہونے لگی - بیسویں صدی کے شروع سے سدیشی اندولن نے اِس طرف پھر زور سے دھیان دلایا ہے - اِس سمے راشٹریتا کی لہر ویگ کے ساتھ بڑھ رہی ہے - اور ہندوستانی بھاشاؤں کو اونچی سی اونچی شکشا کا ذریعہ بنانے کا جتن ہورہا ہے - ایسے اوسر پر ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے کہ بدھم ' کبیر ' اور مرزا قتیل کے راستے پر چلیں یا مذہبی اور سماجی کانٹوں میں اُلجھ کر رہ جائیں - اور ساھتیہ ' درشن اور وگیان کے امنڈتے دریا کو دو الگ الگ دھاراؤں میں بانٹ کر دھیما اور کمزور کردیں - اِن اور ایسے ہی اور پرشنوں پر وچار کرنے کے لیے یہ کانفرنس ہو رہی ہے - مجھے آشا ہے کہ رائٹ آنریبل سرتیج بہادر سپرو جن کے گیان ' اِن بھلو ' اور وِیویک کے لیے ہمارے دلوں میں بڑی شردھا ہے ' ہمارے وچاروں کو اچھے راستے پر ڈالیں گے - ہم سب اُن کے آبھاری ہیں کہ اُنھوں نے کاموں میں پھنسے ہونے پر بھی کانفرنس کے لیے سمے نکالا - میں آپ سب کی طرف سے اُن کو دھنیاد کہتا ہوں - راؤراجا پنڈت شیام‌بہاری مسر سدا ہی ہندوستانی اکیڈیمی کی تن من سے سہایتا کرتے رہتے ہیں ' اِس سمے

جب اور سب سجنوں نے انکار کردیا آپ نے سبھاپتی کا پد سوئیکار کر ہمیں بادھت کیا - مسٹر سجاد حیدر سے اکیڈیمی کے سب ممبر اور اردو سے پریم رکھنے والے سجن خوب پرچت ہیں - آپ کا اردو کے لیکھکوں میں بڑا نام ہے - ہماری دعوت قبول کر کے آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے اُسے ہم نہیں بھول سکتے - آپ کی صدارت میں امید ہے ہمارا جلسہ کامیاب ہوگا -

---

ذهنی اور سیاسی انقلاب کا پیغامبر

"کلیم"

ماہانہ ، دہلی

زیرِ ادارت جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ :—

(۱) آپ کے وطنِ عزیز کو پنڈتوں اور ملاؤں کے فساد سے نجات مل جائے -

(۲) تقلید و رسوم کی عمارت پر حریتِ فکر و آزادیِ خیال کا پھریرا لہرانے لگے -

(۳) ہندو مسلم "انسان" بنکر ، اپنے اتحاد کے ذریعے سے ، ایک زندہ ہندستانی قومیت کی بنیاد ڈال دیں -

(۴) اور ہندستان ، غلامی کے طوقِ لعنت کو ، جس سے شیطان تک پناہ مانگتا ہے ، اپنی گردن سے اُتار کر پھینک دے

تو

پہلی فرصت میں "کلیم" کے خریدار بن جائیے

مقامِ اشاعت :

نمبر ۴ ، دریاگنج دہلی -

چند نئی کتابیں

دلی کا سنبھالا :—از خواجہ محمد شفیع دہلوی- مرحوم دهلی کے ایام عروج کی وقائع نگاری دهلی کی اس ٹکسالی زبان کی گئی هے جواب نابود هے - اندازبیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار هو جاتا هے - قیمت ۱ روپیہ -

لطائف غالب :—از مسز ایم - اے شاہ - مرزا اسداللہ خاں غالب کی شوخی بیان ، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ هونے کے لیے اسے ضرور پڑھیے - قیمت ۳ آنہ -

شعلۂ طور :—" طبع ثانی " حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ بالکل نئی ترتیب - بہت کچھ تازہ کلام کا اضافہ - قیمت بھی کم کر دی گئی یعنی ۳ روپیہ کے بجاے ۲ روپیہ ۸ آنہ -

سبد چین :—مرزا اسداللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں اُن کے وہ فارسی قطعات ، ترجیع بند ، ترکیب بند ، مثنویاں ، نظمیں ، غزلیں اور رباعیات شامل هیں جو اُن کی کلیات میں موجود نہیں هیں ، مع مکمل سوانح حیات - قیمت ۱۲ آنہ -

ذکر غالب :—مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستندترین سوانح عمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی هیں اور جو طلبا کے لیے خاص کر بہت مفید هے - قیمت ۸ آنہ -

قرآن کیا هے اور اُس نے کیا کر دکھایا :—از عبدالواحد صاحب سندهی استاد جامعہ - بچوں کی نفسیات ، شعور اور استعداد کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئی هے - مسلمان بچوں کے لیے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی - قیمت ۲ آنہ -

دلی :—بچوں کے لیے دهلی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جس کے پردے میں دهلی کی مختصر تاریخ پیش کی گئی هے - بلاک کی چھ تصاویر اور دو نقشے - بہت مفید کتاب هے - قیمت ۳ آنہ -

مکتبۂ جامعہ ، دهلی - نئی دهلی - لاهور -

ہندستانی اکیڈیمی (صوبۂ متحدہ) الہ آباد

کے مطبوعات

۱—از منۂ وسطیٰ میں ہندستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات -
از علامہ عبداللہ بن یوسف علی ' ایم - اے ' - ایل ایل ایم '
سی - بی - اے ' مجلد ۱ روپیہ ۴ آنہ - غیر مجلد ۱ روپیہ -

۲—اُردو سروے رپورٹ—از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب
ایم - اے - ۱ روپیہ -

۳—عرب و ہند کے تعلقات - از مولانا سید سلیمان ندوی - ۴ روپیہ -

۴—ناتن (جرمن ڈراما) مترجمۂ مولانا محمد نعیم الرحمان صاحب -
ایم - اے ' ایم - آر ' اے - ایس - ۲ روپیہ ۸ آنہ -

۵—فریبِ عمل (ڈراما) مترجمۂ بابو جگت موہن لال صاحب '
رواں - ۲ روپیہ -

۶—کبیر صاحب - مرتبۂ پنڈت منوہر لال زتشی - ۲ روپیہ -

۷—قرونِ وسطیٰ کا ہندستانی تمدن - از رائے بہادر مہا مہو اُپادھیا
پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا ' مترجمۂ منشی پریم چند -
قیمت ۴ روپیہ -

۸—ہندی شاعری - از ڈاکٹر اعظم کریوی - قیمت ۲ روپیہ -

۹—ترقیِ زراعت - از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب '
ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت - قیمت ۴ روپیہ -

۱۰—عالمِ حیوانی - از بابو برجیش بہادر ' بی - اے ' ایل ایل بی -
۶ روپیہ ۸ آنہ -

۱۱—معاشیات پر لکچر - از ڈاکٹر ذاکر حسین ' ایم - اے ' پی ایچ - ڈی -
مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۱ روپیہ -

۱۲—فلسفۂ نفس - از سید ضامن حسین نقوی - قیمت مجلد
۱ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۱ روپیہ -

۱۳—مہاراجہ رنجیت سنگھ - از پروفیسر سیتا رام کوہلی ' ایم اے - قیمت مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۳ روپیہ -

۱۴—جواہر سخن - جلد اول - مرتبہ مولانا کیفی چریا کوٹی - قیمت مجلد ۵ روپیہ ' غیر مجلد ۴ روپیہ ۸ آنہ -

۱۵—علم باغبانی - از مسٹر وصی اللہ خاں - ایل - اے - جی - قیمت مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۲ روپیہ -

۱۶—انقلاب روس - از کشن پرشاد کول - ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ - قیمت مجلد ۳ روپیہ' غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ -

۱۷—چلد دکھلی پہیلیاں - از محمد نعیم الرحمان ' ایم - اے ' استاد عربی و فارسی ' الہ آباد یونی ورسٹی - قیمت ۱ روپیہ ۴ آنہ -

۱۸—تاریخ فلسفۂ سیاسیات - از محمد مجیب ' بی - اے (اکسن) جامعۂ ملیۂ اسلامیہ - دہلی - قیمت مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ غیر مجلد ۳ روپیہ -

۱۹—انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ - از علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب - قیمت مجلد ۴ روپیہ ' غیر مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ .

۲۰—فلسفۂ جمال - از ریاض الحسن صاحب - ایم - اے - قیمت ۱ روپیہ -

۲۱—دیوان بیدار - از جلیل احمد قدوائی صاحب - ام - اے - قیمت مجلد ۲ روپیہ ' غیر مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ -

۲۲—نفسیات فاسدہ - از معتقد ولی الرحمان صاحب' ایم - اے - قیمت مجلد ۸ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۸ روپیہ -

۲۳—سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق - از پروفیسر آغا مہدی حسین ' ایم-اے ' پی ' ایچ-ڈی ' ڈی-لٹ - قیمت مجلد ۳ روپیہ ' غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ -

سول ایجنٹ کتابستان ' الہ آباد -

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کے مقاصد

۱— اُردو اور ہندی ادب کی حفاظت اور اُن کی ترقی اور نشو و نما کی کوشش کرنا۔

(الف)— مختلف مضامین کے مطبوعات میں سے منظور شدہ کتابوں پر اِنعام دینا۔

(ب)— معاوضے وغیرہ کے ذریعے غیر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرانا اور اُن کو شائع کرنا۔

(ج)— یونیورسٹیوں اور علمی اِداروں میں وظائف دے کر یا دوسرے ذرائع سے ہندی اور اُردو زبانوں میں تصنیف یا ترجمے کے کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(د)— اکیڈیمی کے محسنین کو اعزازی فیلو منتخب کرنا۔

(ہ)— ایک کتب خانہ قائم کرنا اور اس کا انتظام رکھنا۔

(و)— مشہور اربابِ علم و فضل کو علمی مقالات کے لیے مدعو کرنا۔

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تیماہی رسالہ

جولائی سنہ ۱۹۳۸ع

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

هندستانی سنہ ۱۹۳۸ع

ایڈیٹر : مولانا سعید انصاری

فہرست مضامین

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماھی رسالہ

جلد ۸ | جولائی سنہ ۱۹۳۸ع | حصہ ۳

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

[از جناب علامہ سید سلیمان ندوی]

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنے بتانا سمجھا جاتا ھے ' لیکن حقیقت یہ ھے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ھر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ھے - زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اھم جز ھے ' اس لیے زبان اور اُس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اھمیت رکھتی ھے ' اور یہ تاریخ ھمارے لغت کا بڑا اھم باب ھے ' لیکن افسوس ھے کہ اُس کی طرف ابھی تک ھماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ھے -

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ھی خیانت کریں ' اور اُن کے واقعات کو کتنا ھی الٹ پلٹ ڈالیں ' مگر زبان اور اُس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے امانت‌دار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ھمارے لیے تیار رکھتا ھے ' جس سے اُس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتے ھیں ' چنانچہ اگر ھم یہ جاننا چاھیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رھے ھیں ' تو

اُس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لیے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملےگا -

ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو پھر بھی اُس کی ملکیت میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں ' جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں - اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو سنانے کے لیے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں جن کو کاغذی تاریخ کے اوراق بھلا چکے ہیں -

ہم اپنی زبان کے اِس قیمتی سرمائے کا آغاز سکّوں سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لیے فال نیک بن سکے -

" دام "—ہماری زبان کا ایک پامال لفظ دام ہے ' ایک تو اِس کے معنے قیمت کے ہیں ' اور دوسرے معنے ایک معمولی سکے کے ہیں ' جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے ' جو چھ اور دام دو لفظوں سے بنا ہے - اِس لفظ کی تاریخ کے لیے آج سے دو ہزار برس پہلے ہم کو اوٹ کر جانا ہے - ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشورکشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھاگئے تھے ' مصر و شام و عراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے - اِن ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے - اور اُن کے یونانی نام زبانوں پر تھے -

یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکے کا نام درخم (Drachma) تھا - اِس نے عربی میں درهم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی - اور ہندوستان میں ایک حرف اور گرکر اور اُس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر دام ہو گیا - یہ لفظ جس طرح سکے کو بتاتا تھا ' سکے کے وزن کو بھی بتاتا تھا - چنانچہ عربی طب

میں دواؤں کا وزن درھم ' اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے -
اِسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا ' جو اب ہمارے
انگریزی طبی کالجوں ' دوا خانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانے کی
حیثیت سے وارد ہے - اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور
ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے - صرف آب و ہوا ' لہجہ اور شکل
و صورت کا فرق ہو گیا ہے -

اکبر کے زمانے میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکے کے بجائے
تانبے کے سب سے چھوٹے سکے کا نام تھا ' (صفحہ ۱۸ نولکشوری) [۱] - اِس کو
پہلے پیسہ کہتے تھے ' اور اب بھی کہتے ہیں - یہ رُوپِیّہ کا چالیسواں حصہ
تھا - پھر ایک دام کے پچیس حصے کر کے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے - اب
اُس کو گنڈہ کہتے ہیں - اکبر کے زمانے میں بھی اِس کا نام ملتا ہے -
(صفحہ ۱۲) -

اِسی تقسیم سے ایک محاورہ پورب کی زبان میں اور چلا ہے - ہر
گانو یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ آنے فرض کی جاتی ہے اور یہ آنے پھر
پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں ' ایک دام کا آدھا ادھیلہ اور ۱/۴
پاؤلہ ' اور ۱/۸ دمڑی کہلاتا ہے ' اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا
تحقیر ہے -

اِس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جو دام قیمت کے معنے میں ہم بولتے
ہیں وہ اُسی سکے کی یادگار ہے ' جس سے پہلے ' چیزوں کی قیمت کا اندازہ
اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے -

آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس دام
(پیسے) تیار ہوتے تھے -

---

[۱]—آئین اکبری جلد اول [ادارہ] -

تغلقوں کے زمانے میں " درم سنگ " خرید فروخت کی تول میں بات کے معنی میں بولا جاتا تھا ' (فیروز شاھی ضیا برنی ص ۳۱۹) -

" کیرانت "— اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں ۱۶ آنے کی تقسیم آنوں پر اور آنوں کی پائیوں پر ' اور اُس کے بعد کیرانت ' اور جو پر ھوتی ھے - لفظی بھروپیوں کے پہچاننے والوں کو اِس کے پہچاننے میں دقت نہیں ھوسکتی کہ یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ھے - ایک عربی دینار میں ۲۰ یا ۲۴ قیراط ھوتے تھے [۱] - عربی میں قیراط یونانی سے آیا ھے - آج کل انگریزی میں بھی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ھے اور انگریزی سونے کے بنے ھوئے زیوروں اور چیزوں میں اِتنے کیرٹ گولڈ کی اصطلاح کا عام رواج ھے -

" اشرفی "— درم اور قیراط جس طرح باھر سے آئے ھوئے نام ھیں ' اُسی طرح ھمارے سب سے قیمتی سکے اشرفی کا نام بھی باھر سے آیا ھوا ھے - مجھے بہت دنوں سے اِس کی اصلیت کی تلاش تھی' اور پتا نہ چلنے پر اِس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ھے' اس لیے اشرفی کہلایا ' مگر دفعتاً ایک غیر متوقع ماخذ سے اِس کی اصلیت دریافت ھوئی تو معلوم ھوا کہ سکہ اشرف نہ تھا بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ھے ' وہ اشرف تھا -

طلائی سکے کے لیے سب سے پرانا نام دینار ھے' اور یہ بھی یونانی [۲] ھے- مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا ' اس لیےاُنھوں نے عبدالملک کے زمانے میں سنہ ۷۴ ھ یا سنہ ۷۵ ھ [۳] میں جب اپنا طلائی سکہ ڈھالا تو اُس کا نام دینار ھی رھنے دیا - جب اُن کے قدم ھندوستان پہنچے

---

[۱]— لسان العرب لفظ قرط - ج ۹ [ادارۃ] -

[۲]— جرجی زیدان نے اس کو لاتینی لکھا ھے- تاریخ تمدن اسلامی ص۱۱۹ ج ۱ [ادارۃ] -

[۳]— مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۸ [ادارۃ] -

تو اُن کا دینار بھی اُن کے ساتھ آیا - اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکۂ رائج الوقت کے ساتھ، چند " دینار سرخ " رسمی طور سے جاری ھے -

تغلق کے زمانے میں ھم کو اشرفی کے لیے دو لفظ ملتے ھیں ' ایک تنکۂ زر ' یہ تنکہ سکے کے معنے میں عام طور سے بولا جاتا تھا [۱] - (برنی ص ۳۱۴ و ص ۳۱۵) اور اِسی سے تنخواھوں کی تعیین ھوتی تھی- پیادے کی ماھانہ تنخواہ ۲۴ تنکہ ' اور سوار کی ۷۸ تنکہ تھی' (برنی ص ۳۱۹) - مخدوم زادۂ بغداد کے لیے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ھوا - (برنی ص ۴۹۶) - مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ھے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبے میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ھے تو چندیں طبقہا پر از تنکۂ زر و نقرہ برآں نثار شد (برنی ص ۴۹۲) -

اِس سے معلوم ھوا کہ اشرفی کے لیے اُس زمانے میں تنکۂ زر بولاجاتا تھا - خلجی کے زمانے میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ھوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴) -

رُپَے کو تنکۂ نقرہ ' اور اُس سے کم درجہ سکے کو صرف تنکہ کہتے تھے - یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ھے' (دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف) -

خیال ھوتا ھے کہ یہی تنکہ تو آج " ٹکے " کی صورت میں ھمارے سامنے نہیں ؟ *

دوسرا لفظ مہر زر ھے - اِس کو مہر اس لیے کہتے تھے کہ اِس پر شاھی نام نقش ھوتا تھا - مہر زر کی اصطلاح برنی میں ملتی ھے -

---

[۱]—ڈاکٹر تارا چند صاحب نے بتایا ھے کہ تنکا سنسکرت میں سکے کو کہتے ھیں -

سلطان محمد مہر مس پیدا آورد و فرمان داد کہ مہر مس را خرید و فروخت چنانچہ مہر زر و نقرہ جاری است - (ص ۲۷۵) -

یہی مہر زر اکبر کے زمانے میں بھی زبان و قلم پر تھا - آئین اکبری میں اکبری سکوں کے بیان میں بھی یہ لفظ ملتا ہے (ص ۱۷) ، اگرچہ اکبر نے اشرفی کے لیے سہنسہ ، رہس ، آتمہ ، چُگل ، لعل جلالی ، آفتابی ، وغیرہ الفاظ بنائے اور چلائے ، مگر مہر کا نقش بھی مٹا نہیں ، بلکہ پرانی شاھی اشرفی کو آج بھی مہر کہتے ھیں -

دکن میں طلائی سکے کا نام " ھون " تھا ، جو آخر میں مخفف ھو کر ھن ھو گیا - اور آج ھماری زبان میں اِس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں "ھن برسنا " ایک یاد گار رہ گیا ہے - روپیہ کا لفظ اور سکہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے ، (آئین اکبری ص ۱۸) - اور عجب نہیں ہے کہ یہ روپا سے بنا ھو - سونے کے سکے کے لیے' اشرفی کا لفظ ھندوستان میں نورالدین جہانگیر کے زمانے میں استعمال میں آیا ہے ، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حسن گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سر گذشت کے بیان میں لکھا ہے :—

"زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی علائی و طلاے غیر مسکوک دید ،

(فرشتہ نولکشوری ص ۲۷۴)

فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۱۰۱۵ھ سے سنہ ۱۰۲۳ ھ تک ہے - اِس سے اندازہ ھوتا ہے کہ گجرات و دکن کی راہ سے یہ اشرفی مسافرانہ ھندوستان وارد ھوئی ہے -

یہ عجیب بات ہے کہ سونے کے سکے کے لیے افریقا کی طلاخیز اور زر ریز زمین ھی سب سے زیادہ موزوں ثابت ھوئی ہے - انگریزی گنی کا مولد افریقا کا ملک گینا یا گھنی قرار پایا ہے ، جس کو عرب غانہ کہتے تھے

اور بلاد التبر (سونے کا ملک) کے نام سے پکارتے تھے ' اور وہیں سے سونا لاتے تھے- وہم پہنچتا ہے کہ فانہ کا تعلق عربی کے فلی اور فلا سے تو نہیں؟ بہر حال ہماری اشرفی کا مولد ومنشا بھی ہندوستان نہیں ' بلکہ ایشیا بھی نہیں ' افریقا ہی کا ایک گوشہ ہے ' مگر دوسری طرف کا ' یعنی مصر '

مصر کے چرکسی بادشاہوں میں سے ایک برسبای تھا - اُس نے سنہ ۸۲۵ھ سے سنہ ۸۴۱ھ تک حکومت کی ہے - اُسکا شاہی لقب الملک الاشرف تھا - یہی اشرف اشرفی کا مصدر و معدن ہے - مشہور عرب جہازراں ابن ماجد اسدالبحر نے جس نے سنہ ۹۰۴ھ (سنہ ۱۴۹۸ع) میں واسکو ڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا ' الفوائد فی اصول البحر و القواعد کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے ' جو چندسال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے - اِس کا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کا شروع تھا - یہ بحر ہند اور بحر عرب کا ایک نکو جہازراں تھا - گجراتی ہندو بیوپاریوں کی طرف سے اِس کو کنکا کا سنسکرت خطاب ملا تھا ' جس کے معنے ماہر ریاضی داں کے ہیں ' (دیکھو میری کتاب عربوں کی جہازرانی ص ۱۳۰ - ۱۳۷) - اُسکی اِسی کتاب کے مطالعے سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا - ابن ماجد ایک خاص سلسلے میں لکھتا ہے -

والحادی عشر برسبای الاشرف ضارب سکة الاشرفی (ص ۴۰ طبع پیرس)	گیارھواں بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی سکے کا چلانے والا ہے -

اِس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا اور وہاں سے پورے ہندستان میں پھیل گیا - ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب سنہ ۸۹۵ھ میں لکھی ہے ' اور اِس سکے کے بانی کا ذکر کیا ہے - اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اِس کے بیس برس بعد سنہ ۹۱۵ھ میں لکھی اور

"اشرفی علائی" کا نام لیا ھے ' یعنی علاءالدین خلجی کے وقت کی اشرفی حالانکہ خلجی کے زمانے میں اشرفی کا نام بھی پیدا نہیں ہوا تھا - مگر یہ ایسا ہی ھے جیسے ہم پرانے زمانے کے بادشاہوں کے سونے کے سکوں کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہدیتے ھیں -

" بیمہ "۔۔۔ رُپےؔ اور اشرفی کی تقریب سے وہ طریقہ یاد آیا جس سے قیمتی چیزیں محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ ڈاک بھیجتے ھیں ' جس کو ہم آپ بیمہ کہتے ھیں - خیال یہ تھا کہ یہ ڈاک کے نئے طریقوں میں سے ھے ' اور جہاں سے یہ نئے طریقے آئے ھیں ' وھیں سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ھے - مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصةالتواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گذرا ' جو عالمگیری عہد کی تصنیف ھے - سنہ ۱۱۰۷ ھ میں عالمگیر کی تخت نشینی کے چالیسویں سال مرتب ہوئی ھے -

سجان رائے اہل ھند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل میں یہاں کے مہاجنوں کے ذریعے سے ترسیل زر کا حال لکھتا ھے ' جس کا ترجمہ یہ ھے :۔۔۔

" لین دین میں یہاں کے لوگوں کی سچائی کا یہ حال ھے کہ کوئی کتنا ہی نا آشنا اور انجان ہو ' گواہی اور شہادت کے بغیر ہزاروں رُپےؔ امانت صرافوں کے حوالے کر دیتے ھیں - یہ صراف بھی ایسے سچے ہوتے ھیں کہ جب اُن سے امانت واپس مانگیے ' بلا حیلہ حوالہ کیے بے توقف واپس کر دیتے ھیں ' اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز راستوں کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جاسکے تو وہ اُنکے حوالے کر دیتا ھے - یہ دیانت دار صراف اُن رُپئوں کو اپنی تحویل میں لےکر ھنڈی میں اپنے کارندوں کے نام

جو هر شہر میں اُن کی طرف سے سچائی کی دکان کھولے رہتے ہیں ایک پرچہ لکھکر دیدیتے ہیں ' اُس کو یہاں کی زبان میں ہُنڈی کہتے ہیں - یہ کارندے اگرچہ سیکڑوں میل کی مسافت ہو اُس پرچے کو دیکھتے کے ساتھ بلا حجت اُس کو روپیہ دیدیتے ہیں - اِس سے بڑھکر یہ ہے کہ اُس پرچے کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ بھیجنا چاہے تو اُتنے ہی روپے اُس کو فوراً مل جائیں گے ' صرف یہ ہو گا کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (تمتع) اُس سے لے لے گا "-

اب اِس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے -

عجیب تر آنکہ اگر تاجران بسبب طرق ہائلہ اقمشہ و امتعہ و دیگر اموال آ نہا بمجلس در قرارگاہ سلامت رسانیدہ بمالکان عائد می نمایند ؛ و آن را بزبان ایں مردم بیما گویند -

اِس عبارت سے یہ معلوم ہو گیا کہ پرانے ہندوستان میں منی آرڈر بھیجنے ' بنک چک استعمال کرنے ' اور قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بیمہ کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا ' اور اِس سے لفظ "بیما" کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا -

" بزبان ایں مردم بیما گویند " سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی هندی یا سنسکرت کا لفظ ہوگا ' مگر میں نے هندی اور سنسکرت کے عالموں سے اِس کی تحقیق چاہی تو کوئی اِس کا پتا بتا نہ سکا - اِس سے وهم جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ " بیم " بمعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو ' سجان رائے نے اِس بیان کا آغاز بھی اِن لفظوں سے کیا ہے :—

" و طرفہ آنکہ اگر بنا بر خوف مسالک ممالک شخصے مبلغہاے نقد بمسافت دور و نزدیک نتواند برد " ـ

اِس لفظ " خوف " سے بھی اِدھر ھی خیال جاتا ھے - مگر مشکل یہ ھے کہ فارسی لغت کی کتابوں میں یہ لفظ نہیں ملتا - اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سید تصدق حسین نامی ایک بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت منشی نولکشور صاحب کے نام سے لکھا ھے ' اور نولکشور پریس میں سنہ ۱۹۰۰ ع میں چھپا ھے ' مولف نے مقدمے میں یقین دلایا ھے کہ تمام لغات دیکھکر بڑی احتیاط سے یہ لغت لکھا گیا ھے - اِس میں " بیمہ " کے لفظ کے نیچے اُس کو فارسی بتا کر یہ تشریح لکھی ھے -

" بخوف رھزنی جو کسی ساھوکار کو محصول کسی نقد یا مال کے پہنچانے کا دیں اور وہ اُس کی حفاظت کا ذمہ دار ھو "-

لغات کشوری کی امانت و دیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمے کے فارسی ھونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا -

" ڈاک "—بیمے کے ذکر سے سب کا خیال ڈاک ' ڈاکخانہ اور ڈاک گھر کی طرف چلا گیا ھوگا ' موقع ھے کہ آپ کے اِس حسن التفات سے ھم فائدہ اُٹھائیں - تعجب ھوگا کہ اِس ڈاک کا ھمارے لغت میں پتا نہیں -

عربی میں ڈاک کے لیے برید کا لفظ استعمال ھوتا ھے - مسلمانوں میں امیر معاویہ نے سب سے پہلے اِس نظام کو قائم کیا ' اور برید اُس کا نام پڑا - ھمارے عجمی اھل لغت نے اِس کو فارسی بُریدن سے لیا اور بتایا کہ چونکہ ڈاک کے لیے دم بریدہ یعنی دم کٹے گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے اس لیے ڈاک کو برید کہنے لگے - حالانکہ اگر یہ اشتقاق درست بھی ھوتا تو زبر کے بجاے ب کو پیش ھونا چاھیے تھا - اب نئی تحقیق یہ ھے کہ یہ یونانی اور لاطینی سے عربی میں آیا ھے' اور وریڈ اِسکی اصل ھے - ھندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ پہلے یہی لفظ آیا ' پھر ترکی

لفظ اولاغ چلا ' (برنی ص ۴۴۷ کلکتہ) - مگر فوراً ہی اُس کی جگہ ایک ہندوستانی لفظ نے رواج پایا ' اور وہ لفظ دھاوا ہے - چنانچہ تغلقوں کی تاریخ میں یہ لفظ بولا گیا ہے - ابن بطوطہ نے سفر نامے میں بھی یہی لفظ لکھا ہے (۲ ص ۱۰ مصر) - برنی نے فیروز شاہی میں اِسی لفظ کا استعمال کیا ہے ' (ص ۴۴۷ کلکتہ) -

مگر اِس کو دھاوا کیوں کہتے تھے ؟ اِس کا پتا ہم کو اپنوں سے نہیں بلکہ ابن بطوطہ جیسے بیگانے سے چلتا ہے - وہ کہتا ہے کہ دھاوا کے معنے اہل ہند میں تہائی میل کے ہیں [۱] ' چونکہ یہ ہرکارے ہر تہائی میل پر مقرر ہوتے تھے ' اس لیے اِس کو دھاوا کہتے تھے ' اور استعمال سے راستے کے بجائے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے - دھاوے کے اِن پیادوں کی چوکیاں ہر تہائی میل پر دلی سے لے کر دولت آباد تک بنی ہوئی تھیں - پیادہ گھنگرو دار لاٹھی کو کندھے پر رکھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے پر پہنچتا تھا ' وہاں دوسرا پیادہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار رہتا تھا - وہ فوراً اُس سے ڈاک لے کر آگے کے دھاوے کو دوڑتا تھا - اِس طرح سندھ سے دلی ۵ دن میں ڈاک پہنچتی تھی' (ابن بطوطہ) -

اِس دھاوے کی یادگار ہماری زبان میں دھاوا کرنا ' دھاوے پر چڑھنا ' دھاوا بول دینا اور دھاوا مارنا ' آج بھی موجود ہے - اور دھاوے کے پیادے کو پائک کہتے تھے ' جو پیک کی صورت میں محرم کی تقریب میں امام کے نقلی قاصدوں کا ہم نے نام رکھا ہے -

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آل تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا ' تو یہ لفظ یہاں سے مٹ چکا تھا ' چنانچہ اکبر کے زمانے میں جب بدایونی نے اِس لفظ کا استعمال کیا تو اُسکو اِس کے ترجمے کی ضرورت

---

[۱] ڈاکٹر تارا چند صاحب کہتے ہیں کہ دھاوا سنسکرت میں دوڑنے کے معنے میں ہے -

ہوئی - سلطان محمد تغلق کے حال میں کہتا ہے " در سنہ ۷۲۷ھ سلطان محمد تغلق عزیمت دیوگر کردہ از دہلی تا آنجا بر سر کروہے دہاوہ یعنی پائکان خبردار نشاندہ " فرشتہ نے جہانگیر کے زمانے میں اپنی کتاب لکھی تو " دہاوہ " کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہو چکا تھا ' مگر کہتا ہے کہ اِسکو پہلے یام (ی ا م) کہتے تھے - سلطان علاءالدین کے حال میں لکھتا ہے " از دہلی تا آنجا ڈاک چوکی کہ بزمان سلف یام می گفتند می نشاند " یہ یام فارسی استعمال میں ہے - دکن میں مدراس سے لے کر پونا تک اِس کے لیے تھہ ' تھال اور تھہ خانہ بولا جاتا ہے - ریاست حیدرآباد کا سرکاری لفظ بھی ہے -

بہر حال ڈاک کا لفظ جہانگیر کے عہد میں یا اُس سے کچھ پہلے سے بولاجانے لگا ' اِس کی اصلیت پر میں غور کرتا رہا ہوں ' میرا خیال ہے کہ اِس کے معنی منزل کے ہونگے - چونکہ یہ منزل بمنزل جاتے تھے' اس لیے اِسکو ڈاک کہنے لگے ' اور اِسکے ہر پڑاؤ کو ڈاک چوکی - چوکی بمعنی پہرہ ' جس کی ایک یادگار چوکیدار ہمارے پاس موجود ہے - اُسی لیے انگریزوں نے اِسی اصول پر بنگال سے الہ آباد تک اپنے منزل بمنزل سفروں کے لیے جو مختصر قیامگاہیں بنائیں اُنکو ڈاک بنگلہ کہا ' اور اب بھی وہ یہی کہے جاتے ہیں - اور اگر لغت گھڑنے کا الزام نہ قائم کیا جائے تو جی چاہتا ہے کہ یہ کہوں کہ ہندوستان و افغانستان کی سرحد پر ڈکّہ اور بنگال کی حد پر ڈھاکہ ؛ اور دوسری طرف موتی‌ہاری میں نیپال کے پاس دوسرا ڈھاکہ اِسی منزلگاہ کے باقی نشان ہیں - بہرحال منزل نے راستہ کی ' اور راستے نے خط و لفافہ اور اشیاے ڈاک کی صورت اختیار کی - اور اب وہ ریل گاڑی جو بہت کم منزل کرتی ہے مگر ڈاک لے کر چلتی ہے ' ڈاک گاڑی کہلاتی ہے - ڈاک کے پچھلے معنے کی یادگار ڈاک بٹھانا ' ڈاک لگانا ' یعنی

جلدی جلدی منزل بمنزل یا ھاتھوں ھاتھ، چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا رہ گیا ھے '

فیض ساقی نے مرے ڈاک لگا رکھی ھے (راسخ)

روح ھے ھر جسم میں مشتاق اخبار اجل
اس لیے یہ آمد و رفت نفس کی ڈاک ھے
(ناسخ)

اِسی سے ڈاک بولنا بھی ایک محاورہ ھے - یعنی نیلام میں منزل بمنزل کسی چیز کی قیمت بڑھانا -

اگلے زمانے میں مصر وغیرہ اور ھمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اُڑا دیے تھے ' اِس نسبت سے ایک اُڑتی سی بات کبوتر ھی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجیے -

" قمری "— ھماری زبان میں ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ھے - یہ نام عربی و فارسی سے آیا ھے ' مگر اِسکی اصلیت کے بتانے سے یہ دونوں زبانیں قاصر ھیں - فارسی کے خالص لغتوں میں یہ لفظ سرے سے نہیں - مؤیدالفضلا میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغت ھے ' یہ لفظ ملتا ھے ' اور تاج نام کسی لغت کے حوالے سے لکھا ھے کہ فاختہ کو کہتے ھیں ' پھر اُس سے اختلاف کیا ھے کہ فاختہ اور چڑیا ھے اور قمری اور - فاختہ کا رنگ خاکستری ھوتا ھے اور اُس کی آواز یکےتو یا کو کو کو کی سی ھوتی ھے - گلے میں طوق ھوتا ھے - اور قمری کی دو قسمیں ھوتی ھیں' ایک سفید کافوری اور دوسری صندلی ' اور اُس کی آواز سے یا غفور کی صدا نکلتی ھے -

تاج کے مشہور نام سے تو جوھری کی تاج اللغۃ کی طرف خیال جاتا ھے - اِس میں شک نہیں کہ جوھری نے قمری کا ذکر کیا ھے ' مگر

یہ نہیں لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں ۔ بہر حال یہ فارسی نہیں ' عربی بھی نہیں ' کیونکہ اول تو عرب اِس سے واقف نہ تھے ' اُنکے شعروں میں اِسکا ذکر نہیں - قدیم عربی لغت میں یہ مذکور نہیں - اِس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہیں - اِسکے اخیر میں جو یاے مشدد ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے اور اِسی نسبت کی طرف اکثر اہلِ لغت گئے ہیں - جوہری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قَمر سے مشتق ہے جسکے معنی سپیدی کے ہیں اور اِس سے صفت بنی اقمر بمعنی سپید - اِس اقمر کی جمع ہوئی قُمر ' جیسے احمر سے حمر ' اور اب یہ ہوا کہ سپید پرندوں کو جمع کے ساتھ یوں بولے طیر قُمْر ' اب اِس جمع کا واحد جب مراد ہوا تو جمع کی طرف یاے نسبت لیکر قمری واحد بنا لیا - جیسے روم سے رومی ' زنج (زنگ) سے زنجی (زنگی) - مگر اِس تحقیق میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے - عربی میں اِس مصلحت سے کسی اور پرندے کا نام نہیں رکھا گیا -

مجد فیروزآبادی نے قاموس میں قمریہ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ کبوتر کی ایک قسم ہے - مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) نے تاج‌العروس میں لکھا ہے کہ مجد نے یہ محکم زمخشری سے لیا ہے - بعضوں کا دعویٰ ہے کہ قمری عربی کا قدیم لفظ ہے ' اِس کی جمع قُمْر ؛ ابوعامر نام ایک جاہلی عرب شاعر کے کلام میں ہے -

ما قرقر قمر الواد بالشاهق

مگر اِسکا کوئی دوسرا شاہد نہیں -

قمری کے آخر میں جو ی ہے ' اُسکو کوئی صاحب یاے مبالغہ سمجھتے ہیں ' مگر اکثروں کی راے یہی ہے کہ یہ یاے نسبت ہے - اب رہی یہ بات کہ کس کی طرف نسبت ہے ' تو بعض لوگ اِسکو اِس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہیں ' اور بعض

اِس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ھیں- علامۂ مرتضی زبیدی نے تاج العروس میں اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ھے کہ اُن کے اُستاد نے شرح کفایہ میں اِس کی تحقیق کی ھے -

اب اھل لغت کے دربار سے اُٹھکر ھم آوارہ‌گرد جغرافیہ نویسوں کے مسافر خانوں میں پہنچتے ھیں- یاقوت رومی معجم‌البلدان میں قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کرتا ھے اور ابن‌الفارس سے نقل کرتا ھے کہ قمری پرندہ اِسی شہر کی طرف منسوب ھے - مقریزی خطط مصر میں دریاے نیل کے منبع کی تلاش میں نکلتا ھے اور بحر ھند کے جزیروں کو دیکھتا بھالتا چلتا ھے ، اور اِسی اثنا میں جزیرۂ قمر[۱] کا ذکر کرتا ھے اور جس کا دوسرا نام جزیرۂ ملی بتاتا ھے جس کو آج ھم ملایا کہتے ھیں - اِنھیں میں سے ایک جزیرے کا نام قمریہ بتایا ھے ، اور اُس کے بعد کہتا ھے :—

و الیھا ینسب‌الطائرالقمری (صفحہ ۱۸ مصر)	اور اِسی جزیرے کی طرف قمری پرندہ منسوب ھے -

پرندوں کے نام اُن مقاموں کی نسبت سے رکھنا ، جہاں پہلے پہل وہ پرندے کسی خوش مذاق کو ھاتھ آئے ھوں ، عام بات ھے - ترکی ، چینی شیرازی وغیرہ اِس کی مثالیں ھیں -

اِتنی مسافت طے کرنے کے بعد ذرا سستانے کے لیے ''غالب'' کے اِس شعر کا مطلب حل کیجیے -

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ھے

---

[۱]—ھمارے دوست ڈاکٹر تارا چند نے بتایا ھے کہ انگریزی و فرنچ میں ، اِس کو اب بھی کھمیر Khmer کہتے ھیں -

فارسی شاعروں نے گل و بلبل کی طرح سرو و قمری میں محبت کا رشتہ جوڑا ہے -

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تونیست

ایک اور بیاے نسبت حل طلب ہے -

" سوسی " — ہمارے ملک میں رنگین باریک دھاریوں کا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے جسکو سوسی کہتے ہیں - اسلامی زمانے کے اکثر بُنے ہوئے کپڑوں کے نام یا تو کاریگر کے نام یا مقام یا اُس امیر یا بادشاہ کے نام یا اُس کام کے نام پر رکھے جاتے تھے جو اُس کپڑے میں خاص طور سے کیا جاتا تھا ' جیسے تافتہ ' بافتہ ' زری ' کارچوبی وغیرہ ' یا مظفری ' محمودی ' علی‌قلی‌خانی وغیرہ ' یا کاشانی ' بغداوسی ' بھاگلپوری وغیرہ ' انگریزی میں ململ کو جو مسلین کہتے ہیں وہ موصل کی طرف نسبت ہے -

سوسی نہ تو شخص کا نام ہے ' نہ ہندوستان کے کسی مقام کا - یہ تو ظاہر ہے کہ اِسکی نسبت سوس کی طرف ہے - سوس کے نام سے ایک شہر ترکستان میں ہے ' اور دوسرا مغرب اقصیٰ یعنی مراکش میں ہے - مگر یہ دونوں مقام پارچہ بافی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے - لیکن ہے یہ واقعی شمالی افریقا کے ایک صنعتی مقام کا نام - اُسکا نام سوسہ ہے - یہ عربوں کی ترقی کے عہد میں پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا ' اور یہاں کے بُنے ہوئے کپڑوں کو سوسی کہتے تھے - پھر اِس نمونے پر جہاں جہاں کپڑے بنے جانے لگے اُنکو سوسی ہی کہنے لگے - یہ گویا ایک طرز کا نام ہو گیا - یہ کپڑے کبھی اِس شان کے بُنےجاتے تھے کہ اُنکے ایک ایک تھان کی قیمت آٹھ آٹھ اشرفی ہوتی تھی - جغرافی ڈکشنری معجم‌البلدان کا مصنف یاقوت حموی رومی جسنے سنہ ۶۲۶ھ میں وفات پائی ہے ' سوسہ کے ذکر میں لکھتا ہے ' (لفظ سوسہ)

" معلوم یہ ہے کہ سوسہ ایک چھوٹا سا شہر افریقیہ کے اطراف میں ہے... یہاں کے اکثر باشندے کپڑا بننے والے ہیں، یہ بیش قیمت (یا باریک) سوسی کپڑے بنتے ہیں ' اور جو کپڑا دوسری جگہوں پر ویسا بناجاتا ہے وہ اِنھیں کی نقل ہے ' (یا اِنھیں کے مشابہ ہے) ' اُن میں سے ایک تھان کی قیمت وہاں دس دینار ہے - .... اور جو دھاگا وہاں کتتا ہے اُسکے ایک مثقال کی قیمت دو مثقال سونا ہے - "

لیکن ہماری هندوستانی سوسی بہت سستی ہے ' اور غریبوں کی سگر پوش ہے - اکثر غریب عورتوں کے پاجاموں میں کام آتی ہے - چیز وہ نہیں رهی' طرز وهی ہے ' وہ ریشمی هوگی ' یہ سوتی ہے -

ایک مجہول پارے نسبت ہمارے ایک خوش ذائقہ کھانے میں بھی ہے -

" فیرنی" —یہ ہمارے کھانے کی ایک لذیذ قسم ہے ' جسکے مزے سے هم سب واقف هیں ' مگر اُسکی لفظی اصلیت سے هم سب نا واقف هیں - پتا یہ چلتا ہے کہ فِرنی اصل میں فُرنی (بالضم) ہے - چوتھی صدی کا مصنف ' محمد خوارزمی جو غزنویوں کا معاصر تھا ' اپنی کتاب مفاتیح العلوم [۱] میں بیماروں کی غذاؤں کے سلسلے میں فُرانی نام لیتا ہے ' اور کہتا ہے کہ اِس غذا کی تیاری کی صورت یہ ہے کہ وہ مختلف شکلوں کی موٹی تنوری پھولی هوئی (پاؤ روٹی سمجھیے) روٹی کو دودھ میں بھگو کر شکر ڈال کر تیار کی جاتی ہے' (نان یہ شیر کہیے) - اِسکا واحد فرنی ہے - اِسکو فُرنی اس لیے کہتے هیں کہ یہ موٹی روٹی تنور میں جسکو عربی میں فُرن کہتے هیں ' تیار هوتی ہے - گویا فرنی کو تنوری کے معنوں میں سمجھیے - هندوستان کا اثر یہ ہے کہ موٹی پھولی هوئی روٹی کے بجائے

[۱] — ص ۱۶۶ ' لیڈن -

اِسمیں چاول ڈالنے لگے - اور اب شکرقند هو ' ساہودانہ هو ' جس چیز کو آپ دودھ شکر میں پتلا کر کے بنائیے وہ فرنی ہے ' مگر اِسی کے ساتھ اِتنی ترمیم اور کیجیے کہ ف کو پیش کی جگہ زیر دیجیے -

یہی مصنف ہمارے بھات کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتا ہے جن سے کھیر کی خوشبو آتی ہے - وہ کہتا ہے بھتّہ (بھطہ) سندھی لفظ ہے چاول میں دودھ اور گھی ڈال کر بناتے ہیں - کھیر اور شیر (دودھ) ایک ہی چیز ہے - سنسکرت میں دودھ کو کشیر اور سندھی میں کھیر کہتے ہیں ' جس سے ہماری یہ کھیر پکتی ہے ' اور اسی لیے کھیر کہلاتی ہے - بھات سے بھاتی کا لفظ نکلا ہے ' جو میت کے کھانے کو کہتے ہیں- کیوں صاحبو ! انگریزی ملازموں کا بھتہ اِسی بھات سے تو نہیں ہے ' جسکا آغاز بنگال کے انگریزی نوکروں سے ہوا ہو اور اِسکے معنے خرچ خوراک کے ہوں- سنہ ۱۷۶۵ع —۱۷۶۷ع میں لارڈ کلایو نے جو اصلاحات کیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ " بھتہ " دیا کرتی تھی - کلایو نے اِس زمانے میں اُسکو بند کر دیا - اِس واقعے سے بھی اِس لفظ ہ اصل تعلق بنگال سے ثابت ہوتا ہے -

" رقم "— اِس بھتے سے لوگوں کو اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی ہے - کبھی آپ دوسروں کے ذمے اپنی رقم نکالتے ہیں اور کبھی دوسرے آپ کے ذمے - مگر کبھی آپ نے یہ سونچا کہ یہ " رقم " آپ کو کہاں سے ہاتھ آیا (!) آج ہم رقم رُپے کی ایک مقدار کو کہتے ہیں - رقم کا لفظ یقیناً عربی ہے ' مگر اِس معنے میں نہ عربی میں مستعمل ہے نہ فارسی میں ' بلکہ یہ خالص ہندوستانی ہے -

رقم کے معنے عربی میں نشان بنانے کے اور کپڑے کی دھاری کے ہیں - حدیث میں ہے الا رقما فی ثوب ' اِس سے لکھنے کے معنے ہوئے جیسے

کالرقم علی الماء - عربی میں حساب اور ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو عدد کے نشان کے لیے رقم کا لفظ پسند کیا گیا ' اور اِس پسندیدگی کی وجہ شاید یہ ہے کہ رقم اور قلم ایک قافیے کے لفظ ہیں ' اور قلم خط یا اسکرپٹ کے معنے میں استعمال ہو چکا تھا ' اس لیے اِسی کے وزن کا لفظ رقم اعداد کے لیے مناسب معلوم ہوا - یہ جمع کے ساتھ اقلام اور ارقام بولے جاتے تھے - بیرونی نے کتاب الہند میں خطوط اور ارقام استعمال کیا ہے (ص ۷۸) - اِسی سے اعداد کے علامات خصوصاً رُپے کے اعداد کے علامات کے لیے جو خاص ہندوستان کی چیز ہے اوقام ہندیہ مستعمل ہوا - اور جب حساب کی اصطلاح میں ارقام اور رقم کا لفظ آگیا تو نقد رُپے کے لیے اُس کا استعمال پا جانا کتنی بڑی بات تھی -

" هَندسه "—رقم سے " هندسه " کی طرف خیال کیا گیا ' چونکہ ارقام ''هند'' سے عربی میں لیے گئے ہیں' اس لیے عوام هَندسه کو زبر کے بجائے زیر [۱] دے کر هِندسه بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ ''هند'' سے ہے اس لیے هِندسه ہے - اور تعجب ہے کہ خوارزمی کے الجبر و المقابلة کا انگریزی مترجم فریڈرک روزن تک اِس وهم میں مبتلا ہے (ص ۱۹۹ و ص ۱۹۷ مقدمه انگریزی سنه ۱۸۳۱ ع) - فارسی لغت برهان قاطع کے مصنف بھی اِسی غلطی میں گرفتار ہیں - کہتے ہیں :—

" هندسه بکسر اول و ثالث و فتح سین بےنقطه بمعنی اندازه و شکل باشد و ارقامے را نیز گویند که در زیر حروف کلمات نویسند همچو ابجد هوز حطی - "

یہ بیان تمامتر غلط در غلط ہے - هندسه بفتح اول و ثالث و رابع' بروزن فعللة فارسی لفظ " انداز " کا عربی بنایا ہوا مصدر ہے - معنے اندازہ

---

[۱]—افسوس ہے کہ میری کتاب عرب و ہند کے مصحح نے اپنی غلط تصحیح سے میرے صحیح کو غلط کر دیا ہے ' (دیکھو کتاب مذکور مطبوعة اکاڈیمی ص ۱۳۵ -)

کرنا، اور اِس سے مراد عمارت کا ناپنا اور نقشہ بنانا یعنی فن تعمیر ہے جس کو آج انجینیرنگ کہتے ہیں - بعضوں نے اِس کو فارسی "اندیشہ" کا معرب بتایا ہے، مگر یہ صحیح نہیں - خوارزمی (چوتھی صدی) مفاتیح العلوم میں لکھتا ہے -

اما الهَندسة فكلمة فارسية معربة و في الفارسية اندازه اي المقادير قال الخليل المهندس الذي يقدر مجاري القنيّ و مواضعها حيث تحفر و هي مشتقة من الهنداز و هي فارسية فصيرت الزاي سينا لانه ليس بعد الدال زاي في كلام العرب (ص ۲۰۲ ليڈن)

و لیکن ہندسہ، تو یہ فارسی لفظ کا معرب ہے، فارسی میں اندازہ ہے یعنی مقدار - خلیل نے کہا ہے کہ مہندس وہ ہے جو نہروں کے نکالنے کا اندازہ و پیمائش کرتا ہے تاکہ نہریں کھودی جائیں، اور ہندزہ سے بنا ہے، اور وہ فارسی ہے - تو "ز" کی جگہ "س" نے لے لی کیونکہ عربی میں دال کے بعد "ز" نہیں ہے -

"ریاضیات" — ہَندسہ سے ریاضیات کی طرف ذہن نے کروٹ لی - عربی میں روض کے دو معنے ہیں - زمین کی سر سبزی و شادابی، اِس نے باغ و بہار کا مفہوم پیدا کیا، اور ریاض جنت کے پھول کھلائے - دوسرا مفہوم سواری کے جانوروں اور خصوصاً گھوڑے کے سدھانے، سکھانے اور پھیرنے کا ہے - عربی میں فِعالة کا وزن پیشہ، فن اور صنعت کے کام آتا ہے، اِس سے ریاضة بنکر گھوڑا پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا - گھوڑے کو پھیر کر سدھا اور شایستہ بنانے سے صوفیہ نے نفس کو رام کر کے شایستہ بنایا اور ریاضت روحانی اُس کا نام رکھا - اُدھر گوشت و پوست اور جوڑ بند کے حسن کے شائقوں نے جسمانی مشق و ورزش کو ریاضت جسمانی

کہا - اہل علم کیوں چپ رہتے ' اُنہوں نے حساب و ہندسہ وغیرہ مشقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دیا - جاہل اہل پیشہ نے کہا کہ ہم کو بھی اپنے کاموں میں مشقت کم نہیں پڑتی ' اُنہوں نے بھی اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کا نام ریاض رکھا - لیکن اِس معنے میں یہ خالص ہندوستانی ہے -

عرب حکیموں نے ریاضیات کو ریاضیات کا لقب کیوں دیا ؟ جب کہ ریاضیات کی خصوصیت نہیں ' ہر فن مشق کا محتاج ہے - اصلیت یہ ہے کہ ہندیوں کی طرح یونانیوں میں بھی بچوں کی تعلیم کا آغاز ریاضیات سے ہوتا تھا - اسی لیے جب شروع شروع میں عربی میں یونانی علوم آئے تو ریاضیات کا نام تعلیمیات پڑا ' کیونکہ تعلیم کا آغاز اِسی سے ہوتا ہے - اب عربی فلسفے میں اِس اصطلاح کا اثر اِتنا ہی رہ گیا ہے کہ مقدار مطلق کا نام اُسمیں اب بھی "جسم تعلیمی" ہے - لیکن تعلیمیات کی جگہ بہت جلد اُس سے بہتر لفظ ریاضیات نے لے لی ' اسلیے کہ بچوں کی مشقی تعلیم اِسی سے شروع ہوتی ہے -

علامہ شریف جرجانی اپنی تعریفات میں " جسم تعلیمی " کے نیچے لکھتے ہیں -

"و یسمی جسما تعلیمیا اذ یبحث عنہ فی العلوم التعلیمیۃ ای الریاضیۃ .... منسوبۃ الی التعلیم و الریاضۃ فانہم کانوا یبتدؤن بہا فی تعالیمہم و ریاضتہم للنفوس الصبیان " -

" سیاست "—ریاضت کے وزن پر سیاست ہے' اور آجکل کیا کہنا کہ ساری دنیا میں اِسی کی بہار ہے - مگر معلوم ہے کہ اِسکی اصلیت کیا ہے لغت میں اِسکے اصلی معنے جانوروں کی دیکھہ بھال اور نگرانی ہے اور اِسی سے امور کی اپنی جماعت کی اور بادشاہ کی اپنی رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا - ظالم باشاہوں کے ظلم نے اِسکے

معنے بدل دیے - اِسی سے "سیاست کردن" سزا دینے کے اور اردو میں قہر و غضب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے '

عوض الله اسکا محکمہ میں حشر کے لوگا
کریگا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پر (صبا)

سیاست کے لفظ کو یہاں ذکر کرنا کچھ اِتنا ضروری نہ تھا ' مگر مجھے پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (ماسوف علیہ) کی تحقیق سے اختلاف مقصود تھا سواءالسبیل فی معرفةالمولد و الدخیل میں وہ کہتے ہیں کہ سیاست ترکی سے ہے - چنگیز خاں نے اپنی اولاد کے لیے جو چند ملکی قاعدے بنائے تھے اُنکا نام " سہ یاسہ " تھا - اِسی سے عربی میں سیاست آیا ہے - مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے - یہ لفظ عربی میں اِتنا پرانا ہے کہ حدیث تک میں موجود ہے ' ان الناس کان یسوسہم الانبیاء (صحیح مسلم) - پہلی صدی ہجری کے آخر میں محمد بن قاسم نے جب ۱۷ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا ' تو ایک شاعر نے اسکی مدح میں کہا - ساس الرجال لسبع عشرة حجة (اُسنے ۱۷ برس کی عمر میں لوگوں کی سیاست کی) - ابن ندیم نے فہرست میں جو سنہ ۳۷۵ھ میں تاتاریوں سے صدیوں پہلے لکھی گئی " سیاسیات " کا لفظ سیاسی ملکی کتابوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے - پھر قدیم کتب لغت میں اِسکی اصل موجود ہے -

ہاں اپنی زبان کے لحاظ سے یہ کہنا رہ گیا کہ ہماری زبان میں سائیس اور سئیس کا لفظ اِسی سیاست سے بنا ہے ' اِسکی اصل سائس ہے ' مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائیس کا یہ مفہوم خالص ہندوستانی ہے - نہ عربی ہے اور نہ فارسی - مگر شوخی معاف ! آپ نے یہ دیکھا کہ سیاسی اور سئیس دونوں کی اصل ایک ہی ہوئی - دونوں نگرانی اور نگہبانی کرتے ہیں - سیاسی آجکل جسکو کہتے ہیں ہمارے تازہ دکھنی

نوجوانوں نے اُسکے لیے سیّاس کا ایک نیا لفظ گھڑا ہے ، مگر بالکل بے اصل اور بے قیاس ہے - یہ لفظ واوی ہے ، یائی نہیں - دھوکا سیاست اور سیاسی کی ی سے ہوا ہے - مگر واو کی جگہ یہ ی قاعدے سے ہے اور سیاس میں واو کی جگہ ی بے قاعدہ ہے - اگر یہ لفظ بن بھی سکتا تو سوّاس ہوتا ، سیّاس نہیں - اب یہ سیّاس جب تک چل نہ جائے غلط العام فصیح کے حدود میں نہیں آسکتا -

بحث " سیاسیات " کی خطرناک الجھنوں میں پڑکر خطرناک ہورہی ہے ، اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے -

اُردو نثر کے ایک منتخب مجموعے کی ضرورت

[از جناب مولانا عبدالسلام ندوی]

سنہ ۱۹۲۶ع میں ہندوستانی اکاڈمی کا جو سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا ' اُس میں میں نے ایک مضمون " اُردو نظم کے ایک منتخب مجموعے کی ضرورت " پر پڑھا تھا ' جو اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ع کے رسالۂ ہندوستانی میں شائع ہو چکا ہے - آج میں اُس کے بالمقابل " اُردو نثر کے ایک منتخب مجموعے کی ضرورت " پر دوسرا مضمون پیش کرنا چاہتا ہوں -

اهل علم کو ' اِس قسم کے منتخب مجموعے کی ضرورت کا احساس اُس وقت ہوتا ہے ' جب تصنیف و تالیف کی طرف لوگوں کا میلان بڑھتا ہے ' اور مختلف قسم کے مضامین پر لٹریچر کا ایک ایسا ذخیرہ فراہم ہو جاتا ہے جو خشک و تر ' نیک و بد اور صحیح و غلط سب کا مجموعہ ہوتا ہے - ایسی حالت میں اِس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ خشک کو تر سے ' نیک کو بد سے اور صحیح کو غلط سے الگ کر کے انشا پردازوں کی رہنمائی کے لیے ایک طرف تو انشا پردازی کے تنقیدی اُصول و قواعد قائم کیے جائیں ' دوسری طرف انشاپردازی کا ایک ایسا مستند لٹریچر تیار کردیا جائے جس کی تقلید علمی اور ادبی حیثیت سے انشاپردازوں کو ہر قسم کی لفظی اور معنوی غلطیوں سے محفوظ رکھ سکے اور مختلف اسٹائل اور مختلف طرز تحریر کے لیے ایک عمدہ نمونہ اور عمدہ مثال قائم ہوسکے-

مجھ کو ہندی انشاپردازی اور ہندو انشاپردازوں کا تاریخی حال معلوم نہیں ' لیکن مسلمانوں میں جب تصنیف و تالیف کا دور خلافت عباسیہ

میں شروع ہوا ' تو علوم و فنون کے تنوع سے انشاپردازی کے مختلف اسٹائل قائم ہوگئے ' مثلاً فقہی کتابوں کا اسلوب بیان اور اُن کے الفاظ اور ترکیبیں اور تھیں ' اور علم اخلاق ' فلسفہ اور طب وغیرہ کی کتابوں کا طرز تحریر اور تھا - غرض علوم و فنون میں جس قدر تفاوت تھا اُسی قدر تفاوت اُن کے طرز انشا و تحریر میں بھی تھا - اِس بنا پر اُس دور کے بہت سے ادیبوں اور انشاپردازوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ خود فن انشا و تحریر کو ایک مستقل موضوع قرار دیا جائے اور اُس کے حسن و قبح پر کتابیں لکھی جائیں- چنانچہ اِس دور میں قدامہ بن جعفر ' ابن قتیبہ ' جاحظ اور ابن عبدربہ نے اِس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں ؛ اور ادبا و خطبا دونوں کی رہنمائی کے لیے اصول و قواعد بنائے ' اور اُن کے سامنے عربی نثر کا ایک منتخب اور قابل تقلید مجموعہ رکھ دیا - لیکن افسوس ہے کہ اِن مصنفین میں قدامہ بن جعفر نے کلام منثور کے تنقیدی اصول پر جو کتاب " نقدالنثر " کے نام سے لکھی تھی وہ مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے - البتہ اُس کا ایک قلمی نسخہ اسکوریال کے کتب خانے میں محفوظ ہے - اور اگر ہماری خوش قسمتی سے اُس کی دوسری کتاب " نقدالشعر " کی طرح یہ کتاب بھی چھپ جاتی تو ہم اُس سے فن انشا و تحریر کے متعلق بہت سے مفید اصول اخذ کرسکتے - لیکن اُس کے علاوہ ابن قتیبہ ' جاحظ ' اور ابن عبدربہ نے اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ' وہ ہمارے سامنے موجود ہیں - اور ہم اُن کے مضامین پر اِس حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اردو نثر کا جو منتخب مجموعہ تیار کیا جائے اُس کی تیاری میں اِن کے قائم کردہ اصول سے کام لیا جائے -

اِن مصنفین میں ابن قتیبہ نے اِس موضوع پر جو کتاب لکھی ہے

اُس کا نام ادب‌الکاتب ہے اور اُس نے اُس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ نثر کا لکھنا نظم کے لکھنے سے کچھ کم مشکل نہیں ہے ' اور نظم کی طرح نثر کے لکھنے کے لیے بھی متعدد شرائط و اصول کی پابندی ضروری ہے -

(۱) ایک تو یہ کہ ایک انشاپرداز اور ایک مصنف کے لیے صرف الفاظ ہی کا ذخیرہ کافی نہیں ہے ' بلکہ اُس کو ریاضی ' ہندسہ ' نجوم ' تاریخ بلکہ دنیا بھر کے علوم و فنون سے بھی واقف ہونا چاہیے ' تاکہ وہ اپنی تحریروں میں اِن تمام علوم و فنون کی معلومات واصطلاحات سے صحیح طور پر کام لے سکے -

(۲) دوسرے یہ کہ نظم کی طرح نثر میں بھی' بہت سے مشکل اور نامانوس الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے' اور سہل' سادہ اور شیریں الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے- اِسی اصول کے مطابق آج اُردو زبان کو سہل اور عام فہم بنایا جا رہا ہے - لیکن اِس میں دو قسم کی غلطیاں کی جا رہی ہیں - (۱) ایک تو یہ کہ بعض لوگ عربی اور فارسی کے مغلق الفاظ کے بجاے سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ استعمال کرتے ہیں - حالانکہ سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ عربی اور فارسی کے مغلق الفاظ سے کچھ کم بھدّے ' مشکل اور نامانوس نہیں ہوتے - ممکن ہے کہ ہندؤں کو اُن کے سمجھنے میں دقّت نہ ہو - لیکن مسلمان تو اُن کو بہ مشکل سمجھ سکتے ہیں ' اس لیے اگر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ عربی اور فارسی کے اُن الفاظ کو ترک کردیں تو ہندؤوں اور ہندؤوں کے مقلدین کو بھی نہایت ایثار کے ساتھ اُردو تحریروں میں بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے - (۲) دوسرے یہ کہ سہل و سادہ الفاظ اور سبک اور عامیانہ الفاظ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا -. مثلاً اِس دور کے ایک مشہور شاعر کو خالص اُردو زبان میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا ہے '

اور اُنھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں جلوں اور وحشت کی جگہ "سَنَّک" کا لفظ استعمال کیا ہے - حالانکہ جلوں و وحشت بھدّے اور مشکل الفاظ میں شامل نہیں ہیں ' اور سنک نہایت سبک اور عامیانہ لفظ ہے ' جو متین و سنجیدہ نثر و نظم میں استعمال نہیں کیا جاسکتا - اس لیے اگر اُردو زبان کو خالص اور بے میل بنانے کے لیے اِسی قسم کے سبک اور عامیانہ الفاظ استعمال کیے گئے تو اُردو زبان اپنے باوقار طرز تحریر کو قائم نہ رکھ سکےگی اور رفتہ رفتہ چند سبک اور عامیانہ الفاظ کا مجموعہ ہوکر رہ جائےگی - اِس بنا پر ہواخواہان اُردو کو سہل‌نگاری کی اِس تحریک کا خیر مقدم نہایت احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے -

(۳) تیسرے یہ کہ انشاپردازوں کو تہذیب الفاظ سے پہلے تہذیب اخلاق کی شدید ضرورت ہے - یعنی اُن کی تحریروں کو طنز و تشنیع ' غیبت و بدگوئی' کذب و بہتان ' اور عریانی اور فحاشی سے پاک ہونا چاہیے - ظریفانہ مضامین اور ظریفانہ کتابیں تو لکھی جاسکتی ہیں ' لیکن ظرافت اور فحاشی میں زمین و آسمان کا فرق ہے - لیکن آج اُردو زبان کے اخبارات و رسائل میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں ' اُن میں بہت سے مضامین طعن و تشنیع ' کذب و افترا اور سب و شتم کا مجموعہ ہوتے ہیں - مناظرے کی کتابیں تو گویا گالیوں کا مستند لغت ہوتی ہیں - بہت سے ناول اور بہت سے افسانے بھی عریاں خیالات سے لبریز ہوتے ہیں - اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ دور کا ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان جب لکھنؤ کے کسی شاعر کا کوئی عریاں شعر سنتا ہے تو چیں بر جبیں ہو جاتا ہے - لیکن یہی تعلیم یافتہ شخص اِس قسم کے ناولوں اور افسانوں کو لکھتا ہے اور اُن کو نہایت شوق سے پڑھتا ہے -

میں نے اِس مضمون کو عجلت میں بالکل سرسری طور پر لکھا ہے ,

ورنہ عربی علم ادب کی کتابوں سے انشاپردازی کے اور بھی بہت سے تنقیدی اصول قائم ہوسکتے ہیں - اور اُردو نثر کے منتخب مجموعے کی تیاری میں اُن اصول سے بہت کچھ کام لیا جاسکتا ھے -

تاہم انشاپردازی کا صحیح مذاق قائم کرنے کے لیے انشاپردازی کے بہتر سے بہتر نمونے زیادہ کارآمد ہوسکتے ہیں' اور ابن قتیبہ نے اِسی خیال سے ایک اور کتاب عیون الاخبار کے نام سے ۴ جلدوں میں لکھی ھے ' جس میں سیکڑوں عنوانات قائم کیے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں ادبائے عرب کی بہترین عبارتوں کا انتخاب درج کیا ھے 'تاکہ وہ انشاپردازوں کے لیے نمونہ و مثال بن سکیں - چنانچہ وہ اِس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ھے -

" اِس کتاب کے ذریعے سے عربی کی بہترین عبارتوں کا تحفظ مقصود ھے ' تا کہ ایک انشاپرداز اُنکو اپنی عبارتوں کے ضمن میں شامل کر سکے اور گفتگو میں اُنکے پاکیزہ مضامین اور سادہ الفاظ سے کام لے سکے - یہ عبارتیں علما کی عقلوں کی پیداوار' حکما کے خیالات کا نتیجہ ' علم ادب کا زیور ' طویل غور و فکر کا ثمرہ اور بلغا اور شعرا کے کلام اور بادشاہوں کی سیرت اور سلف کے آثار کا انتخاب ہیں اور اس لیے جمع کی گئی ہیں کہ اُن میں سیرت ' ادب ' اور اخلاق کا جو ذخیرہ ھے اُس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور تحریر و تقریر میں اُنکو شامل کیا جائے اور اُنکے ذریعے سے مختلف مضامین کو موثر طریقے پر ادا کیا جائے اور بادشاہوں کی صحبتوں میں ' عام مجلسوں میں ' سیاسی کاموں میں ' اور مقدمات کی پیروی میں ' اُن سے کام لیا جائے - لیکن مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ میری کتاب صرف دنیاداروں کے لیے مخصوص ہو اور ابتداء لوگ اُس سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں - صرف خواص پر وقف ہو '

عوام اُس سے متمتع نہ ہو سکیں - بادشاہ تو اُس سے فائدہ حاصل کریں ' لیکن عام رعایا اُس سے بہرہ اندوز نہ ہو - اس لیے میں نے ہر فریق کے مذاق کے مطابق عبارتوں کا انتخاب درج کیا ' یہاں تک کہ اِس میں مذاق اور ظرافت کی بہت سی باتیں بھی آگئیں - اِس کتاب کی مثال بالکل دسترخوان کی ہے جس پر ہر شخص کے مذاق کے مطابق کھانے کی چیزیں چن دی گئی ہیں - بعض عبارتیں ایسی بھی ہیں جن میں گرامر کی غلطیاں پائی جاتی ہیں ' لیکن میں نے قصداً اُن کو اس لیے جمع کیا ہے کہ بعض اوقات گرامر کے قاعدوں کی پابندی سے کلام کے حسن اور لطافت میں خلل واقع ہو جاتا ہے - اِسی اصول کی بنا پر قرآن مجید بھی صرف و نحو کے قواعد کا پابند نہیں ہے [۱] " -

جاحظ نے اِس موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اُسکا نام "البیان و التبیین" ہے ' اور وہ اگرچہ ابن قتیبہ کی عیون‌الاخبار سے مختصر ہے ' تاہم اُس نے اِس کتاب میں انشاپردازان و زبان‌آوران عرب کی بہترین عبارتوں اور بہترین تقریروں کا نہایت جامع انتخاب درج کیا ہے ' اور بعض موقعوں پر انشاپردازی کے نہایت عمدہ اصول بتائے ہیں ' مثلاً ایک اصول یہ بتایا ہے کہ ہر شخص کے کلام میں اُسکے نیچر اور کیرکٹر کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے - اِسی بنا پر ایک شخص سے پوچھا گیا کہ خوشی کس کو کہتے ہیں ؟ تو اُس نے کہا کہ " خوبصورت عورت ' کشادہ مکان اور تلومند گھوڑے کو " لیکن دوسرے پولیٹکل آدمی نے کہا کہ " خوشی کہتے ہیں جھنڈے کے لہرانے اور تخت پر بیٹھنے اور اِس طرح سلام کرنے کو کہ اے امیر تجھ پر سلام " - اِسی طرح اور اور اشخاص نے اپنے اپنے نیچر

---

[۱]—یہ اس لیے کہ قرآن مجید سے صرف‌-نحو بنی ہے ' صرف‌-نحو سے قرآن مجید نہیں بنا ہے - [ادارہ] -

اور کیرنگٹر کے مطابق خوشی کی حقیقت مختلف بتائی - اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو زبان کے انشاپردازوں کے کلام کا جو انتخاب کیا جائےگا اُس سے ادبی فوائد کے علاوہ بہت سے اخلاقی نتائج بھی نکل سکیں گے- یعنی اردو زبان کے ادیبوں کی اخلاقی خصوصیات نمایاں ہونگی اور ہندو اور مسلمان انشاپردازوں کے مختلف ذوق و میلان کا اندازہ ہو گا -

ایک اور اصول یہ بتایا ہے کہ چونکہ طویل تحریروں کے پڑھنے سے لوگ گھبرا جاتے ہیں اس لیے اُنکی گھبراہٹ کے دور کرنے اور اُنکی دلچسپی کے قائم رکھنے کے لیے اِس بات کی ضرورت ہے کہ سلسلۂ کلام میں تبدیل ذائقہ کے لیے تغیرات پیدا کیے جائیں - لیکن وہ تغیرات بالکل اصل موضوع سے الگ نہ ہوں بلکہ اُس سے میل کھانے والے ہوں - یعنی قصیدہ اور گریز قصیدہ میں باہم مناسبت ہو -

غرض جاحظ کی کتاب کا مطالعہ اگر غور و فکر کے ساتھ کیا جائے تو اُس سے تحریر و تقریر کے بہت سے قابل تقلید اصول مستنبط ہوسکتے ہیں ' اور ہم اردو زبان کی نثر کے مجموعۂ انتخاب میں اُن اصول سے کام لے سکتے ہیں ' اور اُنکے ذریعے سے اردو زبان کے انشاپردازوں پر تنقید کرسکتے ہیں -

ابن عبدربہ نے اِس موضوع پر عقدالفرید کے نام سے جو کتاب تین جلدوں میں لکھی ہے ' وہ ہر موضوع اور ہر عنوان کے متعلق عرب کے ادبا و خطبا کے کلام کا بہترین انتخاب ہے - چنانچہ وہ خود اُس کے دیباچے میں لکھتا ہےکہ ہر قوم اور ہر زمانے کے نقادان فن نے مختلف زبانوں میں علم و ادب کا ذخیرہ جمع کیا ہے اور قدما کے عمدہ مضامین اور عمدہ الفاظ انتخاب کیے ہیں یہاں تک کہ لوگوں نے اُس انتخاب کا بھی انتخاب کیا ہے- لیکن اہل ادب کا آخری طبقہ پہلے طبقے سے زیادہ شیریں بیان ہوتا ہے '

کیونکہ پہلے طبقے کا ادبی کارنامہ نقش اول اور آخری طبقے کا کارنامہ نقش ثانی ہوتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں اسی انتخاب کا انتخاب کیا ہے، اس لیے یہ جوہر کا جوہر اور مغز کا مغز ہے - میں نے صرف یہ کام کیا ہے کہ اُن منتخب عبارتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور اُس میں اختصار پیدا کیا ہے - لیکن عبارت کا انتخاب عبارت کے لکھنے سے زیادہ مشکل ہے -

اِن تمام تصریحات سے معلوم ہوا ہوگا کہ کلام منظوم کی طرح کلام منثور کا انتخاب بھی ایک اہم ادبی اور علمی کام ہے -

ہندو انشاپردازوں کا حال تو بدقسمتی سے مجھے معلوم نہیں، لیکن مسلمانوں میں قدامہ بن جعفر، ابن قتیبہ، جاحظ اور ابن عبدربہ جیسے وسیع النظر ادیبوں نے یہ ادبی اور علمی خدمت انجام دی ہے اور اُن کا یہ کارنامہ اُنکے مفاخر میں شمار کیا جاتا ہے - اِن لوگوں نے یہ ادبی خدمت اُس وقت انجام دی ہے جب مسلمانوں کے عہد ترقی میں تصنیف و تالیف کا دور شباب تھا -

خوش قسمتی سے آج ہماری اردو زبان بھی ترقی کے اُسی دور سے گزر رہی ہے جو خلافت عباسیہ میں عربی زبان پر گذر چکا ہے - دنیا بھر کے تمام علوم و فنون کی کتابیں اردو زبان میں لکھی جا رہی ہیں، اور انشاپردازوں اور ادیبوں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کا موضوع تحریر اور طرز تحریر ایک دوسرے سے مختلف ہے - اس لیے ضرورت ہے کہ مختلف مضامین اور مختلف عنوانات پر اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کو تنقیدی نگاہ اور فن انشاپردازی کے اصول و قواعد کے مطابق پڑھا جائے، اور اُن کے مضامین اور تصنیفات میں نثر کے جو عمدہ ٹکڑے، جو عمدہ فقرے اور جو عمدہ عبارتیں نظر آئیں، اُن کو مختلف عنوانات کے

تحت میں جمع کیا جائے اور مختلف حیثیتوں کو پیش نظر رکھکر کلام منثور کا ایک منتخب مجموعہ تیار کیا جائے -

(۱) اُس کی پہلی حیثیت تو تاریخی هو - یعنی اردو زبان میں جب سے نثر نگاری کا سلسلہ قائم هوا هے ' اُسوقت سے لیکر آج تک جو لٹریچر تیار هوا هے ' اُس سے ایسی عبارتیں منتخب کی جائیں جن سے ایک هی مضمون کے متعلق اردو انشاپردازی کی تدریجی ترقی اور اُس کے تدریجی تغیرات کا حال معلوم هوسکے -

(۲) اُس کی دوسری حیثیت علمی هو - یعنی صرف اردو زبان کے مشہور مصنفین کے مضامین و تصنیفات سے عبارتیں انتخاب نہ کی جائیں ' بلکہ اردو میں تاریخ ' مذهب ' اخلاق ' فلسفہ ' تصوف ' سیاست ' ناول و افسانہ ' بلکہ هزل و ظرافت کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا هے سب کو پیش نظر رکھ کر هر موضوع کے متعلق عمدہ عبارتیں انتخاب کی جائیں - تاکہ اردو زبان کے تمام انشاپردازوں کی حیثیت اور قدر و قیمت کا اندازہ هوسکے - اور هر قسم کے مصنف اور انشاپرداز اُس کو اپنے لیے شمع راہ بنا سکیں - ابن قتیبہ نے اِسی اصول کے مطابق انتخاب کیا هے ' چنانچہ وہ لکھتا هے کہ حکمت کی بات کو جس شخص سے بھی سنو لے لو ' کیونکہ حکمت اور چیز هے اور حکیم اور چیز ' تیر انداز اور هے اور شکار اور - دین و مذهب کا علم تو ایک تقلیدی علم هے اور تم اُس کو صرف اُسی شخص سے سیکھ سکتے هو جس کو اپنے لیے حجت و سند سمجھتے هو - لیکن متاخرین کے کلام کا جو انتخاب هم نے کیا هے اُس کا اصول صرف یہ هے کہ اُس کے الفاظ اور مضامین پاکیزہ هیں ' یہ کوئی عیب نہیں هے کہ وہ متاخرین کا کلام هے - کیونکہ اگر یہ کلام الفاظ اور مضامین کے لحاظ سے پاکیزہ نہ هوتا تو صرف اُس کی قدامت سے اُس کا پایہ بلند نہ هوتا -

(۳) اُس کی تیسری حیثیت لسانی ہو - یعنی ہر قسم کے مضامین کے متعلق ایسی تحریریں اور ایسی عبارتیں منتخب کی جائیں جن سے معلوم ہوسکے کہ اردو کی تصنیفی زبان کیا ہے ؟ موجودہ مصنفین میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کے بھدے الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں کی بھرمار کردیتے ہیں - کچھ لوگ ایسے ہیں جو سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ اپنی تحریروں میں شامل بلکہ رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں - کچھ لوگ ایسے ہیں جو عربی اور فارسی ' بلکہ اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے بھی اجتناب کرتے ہیں ' اور اِس کا نام خالص اردو رکھتے ہیں - لیکن ایک سنجیدہ گروہ ایسا بھی ہے جو اگرچہ فارسی اور عربی کے بھدے الفاظ کا استعمال نہیں کرتا ' تاہم فارسی اور عربی کے متین اور شاندار الفاظ سے اپنی تحریروں کو زینت دیتا ہے ' اور سنسکرت اور بھاشا کے ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال نہیں کرتا - اِس بنا پر اردو زبان کے کلام منثور کے مجموعۂ انتخاب کی تیاری سے پہلے اِن مختلف قسم کی تمام تحریروں کو پیش نظر رکھکر ہم کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اِن میں اردو کی تصنیفی زبان کون ہے ؟ اور اِس فیصلے کے بعد صرف اُن عبارتوں کا انتخاب اِس مجموعے میں شامل کرنا چاہیے ' جس کو ہم نے اردو کی تصنیفی زبان قرار دیا ہے - اور اِس کے بعد طرز تحریر کے یہ تمام اختلافات مٹ جائیں گے -

سب کے آخیر میں ہمکو یہ دیکھنا چاہیے کہ اِس موضوع کے متعلق اردو زبان میں کس قدر ذخیرہ موجود ہے - اور اُس ذخیرے کی موجودگی میں ہمکو اِس قسم کے مجموعۂ انتخاب کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

اِس موضوع کے متعلق اردو زبان میں تصنیفات کا جو ذخیرہ موجود

هے ' اُس کی مختلف قسمیں ہیں -

(۱) ایک تو وہ کتابیں ہیں جو اردو نثر کی تاریخ پر لکھی گئی ہیں' مثلاً سیرالمصنفین از محمد یحیی تنہا ' تاریخ نثر اردو از مولوی احسن مارہروی ' دکن میں اردو از نصیرالدین ہاشمی ' ارباب‌نثراردو از سید محمد بی- اے' تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ' لیکن اِن کتابوں میں مصنفین اردو کی عبارتوں کا کہیں کہیں جو انتخاب دیا گیا ہے ' وہ ہمارے مقصد کے لیے ناکافی ہے - اِن میں بعض کتابیں تو ایسی ہیں جن میں سرے سے مصنفین کی عبارتوں کا انتخاب ہی نہیں دیا گیا ہے - سیرالمصنفین میں اقتباسات موجود ہیں ' لیکن وہ کسی خاص عنوان سے تعلق نہیں رکھتے ' بلکہ اُن سے صرف مصنفین کا طرز تحریر دکھلانا مقصود ہے - مولوی احسن مارہروی نے البتہ نہایت کثرت سے نمونے دیے ہیں اور ہم اُن سے اردو زبان کی تاریخی حیثیت کے نمایاں کرنے میں بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - لیکن ہمارا جو اصل مقصد ہے یعنی انشاپردازی کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کا انتخاب وہ اِس سے بھی پورا نہیں ہو سکتا - تاہم مجموعی طور پر ہم اِن کتابوں سے مصنفین کی کتابوں کے نام اور اُنکے خصوصیات انشا و تحریر کا پتا لگا سکتے ہیں ' اس لیے وہ اِس قسم کے انتخاب میں بہت کچھ مدد دے سکتی ہیں -

(۲) دوسری وہ کتابیں ہیں جن میں مصنفین کے پورے پورے مضامین انتخاب کیے گیے ہیں ' مثلاً اسکولوں کے کورس ' خیابان اردو از احمد عارف حیدرآبادی ' انتخاب مخزن ' انتخاب نقیب ' انتخاب کلابی اردو ' کائنات ادب - لیکن عربی زبان میں انتخابات جس وسیع پیمانے پر کیے گئے ہیں اُنکے مقابل میں یہ انتخابات بالکل ہیچ معلوم ہوتے ہیں - اس لیے ہم کو اپنے انتخاب کا پیمانہ اِس سے بہت زیادہ وسیع کرنا چاہیے '

اور ہر قسم کے عنوانات قائم کر کے اردو زبان کے انشاپردازوں کی عبارتوں کا انتخاب نہایت کثرت سے کرنا چاہیے -

(۳) تیسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جو آداب تحریر اور اصول تنقید پر لکھی گئی ہیں ' مثلاً سلیقۂ تحریر از محمد مسلم ایم - اے ' اور روح تنقید از سید غلام محی الدین قادری - ہم کو اپنے انتخاب میں اِن کتابوں کے اصول و قواعد کو اگرچہ تنقیدی حیثیت سے پیش نظر رکھنا چاہیے ' تاہم اگر اُن پر اضافہ ہوسکے تو اضافہ کرنا چاہیے ' اور اگر اُن میں کوئی غلطی ہو تو اُس کی تصحیح کردینی چاہیے -

بہر حال ہم کو جس بحر بےکنار کی شناوری کرنا ہے ' یہ کتابیں اُس کے چند قطروں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں - اس لیے انتخاب کے معیار کو بہت زیادہ بلند کرنا چاہیے - لیکن انتخاب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف طویل تحریریں ہی انتخاب میں آسکتی ہیں - ایک پر زور فقرہ بھی جو بلاغت و فصاحت کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے' انتخاب میں آسکتا ہے - چنانچہ جاحظ وغیرہ نے زیادہ تر اِسی قسم کے فقرے اور اِسی قسم کی مختصر تحریروں کا انتخاب کیا ہے -

اردو زبان نے پچھلے پچھتر برس میں میر امن اور غالب کے زمانے سے لیکر اِسوقت تک جو ترقی کی ہے اور اردو انشاپرداز اور اہل قلم جس کثرت سے پیدا کیے ہیں ' اُن کی تصنیفات سے ایسا انتخابی ذخیرہ مہیا کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے -

اِن تصنیفات کے علاوہ ہمارے خطیبوں کی پرزور تقریریں بھی ہیں جن کو افسوس ہے کہ ابھی تک علحدہ مستقل حیثیت نہیں دی گئی ہے - حالانکہ یہ ادبیات کے ذخیرے کا قیمتی سامان ہے - پھر بھی انجمنوں کی رودادیں اگر اور کسی کام نہیں آتیں تو کم از کم اُن کا اِتنا

ادبی فائدہ تو ضرور ہے کہ اُن میں ہمارے بہت سے خطیبوں کی عمدہ تقریریں ضبط تحریر میں آگئی ہیں سر سید اور نواب محسن‌الملک کی تقریریں علحدہ بھی شائع ہوئی ہیں - مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے پریسیڈنٹوں کے افتتاحی خطبوں کا مجموعہ بھی چھاپا ہے - ندوۃالعلما کی رودادوں میں بہت سے علما کی تقریریں محفوظ ہیں - اگر انتخاب میں اِن سے بھی فائدہ اٹھایا جائے تو ہمارے نو آموز اہل قلم اور مقرروں کے لیے یہ بہترین نمونے کا کام دے سکتا ہے -

مختلف انشاپردازوں کے خطوط کا مجموعہ بھی اِس کام کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور اردو زبان میں متعدد انشاپردازوں کے خطوط کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں -

جدید اردو کی ابتدائی مثنویاں

[از مولوی عبدالقادر سروری ' ایم اے ' ال ال بی - جامعۂ عثمانیہ - حیدرآباد دکن]

قدیم اردو شاعری کا عہد ' گویا بیجاپور اور گولکنڈے کے بچے کھچے شاعروں اور اُن کے تابعین پر ختم ہوجاتا ھے - قدیم طرز کا سب سے نمایاں مسلک مثنوی نگاری تھا ' جسکا ذوق ولی اورنگ آبادی کے زمانے کے بعد سے کم ہوتا گیا - جدید عہد کی شاعری میں غزل اور تغزل ' غنائی اور عاشقانہ طرز کو تمام و کمال اہمیت حاصل ہوئی - اور عصرحاضر تک اردو شعرا کا یہی نمایاں مسلک رہا - جدید عہد میں' محض مثنوی لکھنے والے شاعر شائد ایک دو سے زیادہ دستیاب نہیں ہو سکیں گے - اور اِس کی ذمہ دار بڑی حدتک خود ولی اورنگ آبادی کی شاعری ھے -

ولی نے اِس میں شک نہیں کہ قدیم طرز شاعری کے ماحول میں نشوو نما پائی تھی ' لیکن اُن پر گوناگوں اثرات کام کر رہے تھے - ہر بڑے شاعر کی طرح ' اُن کی شاعرانہ قابلیت اور طبیعت کی اپج اپنے زمانے سے مختلف تھی - وطن میں شعر و ادب کی کس مپرسی اور طبیعت کے ذوق تماشا نے ' اُنہیں نو عمری ہی میں ' وطن کو اور وطن کے ساتھ ' اُس کی شاعری کے ماحول کو خیر باد کہنے پر مجبور کیا - گجرات اور احمد آباد کے علما اور ادیبوں کے درمیان رہنے سہنے سے ' اُن پر فارسی ادب اور اساتذۂ سخن ' اور خاص طور پر حافظ شیراز کے کلام کا بڑا اثر پڑا - فطرتاً اُن کی فکر شعری نے یہی رخ اختیار کر لیا -

ولی جب دهلی پہنچے تو یہاں مغلیہ سلطنت ' اور اُس کے ساتھ فارسی کا ستارہ غروب هورها تها - یہاں کے فارسی‌گو شعرا نے ' جب اُن کا کلام سنا تو اُنھوں ایسا معلوم هوا کہ " یہ بھی اُن کے دل میں ھے " کیونکہ اردو اُن کی زبان تھی - گو مرکز گریزی کی خاصیت کی وجہ سے ' اُس کا رنگ روپ کچھہ بدل گیا تھا - اِس زبان اور اُس کی شاعری کی طرف اُن کا اِس وقت بھی مائل نہ هونا ' خلاف فطرت هوتا - یہی سبب تھا کہ تھوڑے عرصے کے اندر اندر ' دهلی میں اردو شاعری کا ذوق روز افزوں نشو و نما پانے لگا -

ولی کی شاعری کا حاصل ' غزل ھے - مثنویاں اُنھوں نے بہت کم لکھیں - اُن کے کلیات میں صرف دو مثنویاں ملتی ھیں ' جو مختصر ھیں - اُن میں سے ایک روحانی کیفیات اور واردات کا مرقع ھے اور دوسری شہر سورت کی تعریف میں - اِسی طرز کی مثنویاں شمالی هند میں ابتداء رائج رهیں - ذیل میں " مثنوی درتعریف سورت " کا ایک دل‌چسپ اقتباس پیش کیا جاتا ھے -

عجب شہراں میں ھے پرنور یک شہر
بلا شک وہ ھے جگ میں مقصد دھر
اھے [۱] مشہور اُس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ھے یہ نور
اچھو [۲] اِس نور سوں [۳] هرچشم‌بد ' دور
شہر جوں منتخب دیوان ھے سب
ملاحت کی وہ گویا کھان [۴] ھے سب

[۱]—ھے - [۲]— رهے - [۳]—سے - [۴]—کان -

سرج[۱]، سن آب اُس کی، جگ میں کانہا
سمندر موج زن رگ رگ میں کانہا
کنارے اُس کے اک دریاے تہتی[۲]
کہ دنیا دیکھنے کوں اُس کے تہتی
شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ
دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آب خضر کی ہے اُس میں تاثیر
ہوا دیتی ہے اُس کی یاد کشمیر
عجب قلعہ ہے واں اک با قرینہ
انگوٹھی میں دنیا کی جیوں نگینہ
نزک [۳] قلعے کے بازا گہات ہے واں
کہ دائم گل رخاں کی ہات ہے واں
....
....
کہ اُس بھیتر[۴] کتے[۵] ایسے ہیں تجار
کہ قاروں کو نہیں اُن کے نزک بار
اتی [۶] آتش پرستاں کی ہے بستی
سکے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اُس میں اِتّے [۷] ہیں کلہ پوش
مدد داں جن کی گنتی میں ہے بے ہوش
وہاں ساکن اتے [۸] ہیں اہل مذہب
کہ گنتی میں نہ آویں اُن کے مشرب

[۱]—سورج - [۲]—تاپتی - [۳]—نزدیک - [۴]—اندر - [۵]—کتنے - [۶]—اتنی -
[۷]—اتنے - [۸]—اتنے -

اگرچہ سب ھیں وہ ابنائے آدم
ولے بھنٹں میں رنگا رنگ عالم
بھری ھے سیرت و صورت سے سورت
ھر اک صورت ھے واں انمول مورت
سبھا اندر کی ھے ھر اک قدم میں
چھپا اندرسبھا' کوے عدم میں
.... کھینچے شوخ آنچل
وہ مکھ کے باغ کن دیوار آنچل
نظر بھر کر دکھو [۱] ھر گل‌بدن کوں[۲]
کہ ھے پردے سوں بے پروا اُنن [۳] کوں
پڑا شیریں بچن سن اُن کے بس جو
پھنسا اُس شہد میں جاکر مگس ھو
شہر بھیکر جو آوے نہان کا دن
ھندو کی قوم کے اشنان کا دن
ھر اک جانب دکھو ھیں فوج در فوج
تجلی کے سمندر کی اُتھی موج
نھن کی بیٹھ کشتی پر تراے پاک
یہ طے کر سہج میں موج خطرناک
بہت باتاں ھے بس کر اے "ولی" تو
نہ کر مقصد سوں اپنے کاھلی تو

جدید دور میں' مثنوی کی ترقی کی ابتدا' میر تقی میر کے ھاتھوں ھوئی - اُنھوں نے اگلے تمام شعرا کے مقابلے میں زیادہ مثنویاں

---

[۱]—دیکھو - [۲]—کو - [۳]—انھوں -

لکھیں - اور پھر محض مرقعوں اور " دسکر پٹھو " مثنویوں کو بھی اُنہوں نے بسیط تر بنانے اور جزئیات پر زیادہ حاوی کرنے کی کوشش کی - قصوں کو اُنہوں نے پھر مثنوی کے ساتھ جوڑا - لیکن اِس خصوصیت میں ' میر کی مثنویاں بہت ابتدائی نمونے کی ہیں - اِس میں شک نہیں کہ اُن کے قصوں میں سادگی یہاں زیادہ نمایاں اور فوق الفطرت عناصر کم ہیں ؛ پھر بھی نصب العینیت اور رومانیت سے بالکل خالی نہیں ہیں ' جو قدیم قصوں کا لازمہ ہے - اِن مختصر قصوں میں ' مناظر اور مکالموں کی بھی کمی ہے -

لیکن یہ اضافی نقطۂ نظر ہے - بلفسہٖ میر کی مثنویاں ' اردو میں ' اپنی آپ نظیر ہیں - اُن کے معاصر سودا کی مثنویوں میں یہ لطف بھی نہیں ہے - سودا کے قصوں میں قصہ پن کم اور مرقعوں میں مشاہدے کے عمق کا فقدان ہے - اُن کی صرف ایک مثنوی " قصۂ زر گر پسر و شیشہ گر " پڑھنے کے قابل ہے -

دہلی کی تباہی سے پہلے ؛ شمالی ہند میں طویل ؛ بسیط اور مکمل ادبی مثنویاں لکھی ہی نہیں گئیں - صرف ایک مثنوی " خواب و خیال " اِس میں شک نہیں کہ اگلی تمام مثنویوں سے زیادہ طویل ہے اور مرقع نگاری میں ' اُس کے بعض پارے بے مثل ہیں ' اُس کے اسلوب کی سادگی اور لطف زبان بھی قابل داد ہے لیکن اُس کے تناسب اور تکمیل میں نمایاں اسقام ہیں - وہ قصے سے شروع ہوتی ہے اور تصوف پر ختم ہوتی ہے - سراپا کا مرقع اُس کی جان ہے - بظاہر اُس میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے لیکن سراپا میں قصہ گُم ہو جاتا ہے ؛ اور اختتام مبہم رہ جاتا ہے -

دکن میں ولی کے بعد مختصر مرقعوں کی طرز کی مثنویاں بھی رائج ہو گئیں - لیکن قدیم طرز کی قصے دار مثنویاں بھی ' اُسی شرح

و بسط کے ساتھ لکھی جاتی رهیں - پہلی قسم کی مثنویوں پر ولی کے جانشین، سراج اورنگ آبادی کے سوا بہت کم شاعروں نے طبع آزمائی کی - اور دوسری قسم کی مثنوی کو سراج نے ، گویا معراج کمال پر پہنچا دیا -

مختصر مثنویاں سراج نے کل چھ لکھیں - لیکن اُن کا رنگ خاص هے - یہ سب کی سب متصوفانہ خیالات کی حامل هیں - عاشقانہ مثنویوں میں بھی ، تصوف کا رنگ غالب هے - اِن مثنویوں کا انداز بیان نہایت اثر خیز هے - لیکن واقعہ یہ هے کہ مختصر مثنویوں کا لطف میر کے ساتھ مخصوص هو گیا هے-

سراج کی طویل مثنوی " بوستان خیال " قدیم دور کی بہترین اور اردو کی بلند پایہ مثنویوں میں سے هے - اُس کی عظمت کی بنیاد طوالت نہیں ، بلکہ اُس کے شاعرانہ کمالات هیں - سراج کا اسلوب ، جدید روزمرہ سے قریب ترین اور میر اور سودا کے اسلوب سے بہت کم مختلف هے - اِس مثنوی کا لطف ، مناظر کے مصورانہ بیانات ، مرقعوں اور جذبات انسانی کی صحیح صورت گری اور سب سے بڑھکر بیان کے پردرد انداز میں هے - اگر روز مرہ کے اختلافات کو وجہ امتیاز بنایا جا سکتا هے ، تو " بوستان خیال ، کا درجہ " سحرالبیان " کے بعد هے ، ورنہ اِس کے بعض پارے " سحرالبیان " پر بھی فوقیت رکھتے هیں - مثال کے لیے ذیل کا اقتباس ملاحظے کے قابل هے :—

ارے همنشینو مرا دکھ سنو	مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
مرے پر عجب طرح کے درد هیں	کہ سب درد اِس درد کے گرد هیں
فلک هوئے تو اِس درد سے جائے لوٹ	جگر کے جگر کے جگر میں هے چوٹ
کہوں کیا کلیجے میں سوراخ هے	مری داستاں شاخ در شاخ هے
اگر سنگ بھی حال میرا سنے	تو حیرت سے چکرت میں آ سردھنے

نہایت کو ہوتی ہے جب بے کلی | تو کہتا ہوں میں کیا خفی کیا جلی
مرے پر نہت درد ہے یا رہی ! | عجب صاحبی ہے عجب صاحبی
نہ کھلتا ہے جی گشت گلزار میں | نہ لگتا ہے جی سیر بازار میں
اگر سلطنت ہاتھ آوے تو کیا | وگر کیمیا کئی [۱] بتاوے تو کیا
کہ جمعیت دل پریشان ہے | مرا فرحت آباد ویران ہے
جو دل کو خوشی ہوئے تو سب خوب ہے | جو مرغوب نیں [۲] ہے سو مرغوب ہے
وگر نہ خدائی خوش آتی نہیں | کسی شخص کی بات بھاتی نہیں
اگر حور آوے تو بے نور ہے | پری کی کہوں بات تو دور ہے

.... | ....

رگ جاں کئے سن کے تار رباب | خوشی کے ہیں سامان مجھ پر عذاب

" بوستان خیال" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدیم مثنویوں کے تفصیلی بیانات اور جزئیات کے مرقعوں اور جدید مثنوی کی حقیقیت اور تکمیل کا بہترین مجموعہ ہے -

اِس زمانے میں بھی قدیم طرز کے وفا شعار پیرو کچھ باقی رہ گئے تھے ' جن میں نوازش علی خاں شیدا خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اُن کی دو مثنویاں مشہور ہیں ' جو خاصی طویل اور بسیط ہیں - اُن میں سے ایک " روضۃالاطہار " ہے - اور دوسری " اعجاز احمدی "- یہ دونوں مثنویاں قدیم مذہبی اثر کی یادگار ہیں -

ایک اور قابل ذکر مثنوی " قصۂ لعل وگوہر ' ہے ' جو عارف الدین خاں عاجز سے منسوب ہے - یہ غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی مثنوی ہے - جس کے واقعات ' افراد اور بیانات سب فرضی اور نصب العینی ہیں - لیکن اِس کا اسلوب لطف سے خالی نہیں ہے - اسی لیے معاصرین

[۱]—کوئی - [۲]—نہیں -

پر اِس کا بڑا اثر تھا - چنانچہ شاہ غلام قادر سامی جو برار سے آکر اورنگ‌آباد میں مقیم ہوگئے تھے اور اپنے زمانے کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے ' اِس مثنوی سے اِتنے متاثر ہوئے کہ اِس کے جواب میں ایک طویل مثنوی " قصۂ سرو شمشاد " لکھ ڈالی - شاہ سامی کے معاصر اور رفیق ' لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ‌آبادی نے " چمنستان شعرا " میں اِس مثنوی کی بڑی تعریف لکھی ہے ' اور اِس کے طویل اقتباسات بھی نقل کیے ہیں ' جو پڑھنے کے قابل ہیں - لیکن یہ مثنوی اب غالباً نایاب ہے - سامی کی ایک اور مثنوی " طالب موہن " کا ذکر بھی شفیق نے اپنے تذکرے میں کیا ہے - یہ مثنوی بھی اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتی - انڈیا آفس کے کتب خانے میں " طالب و موہنی " کے عنوان کی جو مثنوی موجود ہے ' اُس کے مصنف میر سید محمد والہ بتلائے جاتے ہیں - یہ سنہ ۱۱۷۱ھ کی تصنیف ہے - والہ حیدرآباد کے باشندے تھے ' لیکن انورالدین خاں والا جاہ سے توسل کے سبب وہ آرکاٹ چلے گئے تھے -

اِس میں شک نہیں کہ ولی کے اثر سے ' اِس وقت دکن میں ' غزل کا کافی رواج ہوچکا تھا ' تاہم مثنویاں بھی برابر مسلسل لکھی جاتی رہیں - اکثر شعرا جن کا ذکر اِس دور کے تذکروں میں ملتا ہے ' نہ صرف غزل ' بلکہ مثنویاں ' اور خاصی طویل مثنویاں بھی لکھتے تھے - لیکن اِن مثنویوں میں سے اکثر ابھی گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں -

اِس دور کی مثنویوں کا تبصرہ ختم کرنے سے پہلے دکن کی ایک نہایت دلچسپ مثنوی کا ذکر ضروری ہے - یہ لالہ لچھمی نارائن شفیق کی مثنوی " تصویر جاناں " ہے - شفیق اورنگ آباد کے باشندے اور مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد رشید ہیں - اِس طرح اُن کی زبان پر شمالی ہند کے محاورے کا کافی اثر ہے - شفیق کی مثنوی ایک طبعزاد

اور اچھی قصے پر مشتمل ہے - اور اِس قابل ہے کہ اردو کی اعلی پایہ مثنویوں میں اُس کو جگہ دی جائے - اِس میں کمی صرف بسیط مناظر اور مرقعوں کی ہے ، جو " بوستان خیال " اور " سحرالبیان " کی جان ہیں -

گولکنڈے کی تباہی کے بعد ، یہاں کے شعرا مشرقی دکن ، مدراس کرنول ، سدھوٹ ، آرکاٹ ، ویلور وغیرہ کی طرف منتشر ہو گئے تھے - یہاں چند امرا ، جن میں سے بعض قدیم سلطنت گولکنڈہ کے متوسل رہ چکے تھے ، اِن کی قدر دانی کرنے کو موجود تھے - اِن خانہ بدوش شعرا کے اثر سے ، اِس نواح میں بھی اردو شاعری کا ذوق پھیل گیا - اور کئی اچھے شاعر پیدا ہو گئے - اِن میں ، مثنوی نگاری کے اعتبار سے مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری کا خاص درجہ ہے - یہ بڑے پر گو شاعر اور انشاپرداز تھے - اِنہوں نے ایک دیوان کے علاوہ ، جس کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا ہے ، کئی مثنویاں چھوڑیں - یہ مثنویاں مذہبی معتقدات اور متصوفانہ موضوعات پر مشتمل ہیں - اِن میں " ریاض الجناں " " ھشت بہشت " " محبوب القلوب " " مثنوی روپ سنگار " " گلزار عشق " " قصۂ رضوان شاہ " وغیرہ خاصی شہرت کی مالک ہیں - آگاہ ، مثنوی قدیم اساتذہ کے اُصول پر لکھتے تھے ، اور نہایت روانی اور سلاست کے ساتھ - اسی لیے اُن کی مثنویاں ، مدراس کے علاقوں میں آج تک بھی پڑھی جاتی ہیں -

دھلی میں جب اردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی ، اُس کے تھوڑے عرصے کے اندر اندر اُس کا اثر ، دور دور تک پھیل گیا - چنانچہ پنجاب میں بھی کئی اچھے شاعر اور مثنوی نگار پیدا ہوئے ، جن کی کوشش سے ، دبستان دھلی کے اتباع میں ، پنجاب کی قدیم شاعری کا طرز بدلنے لگا - غزل ، مثنوی ، ترجیع بند ، ترکیب بند غرض اکثر مقبول اصناف میں یہاں نظمیں لکھی جانے لگیں - مثنوی نگاروں میں صرف دو کا ذکر

ضروری ہے - اُن میں سے ایک حضرت غلام قادر شاہ ہیں جن کی وفات سنہ ۱۱۷۶ھ میں ہوئی - یہ بڑے صاحب باطن بزرگ تھے - اِن کے حالات اور اِن کی مثنوی '' رمزالعاشقین '' کا ذکر پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے '' پنجاب میں اردو'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے - مثنوی کے متعلق ' وہ رقمطراز ہیں - '' اِس مثنوی کا وزن عروضی ' خالص ہندی ہے - پنجابی لہجے کی تمام خصوصیات اِس میں موجود ہیں '' - (ص ۲۵۱) یہ در حقیقت ' دہلی کے اسکول سے بہت کم متاثر ہو سکی - اور قدیم مذہبی شاعری کا نمونہ ہے - اِس کا اقتباس '' پنجاب میں اردو'' سے یہاں نقل کیا جاتا ہے -

سات مراتب بوجھ پیارے   ہر ہر کے ہیں حکم نیارے
مت کر سوں[۱] توں[۲] کرتحقیق   ناں ہو ملحد ناں زندیق
فرق ار جمع میں[۳] فرق پچھان   پھر دونوں کوں ایک ہی جان
بوجھ لوؤ تنزیہہ کوں خوب   ناں ہو ملحد ناں محجوب
ہوں تشبیہہ کوں جانوں نیک   پھر دونوں کوں جانوں ایک
ظاہر میں ہے وحدت کثرت   باطن میں ہے کثرت وحدت
قدم وجوب کے سبھ اسماء   جانوں فاعل فی الاشیاء
ازلی ابدی ہیں درکار   نانہ معطل ناں بے کار
اس مشہد میں ہے مسجود   فہوالواحد والمقصود

پنجاب ہی کے ایک اور بزرگ حضرت مراد شاہ ہیں ' جو لاہور کے رہنے والے تھے - اِنہوں نے لکھنؤ کا سفر بھی کیا تھا ' اِس لیے اِن کے اسلوب پر وہاں کے اساتذہ کا اثر کافی ہے - یہ صاحب دیوان ہیں - اپنے ایک شاگرد کی فرمایش پر ' اِنہوں نے قصۂ چار درویش کو بھی نظم

[۱]—سے - [۲]—تو - [۳]—میں -

کرنا شروع کیا تھا ' لیکن اُس کی تکمیل نہ کرسکے اور سنہ ۱۲۱۵ھ میں انتقال کرگئے -

دھلی کے اساتذہ مثلاً میر اور سودا کی طرز میں یہ مثنوی خوب لکھتے تھے - اور جیسا کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے لکھا ھے ' "اِن کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ھے " [۱] -

ذیل میں اِن کی ایک دل‌چسپ مثنوی ' " مگس نامہ " کا کچھ حصہ " پنجاب میں اُردو " سے نقل کیا جاتا ھے - لاھور کی تعریف میں لکھتے ھیں :-

کیا بہار اِس کی میں کروں تحریر ‏ شہر تھا یا مرقع تصویر
گلعذاروں پہ حسن کی تھی بہار ‏ گل تھے ھر ایک کے گلے کے ھار
کھینچتے تھے دکھا کے رخ دل کو ‏ خانہ خانہ میں تھے کماں ابرو
.... ‏ ....
خوب رو تھے حیا سے سب موصوف ‏ اور عاشق وفا میں تھے معروف
.... ‏ ....
رشک آبادی جہاں تھا یہ ‏ الغرض خوب ھی مکاں تھا یہ
سو زمانے نے ایسی زشتی کی ‏ خوبی اِس قطعۂ بہشتی کی
لے کے دوزخ میں ڈال دی یکبار ‏ وقنا ربنا عذاب‌النار
.... ‏ ....
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ھے ‏ مکھیوں کی غرض دھائی ھے
زر تو شاہ زماں سدھارے لے ‏ مکھیوں کو گئے اِجارہ دے
اب ھیں پر مکھیوں سے سب لاچار ‏ ھیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار
نہیں آرام اِن سے رات اور دن ‏ کھاگئیں کان سب کے کر بھن بھن

[۱]—پنجاب میں اُردو ص ۲۹۶ -

دن کو کیا کبھی بات کھانے کی | اُٹھ گئی رسم ہی پکانے کی
آتش جوع نے جگر کو کباب | جس کے دل کوں کیا سو ہو بے تاب
خشک روٹی کہیں پکاتا ہے | کس مصیبت سے وہ بھی کھاتا ہے
اور قلیہ پلاؤ کھائے کون | ہوسکے کس سے اور پکائے کون
یک کٹی شب کہیں جو تھوڑي دال | اُس کے کھانے کا کیا لکھوں احوال
ماش کا دیکھ بیچ میں چھلکا | کیا کے وسواس وہ جو تھا دل کا
ملہ سے لقمہ وہیں اگل ڈالا | دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا
یا یہ کہتے تھے کیا ہوا ، ہے ہے ، | لائیو طشت مجھ کو آتی ہے۔۔۔

فقیراللہ آزاد بھی اسی زمانے کے ایک بزرگ تھے ، جنھوں نے سنہ ۱۲۰۴ھ میں ایک مثنوی " در مکاں " لکھی تھی۔ اِس کی بحر ھندي ہے - اور اِس کو پڑھنے سے شاہ برھان الدین جانم کی مثنویوں کی یاد ذھن میں تازہ ہوجاتی ہے -

پنجاب ھی کے ایک اور شاعر رحمت اللہ شاہ نامی نے اِسی زمانے کے قریب " شیریں فرھاد " کے قصے کو مثنوی میں نظم کیا تھا - اِس کي خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں ہر نو دس شعر کے بعد ایک دوھا آجاتا ہے - اِس کي زبان کے متعلق پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے کہ یہ " بھاشا اور پنجابی آمیز ہے - اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابي غالب ہے اور کبھی برج " [۱] -

جدید طرز کی ابتدائی مثنویوں کا دور ، اِنھیں مثنویوں پر ختم ہو جاتا ہے- اس کے بعد لکھنؤ کی ترقی یافتہ مثنویوں کا دور شروع ہوتا ہے-

---

[۱]—پنجاب میں اُردو ص ۳۰۵ -

بنارسی تارکشی کی اصطلاحیں

[از جناب غلام رسول ، بی اے]

صنعت و حرفت کے لحاظ سے ہندوستان ایک طویل زمانے تک نہ صرف دیگر ممالک کے دوش بدوش بلکہ اکثر اُن سے پیش پیش رہا ہے - مگر اب یہ عالم ہے کہ اپنی روزانہ ضروریات کی معمولی سے معمولی چیزوں کے لیے بھی دوسروں کا دست‌نگر رہتا ہے اور اگر یہی حالت چندے اور رہی ، تو جہاں حضرت اقبال کی پیشین گوئی کا یہ حصہ پورا ہوچکا ہے کہ کفن جاپان سے آرہے ہیں ، وہ وقت دور نہیں کہ غسّال بھی کابل سے آیا کریں - مثل مشہور ہے کہ کرتا استاد اور نہ کرتا شاگرد ہوجاتا ہے - اب ہم اپنی قدیم صنعتوں کو اِس قدر بھول گئے ہیں کہ ہر عمدہ چیز کو غیر ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اُس کا ہندوستان میں تیار ہونا غیر ممکن اور اہل ہند کی طاقت سے باہر خیال کرتے ہیں - تار کشی کی صنعت اُنہیں بدنصیب یا کم‌نصیب صنعتوں میں سے ہے جن کا کمال توڑی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے ، الا ما شاء اللہ -

اگر چاندی کی ایک سل پر بال سے زیادہ باریک چاندی کی ایک تار رکھ دی [۱] جائے ، اور کہا جائے کہ یہ تار اِسی چاندی کی سل سے بنی ہے ، تو اکثر احباب تو اِس کہنے والے کو احمق سمجھیں گے ، اور کچھ روشن دماغ ایسے ہوں‌گے کہ اِس کو یورپ کے کمال کا ایک کرشمہ سمجھ کر فرانس اور جرمنی سے منسوب کریں گے - غرض کہ عام رائے اُس کے

[۱]—بنارس کے تارکشوں کی زبان میں " تار " مونث ہے -

غیر ہندی ہی ہونے کے موافق ہوگی - مگر جن لوگوں نے کہ ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کے ساتھہ اُس کے تمدن کا بھی مطالعہ کیا ہے ' وہ بغیر کسی پس و پیش کے اِسے ہندوستان کی ہزارہا نادرالوجود صنعتوں میں سے ایک کی یادگار سمجھہ کر اِس کے ہندوستانی ہونے کا فتویٰ دے دیں گے ' اور یہی درست بھی ہوگا -

یہ بتانا کسی قدر مشکل ہے کہ ہندوستان میں فن تارکشی کی ابتدا کس زمانے سے ہوئی ' مگر اِس میں شبہہ نہیں کہ یہ فن ہمارے ملک میں قدیم زمانے سے چلا آتا ہے - نہایت قدیم رومانوی سیاحوں کے بیان سے اِتنا معلوم ہوتا ہے کہ سنہ مسیحی کی ابتدائی صدیوں میں ' اور بہت ممکن ہے کہ اُس سے بھی قبل ' اہل ہند اور اہل عراق میں جو سلسلۂ تجارت قائم تھا اُس میں ہندوستان سے (بالخصوص ہمارے اُس ملک سے ' جو اب صوبۂ متحدہ کا پوربی حصہ ہے) دمشق اور اُس کے قرب و جوار میں لوہا اور سنبل وغیرہ پہنچتے تھے اور وہاں سے یہاں کے سیاح اور سوداگر کپڑا بننے کی مختلف قسم کی صنعتیں سیکھہ کر آتے تھے - دمشقی کپڑا اُس وقت سے گذشتہ صدی تک مشرق اور مغرب کے اکثر ممالک میں رائج اور مشہور رہا ہے - کیا عجب کہ ہماری تارکشی کی صنعت دمشق کی رہین منت ہو - بہرکیف اِس میں زیادہ شک کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے صوبے کے پورب کی سر زمین کو اِس فن میں بڑی قدامت ' اور غالباً اولیت حاصل ہے - عرصے سے دہلی کا بھی اِس تعلق میں نام لیا جاتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہاں بھی اِس فن کو قدامت کا دعویٰ ہو سکتا ہے ' لیکن تاریخی حیثیت سے اِس امر کے تسلیم کرنے میں زیادہ دشواری نہیں کہ بنارس اِس لحاظ سے دہلی پر مقدم ہے - پرانی دلی بھی لٹ چکی ' اور پرانا بنارس بھی ختم ہو گیا - تار کشی کے کیسے کیسے اہل کمال ہوں گے کہ اِس

وقت کسی دوسرے عالم میں ھیں - اُن کے نام لیوا اب چلائی خاندان بھی باقی ھیں ' گو اپنے اُن بزرگوں کی ھمسري کا دم بھرنے کی ھمت نہیں رکھتے ' تاھم اُن کي اولاد ضرور ھیں ' اور اُنھیں کے کمال کو زندہ رکھنے کی کوشش میں منہمک ھیں - ممکن ھے یہ بہت بڑی بات سمجھی جائے ' لیکن شائد یہ دعویٰ غلط نہیں کہ اب بھی اِس فن میں اھل بنارس اھل دھلی پر بہت کچھ فوقیت رکھتے ھیں - فی الحال ھمیں اِس خاص امر سے بحث کرنا نہ مقصود ھے نہ اِس کی ضرورت ھے -

شاھان مغلیہ اور سلاطین اودھ کے زمانے میں تارکشی اپنی جوانی پر تھی - اِس کے موجد زرگر ھیں ' جو زیورات بنانے کے لیے موٹے تار بناتے تھے - عقلا نے اُن سے اخذ کیا اور حسب ضرورت سامان اور ترکیبوں کا اضافہ کرکے باریک تار بھی بنانے لگے - شروع شروع میں تار بہت موٹی اور بھدی بنتي تھی - باریک تار تیار کرنا بڑا کمال سمجھا جاتا تھا - چنانچہ قصہ مشہور ھے کہ شاھان دھلی کے زمانے میں دھلی کے ایک سنار جوگندرا بھگت نے تار کا ایک جھّبا تیار کیا ' اور کسی جلوس کے موقع پر بادشاہ کو نذر دیا - بادشاہ کے دریافت کرنے پر جوگندرا بھگت نے عرض کی " جہاں پناہ ! میں نے اِس جھبے کو ھتھوڑی سے پیٹ پیٹ کر کئی سال میں تیار کیا ھے ' اور اِس امید پر حضور میں پیش کیا ھے کہ شائد اِسے تاج شاھی میں کہیں جگہہ مل جائے " - بادشاہ کو یہ تحفہ بہت پسند آیا - اُس نے جوگندرا بھگت کو بہت کچھ انعام دیا ' اور ھر سال جلوس کے موقع پر ایک جھبا لانے کی تاکید کی - جوگندرا لگاتار بارہ مہینے اِسی جھبے کے بنانے میں مصروف رھتا تھا ' اور دربار کے روز اِس قدر انعام و اکرام حاصل کرتا تھا کہ سال بھر کے لیے ھر فکر سے آزاد ھوکر محض جھبا بنانا اُس کا کام ھوتا تھا -

چند سال کے بعد ایک مہر صاحب اسی قسم کا ایک اور جھمکا بناکر لائے ' جس کی تاریں جوگندرا کے جھمکے کی تاروں سے بہت باریک اور چمکدار تھیں - بادشاہ نے مہر صاحب کے جھمکے کو پسند کیا اور اس مرتبہ شرف قبولیت بجائے جوگندرا کے مہر صاحب کو حاصل ہوا - چند سال تک مہر صاحب ہی کا طوطی بولتا رہا - جوگندرا کے لئے یہ مقابلہ بہت سخت تھا - وہ حتی المقدور باریک سے باریک تار تیار کرتا تھا مگر سال بھر کی مسلسل مصروفیت کے بعد بھی دربار کے روز مہر صاحب کے سامنے اس کو ندامت ہی ہوتی - جو چمک دمک اور یکسانیت مہر صاحب کے جھمکے میں ہوتی تھی ' اس کو نصیب نہ تھی - اس کی کوئی تار موٹی ' کوئی پتلی ' کہیں چپٹی اور کہیں چوپہل ہوتی تھی - مگر مہر صاحب کی ہر تار یکساں ' بالکل گول اور چمکدار ہوتی تھی -

باوجود تمام جاں فشانی کے جب جوگندرا ' مہر صاحب کی صنعت کا راز نہ سمجھ سکا ' تو اس نے مہر صاحب کے مکان کے بغل میں ایک مکان لیا - ہمہ وقت کسی نہ کسی صورت سے مہر صاحب کی تمام حرکات کو دیکھا کرتا تھا - جوگندرا کی طرح مہر صاحب تمام سال تنہائی کے آگے بیٹھکر ہتھوڑا نہیں چلاتے تھے ؛ بلکہ یوم دربار سے ہفتہ دو ہفتے پہلے کام شروع کرتے تھے اور دربار تک ایک جھمکا تیار کر لیتے تھے - جب دربار کا زمانہ آیا تو جوگندرا نے دیکھا کہ مہر صاحب موٹی تار کو اسی کی طرح پیٹ کر باریک کرتے ہیں مگر باریک ہو جانے کے بعد اس تار کو لوہے کے ایک پتّر کے متعدد سوراخوں میں سے گزارتے ہیں - ہر مرتبہ گزرنے کے بعد تار کسی قدر زیادہ لانبی اور باریک ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ زیادہ چمک دار بھی - دوسرے سال

جوگندوا نے اِسی ترکیب سے جھما بنالیا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا - اگرچہ اِس موقعہ بھی انعام مہر صاحب ھی کے ھاتھ لگا اور نقل اور اصل میں جو فرق ہوا کرتا ہے وہ رہ ھی گیا ' مگر مہر صاحب کو اپنی غلطی اور جوگندوا کی سازش کا حال معلوم ھوگیا - اُنھوں نے جو گندوا کو بددعا دی کہ چونکہ تو نے مجھ سے مانگ کر یہ ھنر نہیں لیا ہے ' بلکہ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا ہے ' اس لیے ان‌شاءاللہ تو ھمیشہ ناکام اور مفلس رہے گا - چنانچہ تارکشوں کا عقیدہ ہے کہ صدیاں گذرجانے کے بعد آج بھی مہر صاحب کی بددعا کا اثر تازہ ہے اور تارکش باوجود کثیر آمدنی کے ھمیشہ مفلوک الحال اور پریشان رھتا ہے - اللہ مہر صاحب پر رحم کرے ! یوں تو موجودہ زمانے میں ھر صنعت کے کاریگر پریشان حال ھیں ' تارکش کیوں مستثنیٰ رھیں ' مگر آج سے تیس سال قبل بھی ' جب کہ ایک تارکش روزانہ آسانی سے چار پانچ رُپّے کمالیتا تھا اور عید بقرعید کے موقعوں پر لوگ کسی شخص کو نہایت زرق برق کپڑے اور زری کے جوتے اور ٹوپی پہنے ہوئے دیکھ کر پوچھتے تھے کہ یہ کون ھیں تو جواب ملا کرتا تھا کہ تارکش ھیں ' اُن کا یہی حال تھا کہ ھمیشہ دکاندار کے مقروض ھی رہا کرتے تھے -

تارکشی نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور چونکہ یہ کام بہت تھوڑی سی جگہ میں ھوتا ہے اِس کو " شرفا " نے بھی اختیار کیا - وہ اپنے گھروں میں تخت پر فرش بچھا کر بیٹھتے تھے اور اُس پر کُندا رکھ‌کر کام کرتے تھے - چونکہ پارا چڑھادینے کے بعد پھر محض ایک ھاتھ سے چرخ گھمانے اور دوسرے سے بانات پکڑنے کی ضرورت ہے ' آنکھیں خالی رھتی ھیں ' اُس لیے کندوں پر کتاب رکھ کر وہ لوگ ساتھ ھی ساتھ کتب بینی بھی کرتے رھتے تھے - عرصے تک یہ کام تعلیم یافتہ لوگوں کے ھاتھوں میں رہا

اور وہ لوگ وقتاً فوقتاً اِس میں ضروری چیزوں اور ترکیبوں کا اضافہ کرتے رہے - رفتہ رفتہ تارکشي نے اِس قدر ترقی کي کہ اُنیسویں صدی عیسوی کے اخیر میں باریک سے باریک تـار ہندوستاني سامان سے بـن جایا کرتی تھی -

چاندی کی سل اور باریک تار میں بہت فرق ہے - مگر ارتقا کی اِن منزلوں کو طے کرنا کوئي غیر ممکن امر نہیں ' صرف آلات اور وقت کی ضرورت ہے - سل کو تار بننے تک تین مختلف منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے - سل کا پہلے " پاسا " بنتا ہے ; پاسے کی " کنچھلی " بنتی ہے ' اور پھر کنچھلی سے تار تیار ہوتی ہے - پہلی منزل ڈھلیا کے کار خانے میں دوسری پوتیا کے ' اور تیسری تارکشی کے کارخانے میں طے ہوتی ہے - اِن تین منزلوں میں سل پر جو کچھہ گزرتی ہے اُس کی مختصر تفصیل یوں ہے -

(ا) پہلی منزل' یعنی ڈھلیا کا کارخانہ

چاندي کي سل کو کاٹ کر اُس کے چھے یا سات ٹکڑے بنالیتے ہیں - ایسے ایک ٹکڑے کو گھریا میں رکھہ کر بھٹی میں رکھتے ہیں اور جلتے ہوئے کوئلوں سے ڈھانک دیتے ہیں - بھانتی سے ہوا دےکر کوئلوں کي آگ کو بھڑکاتے اور اُس کی لپٹوں کو گھریا کي طرف پھیرتے رہتے ہیں - کچھہ عرصے کے بعد چاندي گل کر سیال ہوجاتی ہے - اب اُس کو کرگھلیوں میں اُلٹ دیتے ہیں ; اور ٹھنڈي ہونے کے بعد کرگھیلوں سے نکال کر علیحدہ کردیتے ہیں - چاندي کی اِس تیار شدہ حالت کو پاسا کہتے ہیں - ایک ٹکڑے میں چھے یا سات پاسے ہوتے ہیں ' اور ہر پاسا ساٹھہ تولے سے نوے تولے تک کا ہوتا ہے - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چلد پاسوں کے ڈھالنے کے بعد چاندی اِس قدر کافی نہیں بچتی کہ ایک مسلّم پاسا بن سکے - اِس چاندی کو بھی کرگھلی میں ڈال کر کم وزن کا پاسا بنتا

لیتے ھیں - اِس کم وزن کے پاسے کو کاسی کہتے ھیں -

ڈلائی یا سانچے میں ڈھالتے وقت کچھ چاندی کونٹوں اور زمین پر گرپڑتی ھے ' اور مختلف شکلیں اختیار کرلیتی ھے اِن ریزوں کو رواڑی کہتے ھیں - اب پاسا یہاں سے پوتیا کے کارخانے میں پہنچتا ھے -

(۲) دوسری منزل ' یعنی پوتیا کا کارخانہ

دکان‌دار پاسے کو تول‌کر پوتیے کو دے دیتے ھیں - پوتیا اُس پاسے کو آگ میں سرخ کرکے نہائی پر رکھ‌کر ھتھوڑے سے پیٹتا ھے - ایک یا دو کاریگر اُسے ھتھوڑے سے پیٹتے ھیں' اور ایک کاریگر ' ایک خاص قسم کی سنڈسی سے پکڑ کر ' اُس کو گھماتا رھتا ھے - سرد ھوجانے پر اُس کو پھر سرخ کر کے پیٹتے ھیں اور اِس طرح پیٹ‌کر اُس‌کو تقریباً تین‌گز لانبا بنالیتے ھیں - اِس عمل‌کو "چھڑی بڑھانا" کہتے ھیں - چھڑی بڑھانے کے بعد چھڑی کے ایک سرے کو پیٹ‌کر نوک‌دار بنالیتے ھیں اور اُسے لوھے کے بید میں ڈال‌کر کھینچتے ھیں - چونکہ چھڑی کافی موٹی اور سخت ھوتی ھے اس لیے اُس کے کھینچنےکا طریقہ یہ رکھا گیا ھے کہ پوتیا اپنے کارخانے میں کئی گڈھے بنائے ھوتا ھے' جو تقریباً چار فٹ گہرے ' چار فٹ چوڑے' اور چھ فٹ لانبے ھوتے ھیں - اِن گڈھوں‌کے اوپر لکڑی کے چوکھٹے جمائے ھوتے ھیں' تاکہ گڈھوں کے کنارے گر نہ جائیں - اِن چوکھٹوں کی‌لمبان‌کی جانب' بیچ میں ' دونوں طرف ' معمولی سے گڈھے بناکر لوھے کے دو مضبوط چھلے جڑے ھوتے ھیں - اِن چھلوں کے درمیان میں لوھے کا ایک دُھرا گھومتا رھتا ھے - یہ دھرا لکڑی کے ایک تلے کے بیچ سے وار پار لگا ھوتا ھے - اِس‌گول تلے پر لکڑی کے چار مضبوط ڈنڈے ' دو دائیں اور دو بائیں جانب ' گڑے ھوتے ھیں - کاریگر ایک ڈنڈے کو ھاتھ سے اپنی‌جانب کھینچتا ھےاور دوسرے کو پیر سے ڈھکیلتا ھے ' جس سے گول تلا (جسے پوتیا کی اصطلاح میں پاڑھ

کہتے ہیں) گھومتا ہے ' اور چونکہ تار کا سرا اِنہیں ڈنڈوں میں سے کسی ایک میں بندھا ہوتا ہے ' تار برابر اِس پر لپٹتی رہتی ہے - اِس چوکھٹے کے ایک سرے پر کھینچوا اپنے پیر کو گڈھے میں لٹکاکر بیٹھتا ہے ' اور دوسرے سرے پر لکڑی کا ایک شگاف دار لٹھا گڑا ہوتا ہے ' جو زمین سے تقریباً ایک فٹ باہر نکلا ہوتا ہے - تار کو بید میں پھنساکر ' اُس کے سرے کو پاڑھ میں پھنساکر لپیٹتے ہیں ' اور بید کو اُسی شگاف میں پھنسا دیتے ہیں - بید میں موٹے ' باریک اور باریک تر سوراخ بنے ہوتے ہیں - پہلے تار کو موٹے سوراخ میں سے کھینچتے ہیں ' پھر اُس سے باریک سوراخ میں سے اور پھر اُس سے باریک میں سے حتیٰ کہ تار باریک اور لانبی ہوتے ہوتے ' ایک تولے کی تقریباً بیس گز ہو جاتی ہے - پتلی تار نرم ہوتی ہے اور پاڑھ کے ڈنڈے میں آسانی سے بندھ جاتی ہے ; مگر موٹی تار سخت ہوتی ہے اور ڈنڈے میں نہیں بندھ سکتی - اِس لیے چھڑی بڑھانے کے بعد تار کو بید میں پھنساکر اُس کے سرے کو مضبوط سنڑسی سے پکڑتے ہیں ' اور سنڑسی کو ایک مضبوط گول چھلے میں ڈال دیتے ہیں - یہ چھلا زنجیروں کے ذریعے سے پاڑھ میں بندھا ہوتا ہے - اِس لیے جب پاڑھ کو گھماتے ہیں تو زنجیر اُس پر لپٹتی ہے ' اور سنڑسی کا پچھلا حصہ دبتا ہے - اِس طرح اُس کے اگلے حصے پر زور پڑتا ہے اور وہ تار کو زنجیر کے ساتھ ساتھ پاڑھ پر لپیٹتا رہتا ہے -

پاسے کو کچھلی بنانے کے لیے بید میں سے پندرہ یا سولہ [۱] مرتبہ کھینچنا ہوتا ہے - دو تین مرتبہ کھینچنے کے بعد تار سخت ہوجاتی ہے ' لہذا اُس کو پھر سے آگ میں تپانا ہوتا ہے - بار بار تپنے سے اُس کی بالائی سطح سیاہ ہوجاتی ہے - اِس سیاہی کو دور کرنے کے لیے آٹھ نو

[۱]— یہ تعداد مقرر اور معین ہے - اِس سے کم و بیش نہ ہوتا ہے ' نہ ہونا چاہیے -

مرتبہ کھینچنے کے بعد اُس کی بالائی سطح کو چھیلنا ہوتا ہے - چھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ تار کو بیدھ کے سوراخ کے پچھلے حصے سے داخل کرتے ہیں - تار سوراخ کے اُبھرے ہوئے کناروں سے رگڑ کھاتی ہے اور اُس کی بالائی سطح چھل کر سانپ کے کینچل کی طرح برابر اُترتی رہتی ہے - اِس چھلے ہوئے حصے کو چھیلن کہتے ہیں - ایک پاسے میں تقریباً دس تولے سے بیس تولے تک چھیلن اُترتا ہے -

پوتھا کے کارخانے میں دو طرح کے کاریگر ہوتے ہیں - ایک کو کھینچوا اور دوسرے کو بیدھیا (یا بیدیا) کہتے ہیں - کھینچوا (یعنی کھینچنے والا) پازم کو گھماتا ہے ' اور بیدھیا تار کو بیدھ کے سوراخ میں ڈالتا ہے ' اور ایک ہاتھ میں تار کے لچھے کو لےکر دوسرے ہاتھ سے اُس میں موم رگڑتا ہے - جب تمام تار پازم پر لپٹ جاتی ہے ' تو کھینچوا اُس کو ایک چرخی پر اُلٹ کر لچھا بنا دیتا ہے ' اور اِس لچھے کو بیدھیا کے حوالے کر دیتا ہے - بیدھیا اِسے تپاتا ہے ' بیدھ کے سوراخ میں ڈالتا ہے ' اور موم رگڑنے بیٹھ جاتا ہے - جب تار تقریباً سولہ مرتبہ کھینچ چکتی ہے اور فی تولہ تقریباً بیس گز ہوجاتی ہے ' تو اُس کا اچھا بنا کر آگ میں تپاتے ہیں اور دکاندار کے حوالے کردیتے ہیں - اِس تیار شدہ لچھے کو کچھلی کہتے ہیں -

(۳) تیسری منزل ' یعنی تارکشی کا کارخانہ

دکاندار کچھلی کو تول کر کاریگر کے حوالے کردیتا ہے - کاریگر اُس پر دو پارے کھینچتا ہے ' اوراُس کے دو تین کلاوے بناکر پھر دکاندار کو دے دیتا ہے - دکاندار کلاوے کو تپاکر اور اُس پر کھٹائی لگاکر کاریگر کو دے دیتا ہے - اب کاریگر کلاوے کو کھول کر ' مانجھ کر ' پارے میں کھینچتا ہے -

بارے میں کھینچنے کا طریقہ :—

چونکہ کلاوے کی تار موٹی اور سخت ہوتی ہے' اِس لیے اُس میں مونہان نکالنے کی غرض سے اُسے چھلی بتی میں مسلتے ہیں - جب تار باریک ہوتی ہے تو کافی نرم بھی ہوجاتی ہے ' اور محض دانتوں میں دباکر مسلنے سے نہایت عمدہ مونہان نکل آتا ہے - مونہان نکال‌کر تار کے سرے (یعنی مونہہ) کو بارے کے سوراخ میں چٹکی سے آہستہ سے داخل کر دیتے ہیں' اور پھر بارے کے دوسرے جانب سے موچنی سے پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں - اگر بارے کا سوراخ کھلا ہوا ہے ' یعنی اُس میں موم یا تار وغیرہ نہیں پھنسی ہوئی ہے ' تو یہ عمل بہت جلد ہو جاتا ہے ' ورنہ بند ہونے کی صورت میں ' سلائی پھیرنا ہوتا ہے - کبھی کبھی سلائی پھیرتے وقت سوئی کی نوک ٹوٹ کر سوراخ میں پھنس جاتی ہے - ایسی حالت میں یا تو بارے کے دوسرے جانب سے سوراخ میں پھر سلائی پھیرتے ہیں ' یا مجبوراً تیزاب تپاکر لوہے کو گلا دیتے ہیں - اِس علت سے بچنے کے لیے اچھے کاریگر کچی سوئی استعمال کرتے ہیں -

تار کے سوراخ سے پار ہوجانے کے بعد ' بارے کو مڈھلّی میں موم سے چپکا دیتے ہیں ' اور تار کے سرے کو چرخ کی کگر کے سوراخ میں باندھ دیتے ہیں - داھنے ہاتھ میں ایک پھرونی لیتے ہیں اور اُس کی گونیج (نوک) کو داھنے چرخ کے کھڑے میں پھنسا کر چرخ کو گھماتے ہیں - اب تار بارے میں کھنچ‌کر ' باریک ہوکر ' داھنے چرخ پر لپٹ رہی ہے اور بائیں چرخ سے (جس پر وہ پہلے لپٹی ہوئی تھی) اُتر رہی ہے - بارے کے سوراخ کے سامنے رکھنے کے لیے ' تار کو ''چھڑا پھیر'' سے پکڑ کر بائیں ہاتھ میں لیے رہتے ہیں - بائیں ہاتھ کو ایسی جگہ رکھتے ہیں کہ جب چرخ کی رفتار کو کم کرنا ہو تو وہیں سے چھنگلی کو بڑھاکر چرخ کی نچلی کگر

پر رکھ سکیں - جب تار موٹی ہوتی ہے تو بائیں ہاتھ میں کلمے کی اُنگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ایک بھولواں لیے رہتے ہیں ' جو تار کو تر کرتا رہتا ہے - مگر جب تار باریک ہوجاتی ہے تو بجائے بھولوے کے موم لے لیتے ہیں - موم لے لینے سے تار آسانی سے کھنچ جاتی ہے مگر اُس میں وہ چمک نہیں آتی جو بھولوے کے استعمال سے آتی ہے -

اِس طرح جب تمام تار بائیں چرخ سے دائیں پر لپٹ جاتی ہے ' تو داہنے چرخ کو بائیں اور خالی شدہ بائیں چرخ کو داہنے کلے پر رکھ دیتے ہیں ' اور پھر تار کو پہلے سے زیادہ باریک سوراخ کے جارے میں ڈال کر کھینچتے ہیں - موٹی تار کو کھینچنے میں بہت زور پڑتا ہے اِس لیے پھرونی کو چرخ کے کنارے (کگر کے قریب) کے گڈھے میں ڈال کر گھماتے ہیں - اِس طرح چرخ آہستہ آہستہ گھومتا ہے - مگر جب تار باریک ہوجاتی ہے ' تو چرخ کافی روانی سے گھوم سکتا ہے - اِس لیے پھرونی کو ڈنٹے کے قریب کے گڈھے میں ڈالتے ہیں اور چرخ کو محض اشاروں سے گھماتے ہیں - اکثر کاریگر باریک تار کو ڈھکلی سے کھینچتے ہیں ؛ کیوں کہ ڈھکلی سے کھینچنے میں محنت بہت کم پڑتی ہے اور چرخ بھی تیز گھومتا ہے - مگر اِس عمل میں جھٹکا لگ کر تار کے ٹوٹنے کا اندیشہ زیادہ رہتا ہے - ہر مرتبہ بارا چڑھانے میں تار کا کچھ نہ کچھ حصہ ٹوٹ کر بیکار ہو جاتا ہے - کاریگر اُس کو بٹھل میں یکجا رکھتا رہتا ہے - اِس بےکار تار کو گونٹی کہتے ہیں -

تمام بارے کھنچ جانے کے بعد تار کو بادھم پر بھر دیتے ہیں - تار بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حسب معمول خالی چرخ کو داہنے اور بھرے ہوئے چرخ کو بائیں کلے پر رکھ دیتے ہیں - تیزاب پر کپڑے کی پٹیاں لپیٹ کر بادھم کو اُس پر کس دیتے ہیں - دائیں چرخ سے ایک ڈوری

(جس کو گردانک کہتے ہیں) تہراک کے نچلے حصے پر چڑھی ہوتی ہے - جس کی وجہ سے جب داہنا چرخ گھمایا جاتا ہے تو تہراک بھی گھومتی ہے - تار کا ایک سرا بادم کے پوتے پر لپیٹ دیتے ہیں ' اور داہلے چرخ کو پھرونی سے گھماتے ہیں - اب تہراک بھی گھومتی ہے ' اور ساتھ ہی ساتھ تہراک پر کسی ہوئی بادم پر تار بھی لپٹتی جاتی ہے - رفتہ رفتہ داہنے ہاتھ کی رفتار کو تیز کرتے رہتے ہیں ' ساتھ ہی ساتھ بائیں چرخ کی رفتار بھی تیز ہوتی جاتی ہے - اگر تار بھرنے میں بہت جلدی ہوتی ہے ' تو کسی دوسرے کاریگر سے بائیں چرخ پر چھپا لگواتے ہیں جس سے اُس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے - تار سے بھرجانے کے بعد بادم کو تہراک سے اُتار لیتے ہیں - اب اِس کو چکر کہتے ہیں -

کاریگر چکر اور گونتی دکاندار کے حوالے کر دیتا ہے - دکاندار اُنھیں تول کر اُن پر پرزہ لگا دیتا ہے اور اپنی بہی میں لکھ کر فروخت کرتا رہتا ہے - گونتی کو اکٹھا رکھتا جاتا ہے ؛ اور جب وہ کافی مقدار میں جمع ہوجاتی ہے تو کامی ' رواری ' چھیلن وغیرہ کے ساتھ ملاکر اور گلواکر پھر پاسے تیار کرا لیتا ہے - ظاہر ہے کہ گونتی میں کسی قدر موم کی آمیزش ہوگی ' کچھ ہاتھوں کی میل ' اور کچھ پتی اور بھوسے وغیرہ کے ٹکڑے ہوں گے اور باوجود صاف کرنے کے موم وغیرہ کی آمیزش رہ جائے گی ' اور جب اُسے گلائیں گے تو نہ صرف موم وغیرہ جل جائے گا ' بلکہ باریک تار بھی اِس تیز آنچ میں جل کر خاک ہو جائے گی - اس لیے جب چھوڑے کے پاسے گلاتے ہیں ' تو ڈھلیا کو کسی قدر چھیچ دے دیتے ہیں -

جون سنہ ۱۹۳۵ع کے پائنیر اخبار میں کسی بزرگ نے ' جو اپنا نام لکھنا نہیں چاہتے ' بلکہ محض تخلص سے کام لیتے ہیں ' گھریلوصنعتوں کے سلسلے میں تارکشی کا بھی ذکر کیا ہے - مگر اُن کا مضمون بہت مختصر

ہے ۔ اور موجودہ تارکشی نہیں ' بلکہ سنہ ۱۹۰۰ع کے پہلے کی تارکشی کو بیان کرتا ہے ' جب کہ بارے رائج نہیں ہوئے تھے ۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک بیدوں کا استعمال ہوتا تھا ' جو ہندوستان ہی میں بنتے تھے ۔ مگر بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی فرانس کے ایجنٹ ہندوستان پہنچ گئے ۔ اُن لوگوں نے تارکشی کے خاص خاص مقامات—بنارس' سورت' بمبئی ' بریلی ' دہلی اور پٹنہ وغیرہ— میں کارخانے کارخانے گھوم کر اپنے باروں کی اِشاعت کی ۔ بید کے کام میں کاریگر بہت عرصے میں ماہر ہوتا تھا ' اور ماہر سے ماہر کاریگر بھی دن بھر میں پانچ تولے تار تیار کرتا تھا ۔ اُسے باروں کو بار بار بدلنا اور کاٹنا ہوتا تھا ۔ اِس میں بہت وقت صرف ہوتا تھا ' اور بہت مشاقی بھی درکار تھی ۔ معمولی غلطی سے بارا موٹا اور چھوٹا ہو جاتا تھا ۔ ایک بارا کھینچنے کے بعد دوسرا بارا تار کی مناسبت سے موٹا اور پتلا کرنا ہوتا تھا ' ورنہ تار ٹوٹنے لگتی تھی ۔ چرخ بھی موجودہ چرخوں سے چھوٹے ہوتے تھے ۔ اُن کا محیط صرف بارہ گرہ [۱] (یعنی ساڑھے اکتیس انچ) ہوتا تھا [۲] ۔ ایک بارا کھینچ جانے کے بعد تمام تار کو دوسرے چرخ پر اُلٹ دیتے تھے ' اور پھر دوسرا بارا چڑھا کر کھینچتے تھے ۔ یعنی آج کل کی طرح خالی چرخ کو داھنے کلّے اور بھرے کو بائیں پر بدل نہیں دیا کرتے تھے ۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ تار کا پتھا آگے آگے بارا کسی قدر ھٹ جاتا تھا ' اور پتھا سرے سے موٹا ہوتا تھا ۔ اگر بارے کو اِس موٹان کی مناسبت سے درست کرتے تو سرے پر بالکل ڈھیلا ہو جاتا ۔ اِس لیے ہمیشہ ایک ہی سرے سے شروع کرتے تھے ۔ فرانسیسی بارے کے استعمال ہونے سے بہت سی کاریگری ختم ہو گئی ۔

---

[۱]—بنارسی گز کے حساب سے ' جو بیالیس انچ کا ہوتا ہے ۔

[۲]—یہ تفصیل میں نے اپنے والد جناب شیخ محمد اسحاق صاحب کی بیاض سے لی ہے ۔ آپ آج کل انجمن تارکشان بنارس کے صدر ہیں ۔

بارے میں تار کھینچنا بہت آسان ہے ' کیونکہ بارے کو بار بار موٹا اور پتلا نہیں کرنا ہوتا - جو بارا ایک مرتبہ موٹا ہوگیا ' پھر ہمیشہ موٹا ہی رہتا ہے - اِس لیے باروں کے اِستعمال سے تار بہت جلد اور آسانی سے بننے لگی - تمام تارکشوں نے پرانے جنتر کو چھوڑ کر بارا اِستعمال کرنا شروع کر دیا ' اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی صنعت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی - چنانچہ اِس پینتیس سال کے عرصے کے بعد لوہے کے کاریگر اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ' اور برخلاف اِس کے بارے کے کاریگر محض بنارس میں کم و بیش چار ہزار ہیں ' جن میں ہر قوم اور طبقے کے لوگ شامل ہیں - کاریگروں کی کثرت اور فرانسیسی تار کے مقابلے کی وجہ سے اب مزدوری اِس قدر کم رہ گئی ہے کہ کاریگروں کے پیٹ پالنے کے لیے کافی نہیں ہوتی - خصوصاً برسات کے زمانے میں تمام مزدوری محض باروں کے خریدنے میں صرف ہو جاتی ہے -

تارکشی کا پرانا طریقہ

تار کھینچنے کی ترکیب وہی تھی جو اب ہے ' یعنی اِسی طرح کلدے پر چرخ سے کھینچتے تھے - مگر چرخ موجودہ زمانے سے چھوٹے ہوتے تھے - اِس لیے تار بہت آہستہ آہستہ کھینچتے تھے ' اور ایک بارا کھنچ جانے کے بعد تمام تار کو پھر سے اُسی چرخ پر پلٹ دیتے تھے - موجودہ قسم کے بارے سنہ ۱۹۰۰ع کے بعد رائج ہوئے ہیں - اِس کے قبل دوسری قسم کے بارے استعمال ہوتے تھے جو ہندوستان میں بنتے تھے ' اور جن کا پہلا نام بیدھ اور جنتر تھا - بیدھ ہندی میں سوراخ کو کہتے ہیں ' چنانچہ بیدھ اِصطلاح میں فولاد کے اُس ٹکڑے کو کہتے تھے ' جس میں متعدد سوراخ بنے ہیں - فولاد کو پیٹ کر کوڑی کی کمانی کے برابر موٹے اور چوڑے ' تین تین چار چار انچ کے ٹکڑے بنا لیتے تھے - اِن ٹکڑوں میں

لوہے کی سلائی سے متعدد باریک سوراخ بنا دیتے تھے - تار کو اِس کے ایک سوراخ سے گزارتے تھے اور کھنچ جانے کے بعد اُسی سوراخ کو یا دوسرے سوراخ کو ایک خاص قسم کی ہتھوڑی سے (جس کو چاندا کہتے ہیں) پیٹ کر اُس سے کسی قدر باریک کرلیتے تھے - اِس سوراخ کو ناپ کر اِس کی ناپ کی تار رکھے رہتے تھے - اُس کو سوراخ میں ڈال کر سوراخ کی موٹان دیکھ لیتے تھے ' اور پھر حسب ضرورت چھوٹا یا بڑا بنا لیتے تھے - درست ہوجانے کے بعد تار میں کلے کی میل لگاکر سوراخ کو مانجھ دیتے تھے ' جس سے بارے میں روانی پیدا ہوجاتی تھی - اگر سوراخ کو خفیف سا موٹا کرنا ہوتا تھا تو اُس کی بھی کئی ترکیب تھی- غرض کہ ہر مرتبہ کھنچ جانے کے بعد بارا بنانا ہوتا تھا - اِس میں کافی وقت اور صنعت کی ضرورت تھی -

تار کی متعدد قسمیں اُسی وقت سے مقرر ہیں ' جو اب بھی رائج ہیں - آج کل چالیس کی تار عموماً سولہ بارے میں بنتی ہے - کم و بیش ہر بارا سوائی کی باڑھ کا ہوتا ہے - باڑھ ناپنے کا طریقہ یہ ہے - کہ کندے پر ایک ایک اُنگل کے بارہ نشانات بنے ہوتے ہیں - آٹھ اُنگل تار ناپ کر اُس کو بارے میں کھینچتے ہیں - اگر وہ بڑھ کر دس اُنگل ہوگئی تو کہتے ہیں کہ سوائی کی باڑھ ہے ۔ (چونکہ دس آٹھ کا سوا گنا ہے) اور اگر نو اُنگل ہوئی تو کہتے ہیں کہ ایک اُنگل کی باڑھ ہے- اور اگر ساڑھے نو ہوئی تو ڈیوڑھ انگل کی باڑھ ہے غرض کہ باڑھ کی ناپ آٹھ اُنگل پر ہے -

بارے عموماً سوائی کی باڑھ کے ہوتے ہیں - چنانچہ عام طور پر ایک تولہ گچھلی تقریباً بائیس گز ہوتی ہے اور ایک تولہ کلا تقریباً چھبیس گز ہوتا ہے - ایک تولہ کلاوا سوائی کی باڑھ کے بارہ بار

کھینچنے کے بعد تقریباً چھ سو گز ہوجاتا ہے - بارہ بارے کھنچی ہوئی تار کو تولے کی تار کہتے ہیں - تولے کی تار فی تولہ تقریبا چھ سو گز ہوتی ہے - یہ تار زیادہ تر گوٹے اور کامدانی میں استعمال ہوتی ہے - تیرہ بارے کھنچی ہوئی تار کو دس ماشی کی تار کہتے ہیں ' یہ تار فی تولہ تقریبا ساڑھے سات سو گز ہوتی ہے ؛ اور دس ماشے کی چھ سو گز ' چودہ بارے کھنچی ہوئی تار کو آٹھ ماشی کی تار کہتے ہیں ' یہ تار فی تولہ تقریبا نو سو گز ہوتی ہے ۔ یعنی آٹھ ماشے کی چھ سو گز ' پندرہ بارے کھنچی ہوئی تار کو بتیس کی تار کہتے ہیں ' یہ تار فی تولہ تقریبا سوا گیارہ سو گز ہوتی ہے - اور بتیس ماشے کی تین ہزار گز ' اور دو رتی کی چرخ کی بتیس پھیرا (۲۱ انچ کے چرخ پر بتیس پھیرا یعنی تقریبا تینتیس گز) -

سولہ بارے کھنچی ہوئی تار کو چالیس کی تار کہتے ہیں ۔ جو فی تولہ تقریبا پندرہ سو گز ہوتی ہے اور چالیس ماشے کی پانچ ہزار گز اور دو رتی کی تقریبا چالیس پھیرے - سترہ بارے کھنچی ہوئی تار کو پچاس کی تار کہتے ہیں ' جو فی تولہ پونے انیس سو گز اور دو رتی کی چرخ کی تقریبا پچاس پھیرا ہوتی ہے - اٹھارہ بارے کھنچی ہوئی تار کو ساٹھ کی تار کہتے ہیں ' جو فی تولہ تقریبا چوبیس سو گز ہوتی ہے - ساٹھ سے زیادہ باریک تار کو اسّی چوک کی تار کہتے تھے ' مگر یہ تار اب رائج نہیں ہے - اسّی کی تار ایک تولے کی ساڑھے ستائیس سو گز ہوتی تھی -

تار کشی کی صنعت بنارس کے علاوہ دہلی' پٹنہ ' لکھنؤ اور بریلی وغیرہ میں بھی موجود ہے' اور عرصے سے ہے- لیکن اب اگر بنارس کو اِس کا مرکز

کبھی تو کسی طرح بےجا نہ ہوگا - بنارسی ساریوں میں جس قدر بیل بوٹے بنتے ہیں، کلابتوں کے ہوتے ہیں - اس لیے بنارس میں کلابتوں کے بڑے بڑے کارخانے ہیں- بنارس کی تیار شدہ تار کا بڑا حصہ اِنھیں کلابتوں کے کارخانوں میں صرف ہو جاتا ہے - کچھ مال امرتسر، دہلی، سورت، بمبئی اور احمدآباد بھی جاتا ہے- خود سورت اور دہلی میں تارکشی کے کارخانے موجود ہیں، مگر اِن کارخانوں میں اِس قدر باریک تار نہیں بنتی -

بنارس کے مرکز ہو جانے کی دوسری وجہ وہاں کی آب و ہوا کی موافقت ہے - لوہے کے زمانے میں بھی بنارس میں ہر جگہ سے بہتر تار بنتی تھی اور موجودہ زمانے میں بھی جس قدر نرم، باریک اور سستی تار بنارس میں تیار ہوتی ہے شائد کہیں نہیں ہوتی - بنارس میں پارا بہت کم گھٹتا ہے اور تار بہت کم ٹوٹتی ہے جس کی وجہ سے اُتار بہت زیادہ ہے - مال اِس قدر سستا تیار ہوتا ہے کہ عرصۂ قدیم سے فرانس اِس صنعت کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش میں مصروف ہے، اور کسی حدتک کامیاب بھی ہو گیا ہے - پاروں کی تجارت کا وہ تنہا مالک ہے، مگر اپنے مال کی گرانی سے مجبور ہے - تقریباً پچیس سال کے خواب کے بعد اب ہندوستان والے جاگے ہیں، اور پاروں کے بنانے اور تارکشی کو مشین کے ذریعے سے کرنے میں کوشاں ہیں ؛ مگر کامیابی ابھی بہت دور معلوم ہوتی ہے -

آئندہ صفحوں میں بنارس کے تارکشوں کی اصطلاحیں جمع کی گئی ہیں، اور کوشش کی گئی ہے کہ حتیٰ‌الوسع ہر قسم کی اصطلاحات اِس مجموعے میں آجائیں - غالباً یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ فن اور یہ صنعت خود میرے خاندان کی چیز ہے اور پشتہا پشت سے چلی آرہی ہے - اگر ذاتیات کا ذکر قبیح نہ سمجھا جائے تو یہ بھی عرض

کر دینے کی جرءت کرتا ہوں کہ میرے والد ماجد (جیسا کہ اوپر کہیں عرض کیا ہے) تار کشان بنارس میں ممتاز اور مقتدر حیثیت رکھتے ہیں ، اور خود میں نے بھی لڑکپن میں اِس کام کو سیکھا اور کیا ہے - ممکن ہے اِس سے قارئین کرام کو اِس مجموعے اور اِس کی صحت پر زیادہ اعتماد ہو جائے - جہاں تک مجھے اندازہ ہے اِس مجموعے میں تار کشان بنارس کی تمام اصطلاحیں ضبط ہو گئی ہیں -

دفع دخل مقدر کے طور پر اِتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اِس کل مضمون میں لفظ تار کو ہر جگہ مونث استعمال کیا ہے - یہ اِس اسم کی وہ جنس ہے جو تارکشان بنارس کے محاورے میں رائج اور مستعمل ہے - گو عام محاورے میں تار مذکر اسم ہے - میں نے کوشش کی ہے کہ اصطلاحات کی تشریح نہایت سادہ اور صاف زبان میں کی جائے ، تاکہ مستفید کو مفہوم کے سمجھنے میں کسی قسم کا شک یا التباس باقی نہ رہ جائے - تمام اصطلاحات میں میں نے اُس تلفظ کو قائم رکھا ہے جو اہل صنعت کے یہاں رائج ہے - اِس غرض کو حاصل کرنے کے لیے میں نے قریب قریب ہر جگہ حروف کی حرکات کو مختصر طور پر بیان کر کے صحیح تلفظ کو واضح کر دیا ہے -

میں نے اِس مضمون میں چند مخفف اشارات استعمال کیے ہیں ، جن کی تشریح یہ ہے :—

امث سے مراد ہے اسم مونث ؛ امذ سے اسم مذکر ؛ اور جد " جیسے دیکھو " کی مخفف صورت ہے -

اخیر میں اپنے محترم اُستاد جناب محمد نعیم‌الرحمان صاحب بالقابہ کا شکریہ اداکیے بغیر نہیں رہ سکتا ، کہ اُنھیں کی تحریک ، ہمت افزائی ، اور رہنمائی اِن صفحات کے معرض وجود میں آنے کا باعث ہوئی -

اردو شاعری میں هندو کلچر اور هندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات

[از مولوي شاہ معین الدین احمد ندوي]

اردو شاعری کا موضوع جس قدر وسیع ہے اُتنا هی اِس قدر پامال هوچکا ہے کہ اُس کے متعلق مشکل سے کوئی نئی بات کہی جاسکتی ہے - زیر بحث موضوع بھی کوئی نیا موضوع نہیں ہے ' لیکن اِس کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے اس لیے نسبتاً اِس پر گفتگو کی گنجائش باقی ہے - آئندہ سطروں میں اِسی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے ' اِس سے اردو شاعري پر بعض سطحی اعتراضوں کی حقیقت بھی واضح هو جائےگی -

یہ ایک تمدنی اصول ہے کہ هر ملک اور هر قوم کي زبان اُس ملک کے جغرافی حالات کی تصویر اور اُس قوم کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ هوتی ہے - اِس لحاظ سے اردو شاعری کو هندوستان کے جغرافی حالات اور یہاں کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ دار هونا چاهیے -

لیکن اِس پر من جملہ اور اعتراضوں کے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ هندی نژاد هونے کے باوجود هندوستانی رنگ روپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی - اِس کے سارے خط و خال ایرانی هیں - اِس کے باغوں میں سرو و صنوبر اُگتے هیں - اِس کی بہار لالہ و گل کھلاتی ہے - اِس کے چمن میں قمري و بلبل نغمہ سنجی کرتے هیں - اِس کی نہروں

میں دجلہ و فرات کی روانی ہے - اِس کے افسانہاے محبت میں شیرین و فرہاد کی داستانیں ہیں - اِس کی رزمیات میں رستم و سہراب کے معرکے ہیں- اِس کے محبوب کی آنکھیں نرگس شہلا ' رخسار گل ' زلف سنبل ' قامت سرو رعنا ' غرض اِس کی تمثیلات ' تشبیہات ' استعارے اور شاعری کے تمام عناصر ' عجمی ہیں - آئندہ سطروں میں اِس اعتراض سے قطع نظر کرکے ہم کو دکھانا ہے کہ اردو شاعری میں ہندی خیالات ' ہندو مذہب ' ہندی تہذیب و معاشرت ' آداب و رسوم اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات کہاں تک ہیں ؟ اِس سے ضمناً مذکورۂ بالا اعتراض کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی -

یہ موضوع اِتنا وسیع ہے کہ اِس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے - اس لیے اِس مضمون میں بعض اہم پہلوؤں کو صرف اِس حدتک دکھایا جائے گا کہ اِس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ اردو شاعری قدیم ملکی تہذیب و معاشرت اور اپنے جنم بھوم کے جغرافی حالات سے کہاں تک متاثر ہوئی اور اُس میں اِس کے کیا کیا اثرات پائے جاتے ہیں -

ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے جس مشترک تہذیب کی بنیاد پڑی ' اُس میں دونوں قوموں کے بعض نسلی اور مذہبی خصوصیات کے علاوہ دونوں تہذیبوں کے عناصر یکساں پائے جاتے ہیں ' بلکہ میں یہانتک کہنے کی جرءت کروں گا کہ مذہب کا بلند کنگرہ بھی اِس کی کمند سے محفوظ نہ رہ سکا - آج ہندی مسلمانوں کے رائج مذہب میں مذہب کے نام سے جس قدر ہندوانہ رسمیں داخل ہوگئی ہیں ' اُس کا اندازہ بہتوں کو ہوگا - خصوصاً معاشرت میں یہ رنگ اِتنا گہرا ہوگیا ہے کہ آج خالص اسلامی معاشرت اور رسوم کی شکل پہچاننا مشکل ہے -

اِسی طرح ھندو مذھب اور ھندو تہذیب بھی اسلامی تہذیب بلکہ مذھب اسلام سے متاثر ھوئی ھے - ھندوؤں کی مذھبی اور معاشرتی اصلاحوں ' اور ترقی یافتہ کایستھ اور کشمیری برھمن خاندانوں کی معاشرت اِس کی شاھد ھے - اور یہ ھین اصول فطرت ھے - اردو شاعری بھی اِسی مشترک تہذیب کا نتیجہ اور دونوں قوموں کی مشترک ادبی کوششوں کا ثمرہ ھے اِس لیے وہ کس طرح اِن اثرات سے محفوظ رہ سکتی تھی ؟

اِس موقع پر ایک ضروری پہلو کی جانب توجہ دلانا ھے - یہ عجیب حیرت انگیز امر ھے کہ جو لوگ اردو شاعری پر فارسی کی تقلید اور نقالی کا الزام قائم کرتے ھیں وہ اِس اصول کو بھول جاتے ھیں ! اردو تو اسلامی یا ایرانی اور ھندی تہذیب کے میل جول کا نتیجہ ھے اس لیے فطرت اور انصاف دونوں کا تقاضا یہ ھے کہ اِس میں دونوں کا اثر ھو - اردو شاعری نے جن درباروں کے زیر سایہ پرورش پائی گو وہ ھندوستان میں ھونے کی وجہ سے ھندی ھوگئے تھے لیکن تھے وہ عجمی نژاد - اس لیے وہ اپنے نسلی اور موروثی اثرات کو اِس حدتک کس طرح مٹا سکتے تھے کہ اُن کا کوئی نشان اُن کی پیدا کردہ زبان اور شاعری میں نہ مل سکتا ؟ یہ اثرات تو بالکل طبعی اور فطری ھیں -

لطیفہ یہ ھے کہ اِنھیں معترضین میں بعض بامذاق حضرات ' اردو شاعری میں انگریزی زبان کی شاعری کے نمونے ڈھونڈھتے ھیں - اُس وقت وہ اِس اصول کو بھول جاتے ھیں کہ ھر قوم و ملک کی شاعری ' اُس کی قومی اور ملکی خصوصیات ' اُس کے جذبات ومیلانات اور مقامی حالات کا مظہر ھوتی ھے - اس لیے ایک ھندوستانی شاعر یورپ کا رنگ اور مذاق کہاں سے پیدا کر سکتا ھے ؟ اگر کرے گا تو محض آورد اور نقالی ھوگی - بہرحال یہ ایک جملۂ معترضہ تھا - اب میں اصل موضوع کی جانب متوجہ ھوتاھوں -

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ، اُردو شاعری ایرانی اور ہندی تہذیب اور اُن کی شاعری سے مل کر پیدا ہوئی ، اس لیے اُس کو دونوں کے اثرات وراثت میں پہنچے - اِس مضمون میں اُس کے صرف ایک پہلو یعنی ہندو کلچر کے اثرات کو دکھانا ہے - ہندو کلچر کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس کے اثرات اُردو شاعری میں نہ ملتے ہوں - ہندو مذہب و معاشرت ، آداب و رسوم ، زبان و خیالات وغیرہ جملہ عناصر اُردو شاعری کے دامن میں موجود ہیں - اب اِن سب کو علحدہ علحدہ پیش کیا جاتا ہے -

زبان کے اثرات

سب سے پہلے زبان کو لیجیے - اُردو شاعری مختلف دوروں سے گذری ہے - ابتدائی دور میں اُس پر ہندی الفاظ اور خیالات کا اِس قدر غلبہ تھا کہ اُس میں اور ہندی شاعری میں فرق کرنا مشکل ہے - یہ اُردو زبان کا تکوینی دور تھا ، جس میں اُس نے مستقل زبان کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی - اس لیے ہم اِس کو چھوڑ کر صرف اُس دور کو لیتے ہیں ، جب ریختہ نے اُردو زبان کا قالب اختیار کرلیا تھا اور فارسی کو شاعری کی مسند سے اُٹھاکر خود اُس کی جگہ حاصل کرلی تھی اور فارسی کے بجائے اُردو اظہار کمال کا ذریعہ بن گئی تھی - اِس میں بھی ہم اُن الفاظ کو قلم انداز کریں گے جنھوں نے اُردو میں جذب ہوکر ہندی کی تخصیص کھودی ہے ، بلکہ خالص ہندی اور ہندوانہ الفاظ پیش کریں گے - اِن دونوں میں وہی فرق ہے جو "عربی زبان" اور "اسلامی مصطلحات" میں ہے - ہندی ایک وسیع لغت ہے جس میں مذہبی اور غیر مذہبی سب طرح کے الفاظ داخل ہیں - لیکن ہم کو صرف وہ الفاظ پیش کرنا ہیں جن کا تعلق ہندو مذہب اور ہندو تہذیب و معاشرت سے ہے ، کہ یہ تخصیص ہمارا مدعا ثابت کرنے کے لیے اور زیادہ موثر ہے -

اِس قسم کے بہت سے الفاظ فارسی کے وسیلے سے آئے ' اور اِس طرح اُردو شاعری کا جزو بن گئے کہ اب اُن کی حیثیت مصطلحات کی ہوگئی ہے - مثلاً دیروحرم ' مسجد و بتکدہ ' شیخ و برہمن ' ناقوس و اذان ' تسبیح و زنار وغیرہ -

میر :—

میر کے دین و مذہب کو ' اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو

قشقہ کھینچا ' دیر میں بیٹھا ' کب کا ترک اسلام کیا

ہم یہ کہتے تھے نہ مت دیروحرم کی راہ چل

اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

کفر کچھ چاہیے ' اسلام کی رونق کے لیے

حسن ' زنار ہے ' تسبیح سلیمانی کا

نامعلوم :—

اذاں دی کعبے میں ' ناقوس دیر میں پھونکا

کہاں کہاں ترا عاشق ' تجھے پکار آیا

گو یہ الفاظ فارسی شاعری کی راہ سے آئے ' لیکن ہندوستانی اثرات نے اِنھیں پائدار بنادیا - خالص ہندوانہ الفاظ جن سے ہندو کلچر کے مختلف اثرات کا اندازہ ہوتا ہے ' یہ ہیں -

انشا :—

سانولے پن پر ' غضب دھج ہے ' بسنتی شال کی

جی میں ہے کہہ بیٹھیے اب ' جے کنھیا لال کی

شھو کے گلے سے ' پاربتی جی ' لپٹ گئیں
کیسا ہی بہار آج ہے ' بسوھا کے ونگ پر

لگے کہنے بھوم کسل اسے جو علی کے دھیان کے بیچ ہے
تورے دکھ دلدر کہ چٹلے تھے گئے بھاگ آپ کے بھاگ سے

شھو کی کھال بچھا اور ملے تن پہ بھبھوت
گاہ جوگی کی طرح رھتے ھیں آسن مارے

انشاءاللہ خاں کے یہاں اِس قسم کے الفاظ بکثرت ملتے ھیں - ہم نے صرف چند مثالیں دی ھیں - دوسرے شعرا کے اشعار ملاحظہ ہوں -

امانت :—

سانولے تن پہ قبا ھے جو ترے ' بھاری ھے
لالہ کہتا ھے چمن میں کہ یہ گردھاری ھے

دیا ھے کوچے میں قاتل نے لاش کو لٹکا
نہ مجھ پہ گور کا احساں ھوا ' نہ مرگھٹ کا

آھوں کا دھواں ھے طرف چشم تر اے دوست
گنگا پہ یہ مردہ کسی ھندو کا جلا ھے

سودا :—

ترکش الھند سینہ عالم کا چھان مارا
مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

ملیر :—

کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رھوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا

امیر :—

ڈر کے میری شب جدائی سے
کالکا رام رام کرتی ہے

سانولی دیکھ کے مورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اُٹھوں جے کالی کی

جرأت :—

درد دل اُس بت پہ درد سے کہئے تو کہے
جاکے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں

شاہ حاتم :—

خط نکلے پہ بوسہ رخِ پُر نور کا پایا
خیرات برہمن کو ملی چاند گہن سے

عورتوں کی زبان پر ہندی الفاظ بکثرت ہیں ' اس لئے ریختی تو سراسر ہندی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے - چند اشعار ملاحظہ ہوں -

جان صاحب :—

سوم کے گھر میں میاں کی دال بھی گلتی نہیں
برم راکس جان لے گا ' آنکھ لے گی کالکا

گو شکل میری اچھی ہے پر کیا کروں لچھمی
تقدیر تو بدتر ہے مری بھاگ بھری سے

نام کیا لنکا میں کرتی سامری سے میں سوا
مجھ سی جادو گرنیاں ہوتیں اگر راون کے ساتھ

ایک ایک نقطے پر موے لڑتے ھیں مردوے
محفل مشاعروں کی اکھاڑا ھے بھیم کا

کیونکر قدم رسواں ' جاکر پھروں نہ چوکی
رکھے جو آسرا تو ' ایسے مہابلی کا

تم تو کیا ھو بیگما ! ڈنڈوت کرتے ھیں یہاں
سب مہاراجوں کے راجہ جی بڑے ھیں جوکہ منڈ

اِس موقع پر ھم نے قصداً اُن نظموں کو نقل نہیں کیا ھے جو ھندوانہ مصطلحات کے ساتھ ٹھیٹھ ھندوانہ لب و لہجے میں کہی گئی ھیں ۔ نظیر اکبرآبادی نے اِس قسم کی متعدد نظمیں کہی ھیں - زمانۂ حال میں اکبر کے یہاں اِس قسم کے الفاظ و مصطلحات بکثرت ملتے ھیں - ھندوانہ الفاظ کی ھمہ گیری کے اثر سے خالص مذھبی شاعری بھی خالی نہیں ھے - مشہور نعت‌گو محسن کاکوروی کے مشہور نعتیہ قصیدے کی تشبیب سراسر اِسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ھے - اُس کے بعض اشعار یہ ھیں :—

سمت کاشی سے چلا ' جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ھے ' صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں ' سرو قدان گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ھے ' اک طول امل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ھے مہا بن میں ابھی
کہ چلے آتے ھیں تیرتھ کو ھوا پر بادل

دُھر کا ترسا بچہ ھے ' برق ' لیے جل میں آگ
ابر ' چوٹی کا برھمن ھے ' لیے آگ میں جل

دیکھیے ، ہوگا سری کشن کا ، کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل ، گوپیوں کا ہے بے کل
واکھیاں لے کے سلونوں کی ، برھمن نکلیں
تار باڑھی کا نو ٹوٹے ، کوئی ساعت ، کوئی پل
اب کی میلا تھا ھنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ ، نہ کوئی رتھ ، نہ بہل
ڈوبتے جاتے ھیں گنگا میں ، بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے ، یہ بڑھوا منگل
نہ و بالا کیے دیتے ھیں ، ھوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ھیں بھرے گنگا جل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

الفاظ کی بحث میں صرف اِنھیں مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے - آئندہ مختلف سلسلوں میں جس قدر اشعار آئیں گے اُن سب سے اِس کا مزید ثبوت ملتا جائے گا -

تشبیہ و استعارہ

شاعری کی ایک اہم صنعت تشبیہ و استعارہ ہے ، شاعر اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھتا ہے ، اُسی کو تشبیہ اور استعارے کے کام میں لاتا ہے - اِس لحاظ سے اردو شعرا نے بکثرت ہندی تشبیہیں استعمال کی ھیں - بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ شائد ہی خالص ہندی شاعری کی کوئی تشبیہ ایسی مل سکے جسے اردو شعرا نے استعمال نہ کیا ہو - ہم نے اِس سلسلے میں اِتنی تشبیہیں جمع کی ھیں کہ اُن پر علحدہ ایک مستقل مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ اُن میں سے چند یہاں پیش کی جاتی ھیں -

قد کی تشبیہ بوٹے اور کونپل سے ،

ناسخ :—

کو گلے گلبن ترے بوٹا سے قد کو دیکھ، کر
تھا کف گل میں جو زر گویا دفینہ ہوگیا

امانت :—

قد جو بوٹا سا ترا سرو رواں یاد آیا
غش پہ غش مجھ کو چمن میں نہ شمشاد آیا

امیر :—

ہر چند لڑکپن میں ہے بوٹا سا قد اُن کا
ہونے دو جواں سرو صنوبر سے بڑھیں گے

ابھی اُس نونہال پر عالم باغباں ' ہے نکلتی کونپل کا

زلفوں کی تشبیہ گھٹا سے ،

لٹک کے زلفیں جو آپڑی ہیں، کمر کسی کی لچک رہی ہے
بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں، غضب کی بجلی چمک رہی ہے

آتش :—

خوش نما ہے چہرۂ محبوب پر زلف سیاہ
عالم اک دکھلاتی ہے کالی گھٹا گلزار پر

زلف کی گھٹا سے اور سرخی رخسار کی شفق سے ،

پھولے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے
پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

ایک اور تشبیہ ،

ہے یاد زلف میں دل پر داغ مشکسر
کالی گھٹا کے شوق میں ' کوکے ہے مور پر

بعض مرکب تشبیہیں '

سیاہ گیسو ہیں رخ پہ بکھرے ' وہ بیٹھے سرمہ لگا رہے ہیں
اِدھر تو مہتلب ہے گہن میں ' اُدھر وہ جادو جگا رہے ہیں

امانت :—

کبھی کاجل کبھی آنکھوں میں لگایا سرمہ
رات تھا کون سا جادو ' جو جگایا نہ گیا

اِن تشبیہوں کی ہندیت ظاہر ہے '

برسات میں دکھلاؤ ' کبھی رخ کبھی گیسو
دو چار گھڑی سایہ ہو ' دو چار گھڑی دھوپ

زلف کی تشبیہ سانپ اور ناگن سے '

امانت :—

دیدۂ تر میں مرے پھرتی ہیں زلفیں یار کی
دیکھ لو پانی میں لہراتا ہے جوڑا سانپ کا

وا جو کی اُس نازنیں نے زلف پرفن آب میں
آشنا بولے کہ لہراتی ہے ناگن آب میں

آتش :—

چھوا جو گیسوے دلبریں کو ' تو سانپ کھیلا فسوں سے گویا
لیا جو چشم سیہ کا بوسہ ' شکار میں نے کیا ہرن کا

اثر :—

نہیں یہ زلف ' اُڑیا ناگن ہے   ہر خم و پیچ میں جدا مَن ہے

ناگن اور سانپ کی تشبیہ میں شعرا کی پوری پوری غزلیں موجود ہیں (امانت و امیر) ۔

زلف کی تشبیہ جمنا کی موج سے '

ولی :—

زلف ہے تیری ' موج جمنا کی   تل نزیک اُس کے اک سناسی ہے

زلف کی سیاہی کی تشبیہ بھونرے سے '

جبین چاند سی ' زلف نگار بھونرا سی

کنول سے پیارے نگاریں ہیں' پھول سے رخسار

جوڑے کی تشبیہ بس کی گانٹھ سے '

اثر :—

تو وہ طوفان قہر ہے جوڑا   گانٹھ بس کی ہے ' زہر ہے جوڑا

سیندور بھری مانگ کی تشبیہ دھنک سے '

قلق :—

سیندور اُس کی مانگ میں دیتا ہے یوں بہار

جیسے دھنک نکلتا ہے ابر سیاہ سے

موتی بھری مانگ کی تشبیہ بدلی میں بگلوں کی قطار سے '

اثر :—

مانگ موتی بھری' وہ دے ہے بہار   جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار

انتہا یہ ہے کہ زلف ' گیسو ' کاکل سب ہندو کے معنی میں ہوگئے '

ذوق :—

خط بڑھا ۰ کاکل بڑھے ' زلفیں بڑھیں ' گیسو بڑھے

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

زلف کے بعد پیشانی انور کی صندلی بہار ملاحظہ فرمائیے '

اثر :—

لطف ، کر یہ ہے بتاں صندلی پیشانی کا

حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

ملہر :—

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا

صندل بھری جبیں میں، ہونٹوں کی لالیاں میں

آنکھ کی تشبیہ کنول سے ،

آتش :—

آئینے میں عکس چشم یار کا عالم نہ پوچھ

دیکھیے "آتش" کنول پھولے ہوئے تالاب میں

کنول اور بھونرے سے ،

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حسن کی

شبرنگ مردمک نہیں : بھونرا کنول میں ہے

مرزا شوق :—

آنکھیں بھونروں کی طرح کالی قد لوچ میں ناروں کی ڈالی

ممولے کی اچپلاہٹ سے ،

شوخی اُن کی عجب تماشا ہے چلبلاتی ممولے کی کیا ہے

آنکھ کی ایک بے مثل مرکب تشبیہ ،

مزا برسات کا چاہو تو اِن آنکھوں میں آ بیٹھو

سپیدی بھی، سیاہی بھی، شفق بھی، ابر باراں بھی

خون آلود مژگاں کی تشبیہ پھولے ہوئے ڈھاک سے جو خاص ہندوستان کی صحرائی بہار ہے ،

محمد امان نثار:—

خون جگر سے مژگاں یوں سرخ ہورہے ہیں

جنگل میں جیسے یارو پھولا ہوا ہو ڈھاکا

اِس بہار کے سلسلے میں آتش کا وہ مشہور شعر یاد آگیا ؛

آتش:—

صحرا کو بھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی

کیا کیا جلا ہے ساکھو ، پھولا جو ڈھاک بن میں

ناک کی تشبیہہ طوطے کی چونچ سے ،

اثر:—

ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

لب کی گلنار کی کلیوں سے ،

امان نثار:—

آتشیں لب کی ترے باتیں جو ہیں چلیاں [۱]

گریباں چاک جوں شعلہ ہوئیں گلنار کی کلیاں

رخسار کی تشبیہہ شفق سے -

پھولے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے

رخسار کی لالہ سے اور خال رخ کی سویدا سے ،

برق:—

تیرہ بختوں نے بڑھایا ، حسن دونا یار کا

تل سے کاجل کے ، گل رخسار لالہ ہوگیا

تل کی تشبیہہ پر ایک اور شعر یاد آگیا جو خالص ہندوانہ تشبیہہ ہے -

---

[۱] پہلا مصرع موزوں نہیں ہے - [ادارہ] -

جان صاحب :—

تل نہیں مانگ میں زناخی کے یہ کنھیا کھڑا ہے گوکل میں

دانت کی ہیرے کی کنی سے '

لب ہیں وہ لب کہ عقیق یمنی خون کرے

دانت وہ دانت کہ ہیرے کی کنی خون کرے

دنداں' مسی مالیدہ لب کی مختلف تشبیہیں '

مسی مالیدہ دنداں پیارے پیارے

چمکتے ہیں شب یلدا میں تارے

مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے

تماشا ہے ' کہ آتش دھواں ہے

وہ ہنستے ہیں ہماری چشم تر پر مسی ملتے ہیں

شب تاریک میں بجلی چمکتی ہے سمندر پر

ہندوستان میں مختلف آب و ہوا کے اثر سے مختلف مقامات کا رنگ جدا ہوتا ہے ' سرخ ' سپید ' کندنی ' چمپئی ' سانولا ' اِس لئے یہ تمام رنگ ہندوستان میں مرغوب ہیں' اردو شعرا نے اِن سب کو سراہا ہے -

سرخ و سپید رنگ -

آتش:—

سرخ و سپید رنگ سے ہوتا ہے آشکار

وہ جسم نازنیں ہے عبیر و گلال کا

لیکن ہندوستان کا عام رنگ کندنی اور سانولا ہے -

لٹک ' اچپلاہٹ ' شرارت ' اُمنگ

دمکتا وہ کندن سا چہرے کا رنگ

امانت :—

رنگ رخسار کا شعلہ جو بھڑک جاتا ہے
آتش حسن پہ کندن سا دمک جاتا ہے

مہر: —

ایسی پیدا کرے ہے رنگ جھلک
جیسے کندن پہ خوش نما ہو جھلک

امانت :—

رنگ رخ وہ ہے طلائی کہ نہیں جس کا نظیر
ہے بجا خاک عناصر کو جو کہیے اکسیر

اِن سب رنگوں میں سانولے رنگ کو خاص مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہے - چنانچہ " سانولیا " معشوق کا مرادف ہو گیا -

امیر:—

دور دورہ ہو ترا سانولی صورت والے
تجھکو دیتے ہیں دعائیں یہ ترے متوالے

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اُٹھوں جے کالی کی

گندمی رنگ '

امانت :—

ہرا ہے دل یہ رنگ سبزہ ' لطف زندگانی ہے
مرے محبوب گندم گوں کی جو پوشاک دھانی ہے

مختلف تشبیہیں '

امانت :—

زرد چہرہ ہے مرا دیدۂ پر آب کے پاس
کھیت سرسوں کا ہے ' پھولا ہوا تالاب کے پاس

مرزا شوق :—

سبزۂ خط نے بڑھادی ترے عارض کی بہار

تھا جو لالہ کا چمن کھیت ہے اب دھانوں کا

ایسی مثالیں اردو شاعری میں ہندی تشبیہوں کے ثبوت کے لیے

کافی ہوں گی -

اقبال اور ابلیس

[از جناب آل احمد سرور ، ایم اے]

اقبال اِس دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں - [ا] اُن کی مقبولیت بڑھکر پرستش کی حدتک پہنچ گئی ہے - ہر اچھا شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے ، لیکن ہر اچھا شاعر اِتنا خوش نصیب نہیں ہوتا کہ اپنے ماحول کو متاثر بھی کر سکے - دنیا میں ایسے اشخاص کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اردو میں تو چند ہی ایسے مل سکتے ہیں- مگر اقبال نے اپنے دور کی ذہنی تربیت میں بہت بڑی مدد دی ہے - جدید نسل اُنہیں کے رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے - جن مقامات سے وہ اب گزر رہی ہے ، اقبال مدت ہوئی اُن سے آگے بڑھ چکے - جن محوروں پر یہ گردش کرتی ہے ، وہ اقبال ہی کے بنائے ہوئے ہیں - یہ دور دراصل اقبال کا دور ہے -

اقبال کی صرف یہ خوبی نہیں کہ وہ اپنے دور کی خصوصیات کے آئینہ دار ہیں یا اُنکے کلام میں وہ زندگی سانس لیتی دکھائی دیتی ہے ، جو اُنکے ماحول کی ہے - یہ بات تو ٹینی‌سن (Tennyson) میں بھی تھی ، مگر اُسے بقائے دوام تو کہا اپنے زمانے کے بعد اچھی طرح جینا بھی نصیب نہ ہوا—اقبال کے کلام میں بعض باتیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو ہر دور میں اہمیت رکھتی ہیں - وہ محض اُن سیاسی و معاشرتی میلانات

[ا]—یہ مضمون ڈاکٹر اقبال کی زندگی میں لکھا گیا تھا - [ادارہ]

کی مصوری نہیں کرتے جو اُنکے دور میں اُبھرنے کے لیے بیتاب ہیں - وہ اپنے تخیل کو اُن فضاؤں میں دوڑاتے ہیں جہاں انسان ' اُسکی انسانیت اُس کی قدر وقیمت ' بندگی و خدائی ' جبر و اختیار ' عشق و عقل ' اِن حقائق کی تفسیر کی جاتی ہے - اُن کا تخیل گوئٹے ' رومی ' شیکسپیر ' ملٹن اور غالب سب کے ساتھ پرواز کر سکتا ہے - اِن اشخاص کی برادری میں وہ شاگرد کی حیثیت سے نہیں ' برابر والے کی حیثیت سے رونق افروز ہیں - اُنھیں زبان پر بے مثل قدرت حاصل ہے - الفاظ کے پرے کے پرے اُن کے سامنے صف باندھے کھڑے رہتے ہیں اور وہ اُن سے اِس طرح کھیلتے ہیں جیسے کوئی ماہر فن اپنے مسالے سے کھیلے - وہ پرانی شراب میں ایک نیا نشہ اور نئے نشے میں ایک پرانا کیف دریافت کرتے ہیں - وہ لباس کے نہیں ' جامۂ زیبی کے مبلغ ہیں - وہ صرف فوٹوگرافر نہیں ' اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے ایسی تصویر بناتے ہیں جو منہ سے بول اُٹھتی ہے - وہ مایوسیوں اور ناکامیوں کے ہجوم سے گھبراتے نہیں ' اُن کی فطری امید پروری اُنھیں برابر مستقبل کے تصور کی طرف لیے جاتی ہے - ماضی ' حال ' مستقبل تینوں کو وہ عارف کی نظر سے دیکھتے ہیں ' اور زمان و مکان کا ایک خاص تصور رکھتے ہیں - اُن کی حیرت ایک آشنائے راز کی حیرت ہے ' وہ گاتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں مگر سلاتے نہیں ' بیدار کرتے ہیں - اُن کے اشعار میں رقص بسمل کا تماشا نہیں ہوتا ' لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہوتا ہے - اقبال اور آرنلڈ دونوں میں بڑی مماثلت ہے - دونوں کے یہاں شاعر خطیب سے دست و گریبان ہے (A poet is struggling with a preacher -)

اقبال کا تخیل بہت بلند ہے - وہ فلسفی ہیں مگر صوفی نہیں ' یہی وجہ ہے کہ اُن کا فلسفۂ زندگی اردو کے اُن شعرا سے مختلف ہے جو بھیک

ولت فلسفہ ، تصوف ، در یار اور محبوب رسوا سب سے آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے - اُن کی شاعری کا ایک مقصد ہے - وہ ایک آغاز سے ایک انجام کی طرف لے جاتے ہیں - وہ ایک پیغام پیش کرتے ہیں اور اُس پیغام کو سمجھانے کے لیے اُن کی اپنی مخصوص علامات ہیں - دوسرے الفاظ میں اُن کے یہاں بعض مضامین کی تکرار ملتی ہے - اِس تکرار سے کچھ لوگ بدمزہ ہوتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے پاس سوائے خودی کے اور کیا دھرا ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس کو سمجھے بغیر اُن کی شاعری کی روح تک پہنچنا ناممکن ہے - خودی ، عشق ، عقل ، فقر ، شاہین ، فرد ، جماعت ، ذوق تعمیر ، ابلیس ، خدا ، اِن سب کا اقبال کے کلام میں ایک خاص تصور ہے جو اُن کے دوسرے تصورات سے ہم آہنگ ہے - اِس خاص تصور کی ایک وجہ بھی ہے - اقبال غزل بھی کہتے ہیں مگر اُن کا کلام ایک غزل نہیں جس کا ایک جز دوسرے سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو - یہاں جو سُر نکلتا ہے پورے نغمے کے آہنگ میں شامل ہے - اِنہیں میں سے ایک تصور کا مطالعہ ہمیں کرنا ہے - یعنی یزداں اور اہرمن کا تصور -

اقبال کا مذہب ہر شخص کو معلوم ہے - وہ صرف مسلمان ہیں - اُن کے خیال میں اسلام کی شاہراہ پر چل کر ہی انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے - وہ رسول اللہ کے عاشق ہیں اور عشق رسول نے اُن کے نعتیہ اشعار میں ایک خاص جذب و اثر بھردیا ہے - وہ اسلام کے تمام ارکان ، قوت ایمانی ، اخوت و مساوات ، رنگ و نسل سے آزادی ، کے قائل ہیں - اسلام کے ہیروؤں (Heroes) کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں - مسلمانوں کی پستی پر نالاں ہیں اور اُنہیں ایک روشن مستقبل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں - وہ مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ اپنی ہستی پہچانو ،

یعنی غیراللہ سے بے نیاز ہو جاؤ اور اپنی ہستی ثابت کرو - ہستی کے ثبوت کے لیے وہ حرکت ' عمل اور پیکار کا فلسفہ سکھاتے ہیں - غرض اُن کی شاعری اسلامی تصورات کی تفسیر ہے اور اُس میں مسلمانوں کے لیے ایک مکمل نظام عمل موجود ہے -

مگر اِس کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں ایک خاص قسم کی آزادی ملتی ہے جو بظاہر اِس مذہبی جذبے سے جداگانہ بلکہ اُس کی ضد ہے - مگر دراصل اُن کے تصور سے متوازی اور اُسی کی پروردہ ہے - لیکن اِس نتیجے پر پہنچنے کے لیے ہمیں اِس کی تفصیل پیش کرنی پڑیگی -

اقبال کا تخیل بلند ہے - وہ اکثر اُس فضا میں پرواز کرتے ہیں جہاں عامیوں کا ذہن نہیں پہنچتا - اِس کے علاوہ وہ ایک طرح کے بت شکن بھی ہیں - رواجی اور دستوری زاویہ ہائے نظر سے اُنہیں سخت اختلاف ہے - شاعر عام انسانوں سے بلند ہوتا ہے مگر عام انسانوں کے جذبات و خیالات اُس میں بھی ہوتے ہیں - وہ جہاں عام اشخاص سے زیادہ سریع‌الحس ہوتا ہے وہاں اُن سے زیادہ دلیر بھی ہوتا ہے - اُس کے مشاہدات اُس کے تخیل کے بھٹی میں تپ کر کندن بن جاتے ہیں - یہ سونا چمکنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے - چنانچہ شاعر اپنے جذبات کے اظہار پر مجبور ہوتا ہے - اِس اظہار سے ایک طرف تو خود رستگاری (Self Liberation) مقصود ہوتی ہے ' دوسری طرف تسخلیقی جذبے کی حسرت بھی اُس میں شامل ہوتی ہے - چنانچہ شاعر وہ تمام باتیں کہہ جاتا ہے جو عام انسانوں کے خیال میں تو آتی ہیں مگر وہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے -

لیکن اقبال کی جرأت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا - وہ اپنے آپ کو مقرب بارگاہ سمجھتے ہیں ' اور اِسی وجہ سے بعض وقت بارگاہ

خداوندی میں اُن کی گفتگو شوخی بلکہ گستاخی کا رنگ لیے ہوئی ہے - وہ تلمیذالرحمان ہیں - جبریل مشرق [۱] کا لقب اُنہیں زیب دیتا ہے - اِس لیے بعض وقت وہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو شائد دوسرے کے منہ سے سنی نہ جائیں یا اُسے زیب نہ دیں -

" بانگ درا " میں یہ شوخی کہیں کہیں رواجی اور رسمی رنگ لیے ہوئے ہے - اُن کا خیال ابھی دھندلا سا ہے اور اُس پر عام نقطۂ نظر کے پردے پڑے ہوئے ہیں - " شمع " کے عنوان سے ' پہلےدور کے چند شعر ملاحظہ ہوں '

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوق گلوے حسن تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے ' گم کردہ راہ ہوں
اے شمع میں اسیر فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ ' حلقۂ دام ستم بھی آپ
بام حرم بھی ' طائر بام حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یانیاز ہوں ' اردو شاعری کی پہچانی ہوئی آواز ہے - مگر " عاشق ہرجائی " کے چند شعر سنیے '

مجھکو پیدا کرکے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں ' اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں
محفل ہستی میں جب اِتنا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لیے لا انتہا رکھتا ہوں میں

[۱]—یہ جدید لقب نامناسب ہے - [مدیر] -

" شکوہ " اُن کی مشہور نظم ہے - اردو شاعری اُس سے بہت متاثر ہوئی ہے - اُس کے تخیل اور اُس کے انداز بیان دونوں کا بہت کافی تتبع کیا گیا ہے - اُس میں بعض مصرعے اور اشعار ملاحظہ ہوں - یہاں یہ دکھلانا مقصود ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے محض اسلوب بیان کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ اُس سے کسی خاص جذبے کی غمازی ہوتی ہے ؛

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم
پھول تھا زیب چمن ، پر نہ پریشاں تھی شمیم

تجھکو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوت بازوے مسلم نے کیا کام ترا

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں ، تو بھی تو دلدار نہیں

آئے عشاق ، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

کبھی ہم سے ؛ کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں ، تو بھی تو ہرجائی ہے

" بانگ درا " پہلی بار ستمبر سنہ ۱۹۲۴ع میں شائع ہوئی تھی - اُس میں اِس جذبے کے صرف دھندلے نقوش ملتے ہیں جس کی

طرف هم توجه دلاچکے ھیں - " بال جبریل " سنه ۱۹۳۵ع میں شائع هوئی - پہلی دونوں کتابوں کی اشاعت میں گیارہ سال کا وقفه ہے - بانگ درا کی مختلف نظموں کا زمانه آسانی سے متعین کیا جاسکتا ہے - لیکن بال جبریل کے متعلق یه نہیں کہا جاسکتا - اِن دونوں کے درمیان کا زمانه فارسی شاعری کا ہے - ہمیں اقبال کی فارسی شاعری سے تو بحث نہیں ' دوسرے اردو کے ایک شاعر کے متعلق اُس کے فارسي کلام سے راے قائم کرنا کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے - لیکن اقبال کی اردو اور فارسی شاعري کا میدان ایک هی ہے - فرق صرف یه ہے که بہت سی باتیں اردو میں صرف اشارات میں بیان هوئی هیں ' اُن کی تفصیل آپ کو فارسی میں ملے گی - " پیام مشرق " اُن کی بہترین فارسی تصانیف کہی جاتی ہے' اُس میں اِس جذبے کی کار فرمائی دیکھیے - موتی موتی مثالوں پر اکتفا کی جائے گی '

به یزداں روز محشر برهمن گفت فروغ زندگي تاب شرر بود
و لیکن گر نرنجی با تو گویم صنم از آدمی پاینده تر بود

مرنجِ از برهمن اے واعظ شهر گر از ماسجدهٔ پیش از بتاں خواست
خداے ما که خود صورت گری کرد بتے را سجدهٔ از قدسیاں خواست

هزاراں سال بافطرت نشستم به او پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگزشتم این دو حرف است تراشیدم ' پرستیدم ' شکستم

تراشیدم صنم بر صورت خویش بشکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است بهر رنگے که هستم خود پرستم

" میلاد آدم " کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں '

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے' خود شکنی' خود نگرے پیدا شد

اِسی جذبے نے اُن سے " محاورہ مابین خدا و انسان " لکھوایا جس میں بندگی کا ایک بلند تصور ملتا ہے -

خدا

جہاں را زیک آب و گِل آفریدم　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم　　تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طایر نغمہ زن را

انسان کے جواب میں جو فخریہ انداز ہے وہ بھی ملاحظہ ہو '

تو شب آفریدی ' چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ' ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غزلوں کے چند شعر بھی دیکھیے '

می تراشد فکر ما ہردم خداوندے دگر
دست از یک بند تا اُفتاد در بندے دگر

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

در دشت جنون من ، جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

" بال جبریل " کی پہلی سولہ غزلیں ایک علیحدہ باب میں رکھی گئی ہیں - اِن سب میں بارگاہ خداوندی میں معروضات ہیں - کہیں شکوے ہیں ، کہیں شکایتیں ، اور کہیں مزے مزے کی حکایتیں بھی - خاص خاص شعر یہ ہیں ،

حور و فرشتہ ہیں اسیر، میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل ، تیری تجلیات میں

اگر کج‌رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

اگر ہنگامہ‌ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب ، لامکاں تیرا ہے یا میرا
اِسی کوکب کی تابانی سے ہے، تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی ، زیاں تیرا ہے یا میرا

اِن اشعار کا طنز بھی ملاحظہ ہو ،

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے ، اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو ، مجھکو بھی شرمسار کر

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ' جن کے حوصلے ہیں زیاد

حرم کے دل میں ' سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک ' حجاب آمیز ہے ساقی

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی
مقام بندگی دیگر' نہ لوں شان خداوندی

ترے آزاد بندوں کی ' نہ یہ دنیا ' نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی' وہاں جینے کی پابندی

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے   بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم   بخیلی ہے ' یہ رزاقی نہیں ہے

تری دنیا جہان مرغ و ماہی   مری دنیا فغان صبحگاہی
تری دنیا میں' میں محکوم ومجبور   مری دنیا میں تیری بادشاہی

خدائی اہتمام خشک و تر ہے   خداوندا خدائی دردسر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ   یہ درد سر نہیں ' درد جگر ہے

سولہویں غزل میں اپنے دل کی بات شاعر نے ذرا کھول کر بیان کی ہے؛

یارب یہ جہان گذراں خوب ہے لیکن

کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش و خرد مند

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مے گلگوں

مسجد میں دھرا کیا ہے، بجز موعظہ و پند

فردوس جو تیرا ہے، کسی نے نہیں دیکھا

افرنگ کا ہر قریہ ہے، فردوس کی مانند

اور آخر میں اپنے متعلق بھی ارشاد ہوتا ہے -

چپ رہ نہ سکا، حضرت یزداں میں بھی، اقبال

کرتا کوئی اِس بندۂ گستاخ کا منہ بند

دوسری چیز جو اقبال کے یہاں ملتی ہے وہ "ابلیس" کا ایک خاص تصور ہے- یہ بھی اُن کے عمومی نقطۂ نظر کا ایک پہلو ہے- جہاں تک حقیقت کی نقاب کشائی کا تعلق ہے، اقبال کا مسلک یہ ہے کہ نقابات کی طرف اشارہ کر دینا، یا نقاب کی رنگینی و نیرنگی میں کھویا جانا کافی نہیں، بلکہ نقاب کے اُٹھانے میں اور زیر نقاب حقیقت کو آشکار کرنے میں اُس جرءت و بصیرت کو کارفرما بنانا چاہیے جو صرف خلوص سے پیدا ہوتی ہے - اِسی وجہ سے اُنہوں نے ابلیس کی سیرت اور اُس کی عظمت دکھائی ہے، چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابلیس کی پہلی جیت حقیقتاً انسان کی آخری جیت ہے - اردو شاعری میں یہ بالکل نیا تصور ہے - ابھی تک تو ہم صرف یہ جانتے تھے،

کیا شیطاں مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے

اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

مگر دوسری زبانوں کے ادب اور شاعری میں ابلیس کا ایک خاص تصور کہیں کہیں ضرور جھلکتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ جن شعرا نے انسان

کو اپنے سخن کا موضوع بنایا ہے اور انسان کی ساری زندگی میں سے صرف اُس کی محبت کے جذبات (اور وہ بھی جنسی یا غیر جنسی) لے لیے ھیں ' اُن کے یہاں انسان اور فطرت کے سربستہ رشتوں کا حال نہیں ملتا - مگر بعض ایسے شعرا بھی ھیں جنھوں نے شاھراہ عام سے ھٹ کر ساری دنیا کا احاطہ کیا ہے اور اپنی جرءت فکر سے ھر راز کی نقاب کشائی کی ہے - اُن میں سے گوئٹے ' دانتے ' بعض اینگلو سیکسن شعرا مثلاً کیڈمان (Caedmon) اور کینے ولف (Caeni-woolfe) اور خاص طور پر ملٹن کے یہاں ابلیس کا بھی ایک خاص تصور ہے - یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ' اس لیے صرف ملٹن کے یہاں ابلیس کا تصور بیان کیا جائے گا - اس لیے اور بھی کہ ملٹن اور اقبال دونوں میں کئی باتیں مشترک ھیں - دونوں اپنے مذھب کے بڑے پر جوش حامی ھیں ' مگر دونوں کے یہاں ابلیس کا تصور محض خیالی نہیں ' کچھ اور معنے بھی رکھتا ہے - پھر دونوں کی رفعت تخیل اور فن کا رانہ احساس کی قسم کھائی جاسکتی ہے - دونوں نے اپنے مذاھب کی اور دوسری متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا ' اور مطالعۂ علمی کے ساتھ مطالعۂ نفس کی بھی بلندیاں طے کی تھیں -

تذکرۂ کتب

جنوری سنہ ۱۹۳۸ع سے مارچ سنہ ۱۹۳۸ع تک اردو کی جو کتابیں پنجاب اور یوپی سے شائع ہوئیں اُن کی تعداد اگلی سہ ماہی سے کم ہے - البتہ ہندی کی کتابوں کی اشاعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی - اُن کی تعداد تقریباً وہی رہی جو اگلی سہ ماہی میں تھی -

پنجاب سے ڈرامے کی کوئی کتاب نہیں نکلی - باقی عنوانات میں سب سے زیادہ افسانے پر ' پھر بالترتیب زبان ' متفرقات ' مذہب ' ریاضیات ' شاعری ' تاریخ و جغرافیہ ' سوانح پر کتابیں شائع ہوئیں - طب اور سیاست کا نمبر برابر رہا - طبیعیات وغیرہ پر سب سے کم کتابیں نکلیں -

اِن سب کتابوں کی تعداد (۱۹۰) ہے - اور حسب ذیل فنون پر تقسیم ہیں -

سوانح ...	... ۷	متفرقات ...	... ۲۹
افسانہ ...	... ۴۰	شاعری ...	... ۱۵
تاریخ و جغرافیہ	... ۱۱	سیاست ...	... ۴
زبان ...	... ۳۰	مذہب ...	... ۲۸
طب ...	... ۴	ریاضیات ...	... ۱۹
طبیعیات وغیرہ	... ۳		

ہندی مطبوعات کی تعداد (۵۴) ہے - اُن میں سوانح ' سیاست اور طبیعیات پر کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی - باقی علوم اور ڈرامے پر کتابیں چھپیں -

میں فلسفے کے علاوہ اور تمام علوم پر کتابیں
یوپی
شائع ہوئیں - فلسفے پر لکھنے والے ابھی خال خال ہیں - اِس مرتبہ ایک خاص بات یہ ہے کہ شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے - تعداد کے لحاظ سے زبان پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں ' پھر تاریخ و جغرافیہ کا نمبر رہا اور اِن کے بعد شاعری اور مذہب کا - افسانے اور قانون کی کتابیں برابر رہیں - متفرقات اور سیاست کا بھی یہی حال رہا - اُن کے بعد طب اور پھر بقیہ علوم و فنون مساوی رہے -

اِن کتابوں کی تعداد (۷۰) ہے - جنکی فن‌وار تقسیم یہ ہے -

آرٹ ...	۱	طب ...	۲
سوانح ...	۱	متفرقات ...	۳
ڈراما ...	۱	شاعری ...	۷
افسانہ ...	۴	سیاست ...	۳
تاریخ و جغرافیہ...	۱۲	مذہب ...	۹
زبان ...	۲۳	ریاضات و میکانک	۱
قانون ...	۴	طبیعیات وغیرہ	۱

ھندی مطبوعات کی تعداد (۵۳۹) ہے - وہ سب علوم پر لکھی گئی ہیں ' مگر شاعری کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے - اُس پر (۲۳۹) کتابیں شایع ہوئی ہیں !

دونوں صوبوں کی اہم اردو مطبوعات حسب ذیل ہیں -

"سوانح"

۱—سوانح سلطان صلاح الدین اعظم - از جناب فصیح‌الدین انصاری - صفحات ۲۹۹ - آر ' حجازی پریس لاہور -

۲—سرور کائنات - از جناب منصور احمد - آنحضرت کی مختصر سوانح عمری - مرحوم رائٹ آنریبل سید امیرعلی کی کتاب " اسپرٹ آف اسلام " کے حصۂ سیرت کا اقتباس - صفحات ۱۷۵ - اکسپرٹ لیتھو پرنٹنگ پریس ' لاہور -

" افسانے "

۳—صنوبر کے سائے اور دوسرے رومان- از جناب امتیاز علی' حجاب - آٹھ مختصر افسانوں کا مجموعہ - صفحات ۲۰۸- فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور -

۴—نعمان و مریم - از منشی غلام حسین گیلانی - صفحات ۲۹۶ - طبع دوم - آزاد ہند پریس لاہور -

۵—آفتاب عالم حصۂ چہارم - از جناب محمد صادق حسین - قدیم اسلامی زمانے کے متعلق ایک ناول - صفحات ۲۸۸ - طبع دوم - حجازی پریس لاہور -

۶—سلطان صلاح الدین ایوبی - از پیرزادہ حبیب‌اللہ صاحب - ایک تاریخی ناول - صفحات ۱۹۲ - آر حجازی پریس لاہور -

۷—عورت اور دیگر افسانے - از رشید جہاں- سوشل مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ - صفحات ۱۱۴ - فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور -

۸—قلوپطرہ - از تصدق ' سلمیٰ - مصر کی ملکہ کا افسانہ محبت - انگریزی سے ترجمہ - صفحات ۱۳۲ - فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور -

۹—سیہ کاریاں - از خان محبوب طرزی - صفحات ۱۹۶ - یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ -

" تاریخ و جغرافیہ "

۱۰—سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق—شہنشاہ محمد تغلق کی تاریخ - ہندستانی اکیڈیمی ' الہ‌آباد - صفحات ۲۴۵ - سٹی پریس الہ‌آباد -

۱۱—تاریخ بنارس—از اے ' ایس الٹیکر ' ایم اے ' ال ال بی ' ڈی لٹ - زمانۂ قبل تاریخ سے اِس وقت تک شہر بنارس کے حالات - ہندو یونیورسٹی بنارس -

۱۲—ترجمۂ تاریخ ابن خلدون ' کتاب ثانی ' جلد پنجم - ترجمہ از حکیم احمد حسین- بنو امیہ کے پہلے نو خلفا کے حالات - سلیمی پریس الہ آباد - صفحات ۲۶۵ -

" قانون "

۱۳—بال بیاہ کا قانون یعنی شاردا ایکٹ نمبر ۱۹' سنہ ۱۹۲۹ع - اِس قانون کی مختصر تشریح - از پرشن ناتھ بی اے ' ال ال بی - طبع دوم - سلیمی پریس الہ آباد -

۱۴—شرح قانون پنچائت مع ترمیمات سنہ ۱۹۳۴ع - صوبجات متحدہ کا قانون پنچائت - از فیاض علی ' بی ایس سی' ال ال بی - صفحات ۱۲۸ - اسرارکریمی پریس الہ آباد -

" طب "

۱۵—سرجری - از ڈاکٹر حافظ محمد بشیر - صفحات ۵۰۴ - نذیر پرنٹنگ پریس امرتسر -

۱۶—علاج النساء شمسی- از حکیم محمد شمس الحق خاں- نسوانی امراض پر کتاب - صفحات ۲۰۰ - نذیر پرنٹنگ پریس امرتسر -

۱۷—آریہ میڈیکل سائنس ایور وید کی مختصر تاریخ—مہاراجہ بھگونت کی کتاب کا ترجمہ - از رام کشرو سنگھ راج وید - صفحات ۲۲۴ - سلیمی پریس الہ آباد -

" متفرقات "

۲۸—وفیق الحواشی - از پروفیسر اے' سی ' اگروال - صفحات ۱۹۲- امرت الکٹرک پریس لاہور -

۱۹—جوشیز ماڈرن ڈزائنس - از کے ' سی ' جوشی - مکانات کے مختلف طرز تعمیر پر کتاب - صفحات ۲۹۵ - سناتن برقی پریس امرتسر -

۲۰—نیشنل ماسٹر آف ٹگرز - از جناب کیلو رام - رہنمائے خیاطی - صفحات ۷۲ (؟) - حجازی پریس لاہور -

۲۱—یورپ و امریکا کی تجارت کے راز - از مہتا سنگھ پال - صفحات ۱۹۲ - حجازی پریس لاہور -

" شاعری "

۲۲—جواہر سخن جلد سوم - از مولوی محمد مبین کیفی - ہندستانی اکیڈیمی ' الہ آباد - صفحات ۷۲۱ - ستی پریس الہ آباد -

" مذہب "

۲۳—پریم ترنگ عرف ترانۂ الفت - از جناب کانشی ناتھ چاولا - اخلاقیات اور روحانیات پر ایک کتاب - صفحات ۳۱۲ - نگینہ الکٹرک پریس جالندھر -

۲۴—ایشوری گیان یا شریمد بھگوت گیتا - از جناب شیو ناتھ رائے تسکین — گیتا کا اردو ترجمہ - صفحات ۱۶۷ - آر ' مفید عام پریس لاہور -

۲۵—بشارت احمد مع تصدیق احمدیت - از سید بشارت احمد - پروفیسر الیاس برنی کی " قادیانی مذہب " کا جواب - اللہ بخش اسٹیم پریس قادیان -

" طبیعیات وغیرہ "

۲۶—تاریخ فلسفۂ سیاسیات - از جناب محمد مجیب ' بی اے - صفحات ۴۴۳ - ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد - ستی پریس الہ آباد -

تبصرہ

"مکاتیب غالب" (سلسلۂ مطبوعات کتاب‌خانۂ ریاست رام‌پور -۱-)
مولفۂ امتیاز علي صاحب " عرشی"

[از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' ایم اے' پی ایچ ڈي ']

جن لوگوں نے " غالب " کی " اُردوے معلیٰ " کو پڑھا ھے ' خوب جانتے ھیں کہ اُن کو دربار رام پور سے کیا تعلق تھا - یہ بھی معلوم تھا کہ نواب یوسف علی خاں اور پھر اُن کے جانشین نواب کلب علی خاں کی پیش‌گاہ میں " غالب " کے عریضے پہنچتے رھتے تھے ' مگر وہ عریضے نہ " اُردوے معلیٰ " میں شامل ھوئے ' نہ " عود هندي " میں - ایک زمانے میں - " غالب " کو گوارا نہ تھا کہ اُن کے اُردو خط شائع ھوں اور " آپس کے معاملات اوروں پر ظاھر ھوں " [۱] ؛ مگر پھر وہ راضی ھوگئے ' اور راضی ھوئے تو ایسے کہ خود احباب کو لکھ کر ' تقاضے کرکر کے ' اپنے خطوں کی نقلیں جا بہ جا سے منگوائیں کہ مجموعے میں داخل ھوں - تعجب ھے کہ رام‌پور سے خطوں کی نقلیں حاصل کرنے کی طرف نہ تو " اُردوے معلیٰ " یا " عود هندي " کے مولفوں ھی کا خیال گیا ' نہ " غالب " ھی نے اِن درباری تحریروں کو یاد کیا - کچھ بہت بعید نہیں معلوم ھوتا کہ دربار کے داب یا خود اپنی تمکنت کے خلاف جان کر مرزا صاحب نے اِس بات کو نہ چھیڑا -

---

[۱]—" اُردوے معلیٰ " ص ۲۶۱ -

کوئی پانچ برس ہوئے سنا گیا کہ " غالب " کے رام پور والے خط ریاست کے دارالانشا میں محفوظ ہیں اور اُن کی اِشاعت ریاست کی طرف سے ہوگی - جوں جوں دن گزرتے گئے لوگوں کا اِشتیاق بڑھتا گیا یہاں تک کہ کچھ لوگ مایوس بھی ہوگئے ' بارے وہ خط " مکاتیب غالب " کے نام سے " سلسلۂ مطبوعات کتابخانۂ رامپور " کی پہلی جلد کی شکل میں شائع ہوئے - اُمید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اِس ذیل میں اور ادبی جواہرریزے بھی عام منظر پر آئیں گے [۱] - " مکاتیب غالب " کی تہذیب و ترتیب کا سر انجام ہمارے زمانے کے ایک ممتاز ادیب اِمتیاز علی صاحب " عرشی " کے ہاتھوں ہوا ہے اور اُنھوں نے کتاب کی تصحیح اور ترتیب میں کاوش اور محنت ہی سے کام نہیں لیا ؛ تحقیق ' اِنشا پردازی ' ستھرے مذاق کی بھی داد دی ہے -

کتاب میں کل ۱۱۷ خط ہیں : ۴۲ نواب یوسف علی خاں کے ' ۶۵ نواب کلب علی خاں کے ' باقی ۱۰ اور لوگوں کے نام - نواب یوسف علی خاں کے نام ۴ خط فارسی میں ہیں اور ایک فارسی قصیدہ بھی " غالب " کے " کلیات فارسی " میں سے نقل کرکے خطوں میں شمار کرلیا گیا ہے - ایک فارسی قطعہ " غالب " نے احباب میں تقسیم کرنے کو چھپوایا تھا ؛ ایک نسخہ نواب کلب علی خاں کو بھی بھیجا - وہ بھی خطوں میں گن لیا گیا - اِن دونوں کو خارج کرنے پر دونوں نوابوں کے نام کے خطوں کی تعداد ۴۱ اور ۶۴ ٹھہرتی ہے اور کل خط' ۱۱۷ کی جگہ ' ۱۱۵ رہ جاتے ہیں ' جن میں سے ۴ فارسی میں ' ۱۱۱ اُردو میں ہیں - اُردو خطوں میں سے کم سے کم چوبیس پچیس ماہواری تنخواہ کی رسیدیں ہیں اور سوا ہنڈی کے پہنچنے کی اِطلاع کے اِن رقعوں میں اور کوئی مطلب

[۱]—" مکاتیب " ص ۷۶ ح ۱ -

نہیں، نہ عبارت میں کوئی تنوع ہے سوا اِس کے کہ کہیں کہیں کوئی لفظ ادل بدل گیا ہے -

مرزا " غالب " بڑی آن‌بان کے آدمی تھے - خودداری اور تمکنت اُن کے خطوں میں قدم قدم پر نمایاں ہے ؛ مگر ضرورت اِنسان کو مجبور کردیتی ہے - اِن رام‌پور والے خطوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو پڑھ کر رنج ہوتا ہے کہ مرزا صاحب بار بار دست سوال دراز کرتے ہیں اور نواب کلب علی خاں طرح طرح سے ٹالتے اور بالآخر چپ ہو جاتے ہیں- عجب نہیں اِنہیں خطوں کے باعث " غالب " نے رام پور والی خط کتابت کے شائع ہونے کو پسند نہ کیا ہو - نواب صاحب کا طرز عمل سمجھ میں نہیں آتا ، البتہ دو باتیں ذہن میں آتی ہیں : ایک یہ کہ نواب صاحب جہاں اهل فن کی سر پرستی میں فیاضی سے کام لیتے ، کفایت پر بھی نظر رکھتے اور بے محل صرف سے بچتے تھے - دوسرے یہ کہ مرزا " غالب " کی بعض تحریریں کبیدگی کا باعث ہوئی تھیں جس کا اثر باوجود معافی کے پوری طرح زائل نہیں ہوا - تنخواہ بند نہ کی ، مگر مزید مراعات سے ہاتھ کھینچ لیا - اِن تحریروں کا قصہ یوں ہے کہ نواب صاحب نے مرزا صاحب کے پاس ایک نثر " تقریظ شرح قصائد بدر چاچی " اِصلاح کے لئے بھیجی - مرزا صاحب نے دو لفظوں سے اِختلاف کیا، نواب صاحب نے " فرہنگ جہانگیری " اور " فرہنگ رشیدی" سے شواہد تلاش کر کے بھیجے - اِنہوں نے جواب میں اُن کے متعلق کچھ نہ لکھا ، تو اُدھر سے تقاضا ہوا کہ اگر اِن اُستادوں کے اقوال اِعتبار کے قابل ہوں تو خیر، ورنہ جو صورت ہو لکھئے - اِس کے جواب میں جو خط مرزا صاحب نے بھیجا افسوس ہے کہ وہ دفتر میں نہیں ہے ، مگر نواب صاحب نے جو جواب لکھا تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اپنی عادت کے مطابق اپنی بات پر اڑے رہے -

نواب صاحب نے پھر لکھا کہ " عرفی " کے شعر کے معنی اور " ارتنگ " اور " اوژنگ " کی تحقیق میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ میری سمجھ میں نہیں آتا ' اِس لیے کہ لغت کے اکثر ماہروں نے دونوں کو ایک جانا ہے اور " عرفی " کے کلام کے شارحوں نے عام طور پر " آشیان چیدن " کو " آشیان بستن " کا مرادف لکھا ہے ؛ چنانچہ ہر ایک کی نظیر ملفوف ہے - پھر بھی اگر آپ کی طبع عالی زیر بحث لفظوں کے اِستعمال کو ناپسند کرتی ہے ' تو ویسا لکھیے کہ اِصلاح شدہ تقریظ میں سے اُن کو کاٹ دوں ؛ اِس لیے کہ مجھے شاگردی کا واسطہ آپ سے ہے ' نہ " عرفی " اور اوروں سے - جو نظیریں میری نظر سے گزری تھیں ' میں نے صرف اِطلاع کی غرض سے آپ کو لکھ بھیجیں [۱] - نواب صاحب کی اِس بہت ہی معقول تحریر کے جواب میں حضرت " غالب " نے وہی فرسودہ قصہ عبدالصمد ایرانی کی شاگردی کا اور اپنی طبیعت کی ' مناسبت ازلی بزبان پارسی ' کا دھرانا شروع کردیا اور اُس کے بعد فرہنگ نویسوں پر لعن طعن - اِس لاطائل بحث کے ساتھ ہی ساتھ یہ کہ بھلا آپ اور میرے شاگرد ! " میں تو حضرت کو اپنا اُستاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں..... اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ ارتنگ و اوژنگ متحدالمعنی اور آشیان ساختن و بستن و چیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے ' تو میں نے بےتکلف مان لیا ؛ لیکن نہ اون صاحبوں کے قیاس کے بموجب ' بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق " - نواب صاحب نرے نواب ہی نہ تھے ' مستعد طالب علم تھے ؛ خود بھی ایک راے رکھتے تھے - اِس فضول تقریر اور بےمحل تملق اور بعض اور کنایات سے برہم ہوکر لکھا کہ اگر آپ کو اِسی قسم کی بحث منظور ہے ' تو صاف صاف لکھیے کہ خط

---

[۱]— " عرفی " صاحب نے نظائر کو " نقل کرنا باعث طوالت " تصور کیا - میری راے میں اُن کو نقل ہونا چاہیے تھا -

کتابت کا سلسلہ ختم کردیا جائے - مرزا صاحب اِس فرمان کو " پڑھتے ہی کانپ " اُٹھے اور ایک معذرت نامہ بھیجا - نواب صاحب نے معافی تو دے دی ' مگر پھر کبھی کوئی چیز اِصلاح کے لیے نہ بھیجی -

یہ وہی " قاطع برہان " والی بحث ہے ' جس میں دو گروہ ہوگئے تھے : ایک " غالب " کے جانبدار ' ایک " برہان " کے طرف‌دار - " غالب " کے شاگرد اور احباب آخر تک اُن کے ہم‌زبان رہے - اب تک ایک مثال بھی ایسی نہ ملتی تھی کہ " غالب " کے شاگردوں یا دوستوں میں سے کسی نے اُن کی تحریر یا " دلائل " کے ایک لفظ سے بھی اِختلاف کیا ہو - " غالب " نے خود اپنی دو ایک غلطیوں کو مان لیا اور اُن کو سہو ' کہ کر ٹال دیا - پھر بھی اُن کے جانبداروں کی عصبیت میں مطلق فتور نہ آیا - نواب کلب علی خاں پہلے شاگرد اور دوست ہیں جنھوں نے اِجتہاد سے کام لیا - بلاشبہہ یہ خط کتابت (ص ۷۸ و ۸۰—۸۵) " مکاتیب " کا سب سے زیادہ مفید حصہ ہے -

خطوں کی نقل اور تصحیح میں " عرشی " صاحب نے بڑی اِحتیاط اور دیدہ‌ریزی کو کام فرمایا ہے - مکتوب اِلیہوں کے خطوں میں سے ' جو دارالانشا میں محفوظ ہیں ' وہ عبارتیں حاشیے میں نقل کردی ہیں جن سے " غالب " کی تحریروں کے بعض مطالب کی تشریح ہوتی ہے - جن لوگوں ' جگہوں وغیرہ کے نام متن میں آئے ہیں اُن کے حالات مستند ماخذوں سے مہیا کرکے حاشیے میں درج کردیے ہیں- متن میں کسی ترمیم کی ضرورت دکھائی دی ہے ' تو اُس پر بھی یاد داشت لکھ دی ہے - کتاب کے آخر میں اشخاص ' کتابوں اور اخباروں ' اور مقامات کے تین اِشاریے لگادیے ہیں ' جن سے کتاب کے مطالب کے تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے - خلاصہ یہ کہ متن کے " عمل " (یا تہذیب و ترتیب) کے

فرائض کو " عرشی " صاحب نے بڑی قابلیت سے انجام دیا ہے - پھر بھی کہیں کہیں کچھ گنجایش رد و بدل کی معلوم ہوتی ہے - اور اگر آنے والی سطروں میں اِس کی کسی قدر تفصیل کردی جائے تو بےجا نہ ہوگا [۱] -

۱ — اچھے سے اچھے متن میں بھی کبھی کبھی کچھ کتابت، کچھ اِملا کی غلطیاں ملتی ہیں - تصحیح کرنے والے کا کام ہے کہ ، جہاں تک ہوسکے، اِصلاح کرکے صحیح متن قائم کرے ؛ البتہ جو تصرف کیا ہے اُسے ظاہر کردے - " عرشی " صاحب نے عام طور پر ایسا ہی کیا ہے (ص ۹۰ اور ح ۲ ؛ ص ۹۱ ، ح ؛ ص ۱۰۳ ، ح ۲ ؛ ص ۱۱۵ ، ح ۳ ؛ ص ۱۱۹ ، ح ۱ و ۳ ؛ ص ۱۲۱ ، ح) ؛ مگر کہیں کہیں غلط صورت کو متن میں رکھا ہے اور اُس کی تصحیح حاشیے میں کی ہے - اِس سے یکسانی جاتی رہی - ایک جگہ " غالب " کے قلم سے بجائے " پہنچا " کے " پونچھا " نکل گیا (ص ۹) ؛ اِسی غلط کتابت کو متن میں قائم کرکے اُس پر حاشیہ چڑھایا ہے :

> " یہ میرزا صاحب کا خود نوشتہ اِملا ہے - در اصل اُنھیں سہو ہوا - ورنہ یہی لفظ اِسی سطر میں اونھوں نے درست لکھا ہے " -

بہت کافی ہوتا اگر متن میں صحیح لفظ " پہنچا " لکھ کر حاشیے میں صرف اِتنا لکھ دیا جاتا: " اصل میں ' پونچھا ' ہے ' جو سہو قلم ہے " - " بالکل " (ص ۳۳ و ۴۰) ، " بالفعل " (ص ۳۳) اور " روپیہ " کی جگہ " روپئے " (ص ۹۴ ، س ۱۴) اور اِس قسم کے اور

---

[۱] — جو باتیں " مکاتیب " کے اور تبصروں (خاص کر " اورینٹل کالج میگزین " لاہور ، عدد ۵۳ ، ص ۷۳ — ۸۰) میں آگئی ہیں وہ یہاں چھوڑ دی گئی ہیں -

لفظوں کو ' جو سراسر غلط ہیں ' متن میں داخل کرنا نہ چاہیے تھا -
" علمداري " (ص ۱۲۱ ' س ۸) بےمحل ہے - یہ خط " غالب " کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے - اُنھوں نے یقیناً " عملداری " لکھوایا ؛ کاتب نے " علمداری " لکھ دیا - ایسی صورت میں غلط لفظ کو متن میں لے لینا کسی طرح جائز نہیں -

۲—اِملا کی صحت کا " غالب " کو بہت خیال رہتا تھا - " میرزا تفتہ " کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

> " صاحب ' دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو..........غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے ؟ یاد رکھو ' یاے تحتانی تین طرح پر ہے :
> [۱] جزو کلمہ : 'ہماے برسر موغان ازآن شرف دارد ' - ' اے سر نامہ نام تو عقل گرہ‌کشاے را ' یہ ساری غزل' اور مثل اِس کے جہاں یاے تحتانی ہے جزو کلمہ ہے - اِس پر ہمزہ لکھنا ' عقل کو گالی دینا ہے -
> [۲] دوسری یاے تحتانی مضاف ہے : صرف اِضافت کا کسرہ ہے - ہمزہ وہاں بھی مخل ہے ؛ جیسے ' آسیاے چرخ ' یا 'آشناے قدیم' - توصیفی ' اِضافی ' بیانی ' کسی طرح کا کسرہ ہو ' ہمزہ نہیں چاہتا - ' فداے تو شوم ' ' رہنماے تو شوم ' یہ بھی اِسی قبیل سے ہے.........." [۱]

" مکاتیب " (ص۲۲ ' س۱) میں جو " مـالائے مروارید "چھپا ہے - " غالب " نے اِسے ہرگز اِس طرح نہ لکھا ہوگا اور " عقل کو گالی " نہ دی ہوگی ' بلکہ " مالاے مروارید " بغیر ہمزہ کے لکھا ہوگا - اگر ہمزا اُن کی تحریر میں ہے بھی تو اُن کی صریح ہدایت کے خلاف ہے - اُسے سہو قلم جان کر حذف کرنا چاہیے تھا -

---

[۱] " اردوے معلیٰ " ' حصہ ۲ ' خط ۳۲ -

ہندستانی لفظوں کی کتابت میں بھی " غالب " کو اِحتیاط مد نظر رہتی تھی ' چنانچہ اکثر لفظوں پر اِعراب لگا دیتے تھے ؛ مگر کہیں کہیں اُس زمانے کی روش کے مطابق بعضے لفظوں کی کتابت ناقص کرتے تھے ' جیسے " لکھیے " کی جگہ " لکھی" لکھ کر " ی " پر ہمزہ بنا دیتے تھے [۱] - متن کی تہذیب کے وقت ایسی لکھاوٹ کی تشکیل کردینا لازم ہے ' مگر " مکاتیب " میں کہیں کہیں زائد از ضرورت علامتیں لگا دی گئی ہیں ' جیسے " فرمائیے " کی پہلی یے پر تشدید کی علامت (ص ۹ و ۹۳) -

۳—جو لفظ مختفی ہ پر ختم ہوتے ہیں' اِضافت کی حالت میں اُن کے آخر میں ہمزہ لکھتے ہیں ' مگر اِضافت جہاں نہیں ہے " مکاتیب " میں وہاں بھی اکثر ہمزہ لگا دیا گیا ہے ' جیسے " بستۂ " (ص ۴۳) ' " حمزۂ " (ص ۶۰ ' س ۱۲ و ۱۵) ؛ " لایۂ " (ص ۷۳) ' " نگاشتۂ " (ص ۱۱۰) - یہ صحیح نہیں - ہمزہ یا تو کسرۂ اِضافت کا قائم مقام ہے ؛ یا یاے وحدت کا ' جیسے ' آمد افسوس کناں مغبچۂ بادہ فروش ' ؛ یا ماضی قریب واحد مخاطب میں ی کا ' جیسے ' دیر آمدۂ زراہ دور آمدۂ ' - اِس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ عطف کے واو سے پہلے اِضافت کا ہمزہ نہیں آتا ؛ البتہ وحدت یا مخاطب کا ہمزہ آتا ہے ' جیسے :

' عجیب واقعۂ و غریب حادثہ ایست

انا اصطبرت قتیلاً و قاتلی شاکی ' (حافظ)

اور جیسے کوئی کہے " خوش آمدۂ و صفا آوردۂ " -

۴—کچھ لفظوں کا اِملا " غالب " جمہور کے خلاف کرتے تھے ؛ جیسے " ہاتھ " کو اکثر و بیشتر "ہات" لکھتے اور اُس کا قافیہ "بات " ؛

[۱] رسالۂ " ہندستانی " ' ج ۴ ' س ۹۳ کے بعد کا عکس (الف) ' س ۱۲ -

" وات " کے ساتھ کرتے تھے - پھر بھی " ساتھ " ۃ کے ساتھ لکھتے تھے [۱] - ایک جگہ جو " پانچ ساتھ " آیا ہے (" مکاتیب " ص ۵۱) غالباً سہو ہے -

فارسی لفظوں میں جہاں کہیں ذال ہے "غالب" اُسے زے لکھتے ' اِس لیے کہ اُن کے خیال میں فارسی زبان میں ذال کا وجود نہیں - "مکاتیب" کے متن میں " غالب " کا اِملا برقرار رکھا گیا - مضائقہ نہیں -

ایک فارسی خط میں " توانگر " کا لفظ آیا ہے اور " تونگر " چھپا ہے (ص ۴۴ ' س ۱۵) - اِس لفظ میں الف پڑھا نہیں جاتا مگر لکھا ضرور جاتا ہے ' اِس لیے کہ اِس کی اصل " توان‌گر " ہے - اگر " غالب " نے اپنے قلم سے بے الف کے لکھا ہے ' تو علاوہ سہو قلم کے ایک اِمکان یہ بھی ہے کہ وہ تلفظ پر نظر کر کے الف کو ضروری نہ جانتے تھے ' اور اِس لفظ کی لکھاوٹ میں بھی فرہنگ نگاروں سے اِختلاف رکھتے تھے -

۵—اگلے زمانے میں معروف اور مجہول یے کا کوئی فرق کتابت میں نہ تھا - حرف کی دو شکلیں (ی اور ے) موجود تھیں ' مگر وہ تلفظ پر مبنی نہ تھیں - جب چاہا گول ی ' جب چاہا لمبی ے ' لکھ دی - مخلوط تلفظ والی ۃ بھی دو طرح سے لکھی جاتی تھی (ہ اور ھ) - اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں فورٹ ولیم کالج میں قواعد منضبط ہوئے ' تو معروف یے کے لیے ی ' مجہول کے لیے ے ' مخلوط ۃ کے لیے دوچشمی ھ معین کی گئی ؛ مگر دھلی تک اِن قاعدوں کا اثر بہت دیر میں پہنچا اور " غالب " کے زمانے میں ' بلکہ اُس کے بہت بعد تک ' کوئی فرق اِن حرفوں کی کتابت میں نہیں کیا جاتا تھا -

---

[۱]—رسالہ " ھندستانی " ج ۴ ' ص ۱۰۵ کے سامنے کا عکس ' س ۱—۲ -

" غالب " یا اُن کے ہمعصروں کے قلم کی لکھی ہوئی عبارتوں میں اِس فرق کو تلاش کرنا (دیباچہ ص ۱۴۵) بجا نہیں - " مکاتیب " کے چھاپے میں " عرشی " صاحب نے یے اور ھے کی تشکیل کردی ہے ' مگر کہیں کہیں اِس میں غلطی ہوگئی ہے :—

ص ۴۷ اور ص ۱۱۰ - " کی پنسن اور " اپنی پنسن " کی جگہ " کے پنسن " " اور اپنے پنسن " چاہیے ؛ اِس لیے کہ " غالب " نے اِس لفظ کو عموماً مذکر ہی لکھا ہے -

ص ۳۳ - " قولنج دورے " قرین قیاس نہیں - یا تو " قولنج دورے " ہوگا یا " قولنجی دورے " -

ص ۸۰ ' س ۱۰ - " کی برابر " صحیح نہیں - " کے برابر " چاہیے -

ص ۱۳۴ ' س ۱۴ - " ہوئی " کی جگہ " ہوئے " چاہیے -

ص ۴۱ ' س ۱۰ - " تہرنا " کی تصحیح غلطنامے (ص ۱۳۱) میں " ٹھہرنا " کی گئی ہے - یہ " تصحیح " کب صحیح ہے ؟ اُس زمانے میں لوگ اکثر " ٹھہر " میں ایک ہی ہ لکھا کرتے تھے - اُسی مطابق " غالب " نے " تہرنا " لکھا - چھاپہ خانے والے نے اگر دوچشمی ھ بڑھا دی ' تو کوئی بڑا گناہ نہیں کیا - تصحیح یوں ہونا چاہیے تھی : " ٹھہرنا " -

ص ۵۵ ' س ۱۴ - " میلھ " میں دوچشمی ھ درست نہیں - " میلہ " چاہیے -

۹—اُس زمانے میں عام طور پر لوگ دو دو ' تین تین لفظوں کو ملاکر لکھ دیا کرتے تھے - آج کل بھی لوگ کم اِس خصوص میں کسی قاعدے کی پابندی کرتے ہیں - مرزا " غالب " لفظوں کو زیادہ تر الگ الگ لکھتے تھے ' پھر بھی کوئی اِلتزام نہ تھا - اگر اصل تحریر میں

لفظ ملاکر لکھے گئے تھے ' تو اُن کو الگ کردینا بوجھا نہ ہوتا - " بھیجدوں " (ص ۷) " اسواسطے " (ص۹) ' " کیواسطے " (ص ۱۳) ' " بیٹھرھا " اور " نرمی " (ص ۳۸) ' " ایکدن " (ص ۴۰ و ۷۵) ' " چگویم " (ص ٥۹) ' " آنوقت " (ص ۶۹) کو الگ الگ کرکے لکھنا یقیناً بہتر ہے -

۷—" عرشی " صاحب نے اِلتزام کے ساتھ متن میں اِضافت کا کسرہ لگایا ہے - البتہ کہیں کہیں اِس اِلتزام میں مبالغہ کیا ہے ؛ جیسے " نردای وِرود " (ص ۴) ' " عطای پنسن " (ص ۱۵) ' " مقتضای ... " (ص ۹۹ و ۲۱) ' " نعمتہای تو " (ص ۳۱ و ۳۵) ' و " ابتدای ... " (ص ۴۱) ' " فالہ ھای ...منزلہای...ھوای ... " (ص ۹۸) " برای... " (ص ۶۹) ' " جلالی طباطبائی " (ص ۷۷) ' " عظمای عجم " (ص ۸۳) - اِن صورتوں میں اِضافت کا اِظہار ' بجائے کسرے کے ' یے سے ہوتا ہے - اِس یے پر کسرہ لگانا اُصول اِملا کے خلاف ہے -

ایک آدھ جگہ اور بھی میرے نزدیک کسرہ درست نہیں ؛ جیسے (ص ۵۸ ' س ۱۱) " تکیہ‌دار " کی ر کا کسرہ - " آپ کے تکیہ‌دار روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے " - اِس جملے میں " تکیہ‌دار " اور روزینہ خوار " دونوں صفتوں کے بیچ میں کسرۂ اِضافت نہ پڑھنا بہتر ہے ؛ اِس لیے کہ یہ ترکیب ھندستانی ہے ' فارسی نہیں - فارسی میں لکھتے توالبتہ یوں لکھتے : " این فقیرِ تکیہ‌دارِ روزینہ خوارِ شما " [۱] - یہی حال اُس کسرے کا ہے جو " تاریخ " (ص۱۱۳ ' س ۱۲) کے آخر میں لگایا گیا ہے - بہتر صورت بغیر کسرے کے ہوگی : " ساتویں تاریخ شعبان کو نہالوں گے " -

---

[۱]—ص ۶۱ ' س ۱۹ - " دار " اور " روزینہ " کے بیچ میں جو سکتہ (کاما) ہے ' ظاہرا چھاپے کی غلطی ہے -

۸—" اسپہبد " کی بؔ پر پیش ہے (ص ۴۰) - یہ شاید " غالب " ہی کے قلم سے ہو ' مگر ہے غلط - صحیح بؔ کا زبر ہے - "موبد" اور " ہیربد " میں بھی دوسرا ٹکڑا یہی " بَد " ہے ' جو زبر ہی سے بولا جاتا ہے ؛ پھر " اسپہبد " میں پیش کہاں سے آیا ؟

۹—ایک جگہ " غالب " کا بیجا تفطُّن کیا گیا ہے :

" عمرو " ایک عربی نام ہے ' جس کا میمؔ ساکن ہے اور واؔو لکھا تو جاتا ہے ' پڑھا نہیں جاتا - " غالب " نے ایک فارسی قصیدے میں چار جگہ " عمر " کے میمؔ کو متحرک کرکے باندھا ہے اور عینؔ اور میمؔ پر زبر ' رےؔ پر جزم بنا دیا ہے ' واؔو نہیں لکھا (ص ۵۹ و ۶۱) - " عرشی " صاحب فرماتے ہیں : " میرزا صاحب نے اِس نام کا اِملا اور تلفظ دونوں غلط لکھے ہیں ...... " (ص ۵۹ ' ح ۲) - میں عرض کرتا ہوں کہ " غالب " نے جان کر اِس نام کو یوں باندھا ہے اور اِہتمام کے ساتھ زبر زبر لگا دیا ہے - یہ نام عام طور پر ایسے ہی بولا جاتا ہے ' بلکہ امیر حمزہ کی داستان پڑھنے والے اور سننے والے اکثر و بیشتر جانتے بھی نہیں کہ میمؔ ساکن ہے - ایسی صورت میں عرب کے تلفظ کا تتبع کرنا نرا تکلف ہے -

" غالب " نے اردو میں بھی ایک جگہ یہ نام اِستعمال کیا ہے اور اُن کے اُردو دیوان کے اُن نسخوں میں بھی ' جن کی تصحیح خود مصنف نے کی تھی ' اِس نام کی کتابت بجائے عینؔ کے الفؔ سے ہوئی ہے : ' غم گیتی سے مرا سینہ آمرؔ کی زنبیل ' - اِس پر مولانا علی حیدر طبا طبائی مرحوم نے بھی اِعتراض کیا ہے [۱] ؛ مگر مولانا " حسرت "

---

[۱]—" شرح دیوان اُردوے غالب " (لکھنٔو) ص ۳۱۰ - ۳۱۱ -

موہانی نے صحیح تاویل کی ہے کہ " غالب نے ' عمرو ' کے بجاے ' امر ' بہ لحاظ ادب لکھا ہے " [۱] -

حقیقت اِس کی یوں ہے: عرب کا مشہور شاعر اُمیہ ابن ابی الصلت باوجود حنیفی عقائد کے اِسلام نہ لایا ؛ مگر اُس کے بھتیجے عمرو ابن اُمیہ ضمری نے اِسلام قبول کیا ' اور صحابیوں میں ایک درجہ رکھتے ھیں - بڑے بہادر اور ھوشیار تھے - نجاشی کے دربار میں سفیر کے طور پر بھیجے گئے اور مغازی میں جاسوسی کی خدمت بڑی ھوشیاری سے انجام دیتے - " داستان امیر حمزہ " کے مصنف نے حضرت حمزہ کو قصے کا ھیرو بنایا تو اُن کے رفیقوں میں ایک عیار کی بھی ضرورت ہوئی اور اِس کے لیے عمرو ابن اُمیہ سے بہتر کوئی نہ دکھائی دیا - جاھل مسلمان " عمرو " کو " عمر " سے خلط ملط کرنے لگے اور یہ شبہہ دلوں میں پیدا ہوا کہ " داستان امیر حمزہ " میں ' عمر عیار ' کا جو کردار دکھایا ہے اُس سے حضرت عمر ابن خطاب کی توھین مقصود ہے - محرم کی مجلسوں میں کبھی کبھی بےلطفی ہوگئی کہ عمر ابن سعد کا نام مرثیے میں آگیا ' تو بھی لوگوں نے سمجھا کہ حضرت عمر کی توھین کی گئی - اِس بحث میں لوگوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ابن سعد کا نام ' عمرو ' تھا ' ' عمر ' نہ تھا - یہ دعوی غلط تھا ' مگر اُس زمانے میں شیعوں سنیوں ' دونوں گروھوں میں سنجیدہ لوگ زیادہ تھے؛ ایک دوسرے کا پاس کرتے تھے - اِس پر فیصلہ ہوگیا کہ ابن سعد کا نام آئے گا تو ' عمرو ' کہیں گے ' ' عمر ' نہ کہیں گے - مرثیوں کے لکھنے میں یہ اِلتزام ہوا کہ جہاں یہ نام آتا واو بڑھا کر لکھتے - " غالب " نے اِسی لحاظ سے ' امر ' لکھا -

[۱] — " دیوان غالب مع شرح " (علی گڑھ ۱۹۱۱ ء) ص ۱۴۹ -

فارسی قصیدے میں زیادہ تصرف کو ٹھیک نہ جانا ؛ عین کو الف سے نہ بدلا ' عین اور میم دونوں پر زبر ' رے پر جزم ' لگا دیا کہ شبہے کی گنجایش نہ رہے - طبا طبائی مرحوم لکھتے ھیں :—

> " میں نے خود سنا ہے داستان گویوں کو اِس طرح کہتے ہوئے - (عیار عیاران عمرو بن اُمیۂ ضمری) - یعنی عمرو کے باپ کا ' اور خاندان تک کا ' نام داستان میں ' ذکر کرتے ھیں - مصنف [یعنی غالب] کو یہ دھوکا ہوا کہ جس طرح قصہ فرضی ہے ' نام بھی بےاصل ہوگا ؛ ' عمرو ' نہیں ' ' امر ' سہی " -

یہ ' کہ داستان‌گو عمرو کے باپ اور خاندان کا نام لیتے تھے ' غالباً اِسی غرض سے تھا کہ شبہے کی گنجایش نہ رہے - یہ خیال ' کہ " غالب " کو دھوکا ہوا ' سراسر بیجا ہے - " غالب " اِتنے ناواقف تو نہ تھے -

۱۰ — " مکاتیب " (ص ۵۰) کے حاشیے میں ایک فارسی قصیدہ ' عود هندی " سے نقل ہوا ہے - " عود " کی پہلی اِشاعت میں اِس قصیدے کا متن بہت غلط ہے - بعد کی اِشاعتوں میں کہیں کہیں اِصلاح کی گئی ہے اور کہیں صحیح کو غلط کردیا ہے - " عرشی " صاحب نے قصیدے کے متن کو درست کہا ہے ' پھر بھی نظر ثانی کا محتاج ہے - یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ دو شعر چھوڑ کیوں دیے - اگر سہواً چھوٹ گئے ' تو خیر ؛ اگر متن کی خرابی کے باعث ترک ہوئے ھیں ' تو اِس کا ذکر کردینا ضرور تھا - قصیدے کے پہلے شعر میں " تجلی " کی جگہ "تجلیی" چاہیے ؛ نویں شعر میں " حلنجان " کی جگہ ' فلنجان - تیرھویں شعر میں " گاو " کے واو پر همزہ کی ضرورت نہیں - پندرھویں شعر میں " تو سوی " کے بجاے " بسوی " چاہیے ؛ پہلی اِشاعت میں "بوی" ہے ' جو " بسوی " کی تصحیف ہے - سترھویں شعر میں " زانوی " کی جگہ " زانو " چاہیے -

اُنیسویں شعر میں " عقود صدور " کی جگہ پہلی اِشاعت کا نسخہ " عقود و صدور " بہتر ہے ؛ اُس میں تصرف کرنے کی ضرورت نہ تھی - اٹھائیسویں شعر کے بعد دو شعر ' جو " مکاتیب " میں ترک ہوئے ہیں ، " عود " کی پہلی اِشاعت میں یوں ہیں :

کفی بدست تہی بزر کیسہ دلاک
دمی بسیہ بسی مگکتر زو مدہ مور
کمی زما و کرم از شما بلد تشبیہ
زگردگار بود روز شب بلدہ قصور

میں اِن کو اِس طرح پڑھتا ہوں :

کفے بہ دستِ تہی‌تر ز کیسۂ دلاک ؛
دلے ' بہ نسبہ ' بسے تنگتر ز دیدۂ مور
کمی زما ' و کرم از شما ؛ بلا تشبیہ '
زکردگار بود روز و شب ' ز بندہ قصور

پھر بھی " بود " کھٹکتا ہے - اِس جگہ " کرم " کا ہم‌معنی اور ہم وزن کوئی لفظ ہوتا تو بہتر ہوتا - ایک اِمکان یہ بھی ہے کہ " بود " کی جگہ اصل میں " کرم " ہی تھا - شکست خط میں وؔ اِس طرح مؔ سے ملی تھی کہ دونوں مل کر " و د " پڑھے گئے ؛ اور کافؔ کا مرکز سہو قلم سے چھوٹ گیا تھا ' اِس لیے جو حرف کؔ ہوتا ' بؔ پڑھا گیا - اِس شعر میں " کرم " کی تکرار مخل فصاحت بھی نہیں ' بلکہ " بلا تشبیہ " کے بعد جو فقرہ آیا ہے اُس میں پہلے فقرے کے لفظوں کی تکرار ضروری ہے - " ز بندہ قصور " کی جگہ اگر " ز بندہ کمی " ہوتا ' تو بھی بیجا نہ تھا - قافیے کی ضرورت سے "قصور" کا لفظ آیا ہے -

۱۱ — جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ضروری حاشیے مولف صاحب نے اِضافہ کیے ہیں اور حاشیے بڑی قابلیت اور سلیقے سے لکھے ہیں - پھر بھی ایک آدھ جگہ ضروری باتیں نظر انداز ہو گئی ہیں ؛ جیسے :

ص ۹۵ ' س ۷-۸ - " بقول اُستاد بتغیر لفظ ' جو تم پھر آؤ ؛ تو ' حضرت ' پھریں ہمارے دن ' " - یہاں یہ بتا دینا ضرور تھا کہ " اُستاد " سے مراد " جرأت " ہے اور " تغیر لفظ " یہ کہ " پیارے " کو بدل کر " حضرت " کہا ہے - " جرأت " کا پورا شعر ہے :

" برنگ مہر ہے گردش ہی ہم کو سارے دن
جو تم پھر آؤ ؛ تو ' پیارے ' پھریں ہمارے دن "

ص ۸۲ — " غالب " نے جو خان اِنجو کو " میاں اِنجو " کرکے لکھا ہے ' تو " عرشي " صاحب نے بھی اُن کو ' میاں ' کے لفظ سے یاد کیا ہے (ح ۳) - " غالب " نے تحقیر کی نظر سے ایسا کیا [۱] - " عرشی " صاحب کو اِس کا تتبع نہ چاہیے تھا - سوا " غالب " کے کسی نے " میاں اِنجو " نہیں لکھا ہے - وہ ہندستانی تھے بھی نہیں جو " میاں " لقب پاتے - یہ تو " غالب " کی سینہ زوری ہے کہ " فرہنگ جہانگیری " کے مصنف کو بھی ایرانی نہیں مانتے - خان اِنجو اور ملا عبدالرشید اور " بہار " اور " وارستہ " کا کہنا " غالب " کے نزدیک بے حقیقت ؛ مگر نواب کلب علي خاں ' والی رام پور کے آگے سر جھکا کے فرماتے ہیں : " اب جو پیر و مرشد نے لکھا ... تو میں نے بےتکلف مان لیا " - سبحان اللہ ' کیا داد تحقیق دی ہے - ملا عبدالرشید حسنی تھٹوي کو بھی " شیخ رشید " کہنا تحقیر کی غرض سے ہے ' اِس لیے کہ وہ حسنی سید تھے ' اور

[۱] — جیسے ایک جگہ " فیضی " کو لکھتے ہیں : " اہل ہند میں سوا خسرو دہلوي کے کوئی مسلم‌الثبوت نہیں - میاں فیضی کي بھي کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے " - (اُردوے معلیٰ ' حصہ ۲' خط ۳) -

" غالب" کے زمانے سے پہلے ھی " شیخ" اور " سعد" کی تعریف ھندستانی زبان میں معین ھو چکی تھی ' جو اب تک قائم ھے ؛اور یہ خیال دور از کار ھوگا کہ اُن کی سیادت " غالب " پر منکشف نہ تھی - اور جگہ بھی " غالب " نے اِن کو اِسی طرح یاد کیا ھے : " عبدالرشید میں کیا شیخی اور میاں اِنجو میں کیا پھری ھے " [۱] -

۱۲—ھر مکتوب اِلیہ کے نام کے خطوں کو " عرشی ' صاحب نے تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ھے اور خطوں کے متن سے پہلے مکتوب اِلیہ کے حالات لکھ دیے ھیں - نواب یوسف علی خاں " فردوس مکاں " اور نواب کلب علی خاں " خلدآشیاں " کی تصویریں اُن کے حالات کے مقابل دے دی ھیں - " غالب " جو القاب لفافے پر لکھا کرتے تھے اُسی کو " عرشی " صاحب نے سرنامہ قرار دیا ھے ' اور یہ اِختراع بہت خوب ھے -

نواب یوسف علی خاں کے متعلق " عرشی " صاحب لکھتے ھیں : " داڑھی مونچھ صاف کراتے ... تھے " (ص ۲) ؛ مگر نواب صاحب کی جو تصویر دی گئی ھے اُس میں مونچھیں " صاف " نہیں کرائی گئی ھیں ' بلکہ معلوم ھوتا ھے کہ گویا مسیں بھیگ رھی ھیں - یہ تصویر نواب صاحب کے اُردو کلیات کے قلمی نسخے میں شامل ھے (دیباچہ ص ۱۵) ؛ شعرو سخن کا مشغلہ مسند نشینی کے بعد شروع ھوا (" مکاتیب " ص ۲) ؛ مسندنشینی ۳۹ برس کی عمر میں ھوئی تھی (ص ۱) - اِس سے نتیجہ نکلتا ھے کہ مونچھیں مہین کترواتے تھے - اگر مونچھوں کا " صاف " کرانا کسی اور ذریعے سے معلوم ھوا ھے ' تو اُسے ظاھر کرنا چاھیے تھا -

[۱]—" عودھندی " ص ۱۳۸ اور " ھندستانی " ج ۳' ص ۱۵۳ -

ص ۱ ' س ۱۴-۱۵ - " سلامی گهارا ضرب توپ کے بجائی تهرا ضرب مقرر کی گئی " - " گهارا " اور " تهرا " مقدوم نهیں - ۱۱ سے ۱۸ تک سب گنتیوں میں ہ اصلی اور ملفوظ هے ' اِس لیے الف لکھنا درست نہیں - یہ اور بات هے کہ بعضے لوگ ' خاص کر لفظ کے آخر کی ' ہ کا تلفظ بہت هلکا سا کرتے هیں - دلی والوں کو اکثر سنا هے کہ " گناہ " کو " گنا " بولتے هیں ؛ بعضے لوگ " بارا " ' " تیرا " وغیرہ بولتے هیں - اوپر کی عبارت میں " بجاے ' کی ی پر همزہ هے ' جو نہ هونا چاهیے تها -

۱۳ -نواب کلب علی خاں کے نام سے پہلے "عرشی" صاحب ' "محمد" کا لفظ اِضافہ کرتے هیں (ص ۴۸) - شاید اُنہیں خیال نہ آیا کہ یہ سوء ادب هے - نام پاک " محمد " تبرکاً بچوں کے نام کا پہلا جز بنا دیا جاتا هے ' لیکن یہ هرگز نہ چاهیے کہ جن ناموں میں "عبد" " غلام" " خادم" ؛ یا اِسی قسم کا کوئی اور لفظ هو اور وہ ' سوا اللہ کے نام ' کے کسی اور کا مضاف هو ' " محمد " اِضافہ کیا جائے - جن ناموں میں " کلب " یا اِس قبیل کا کوئی اور لفظ هو اُن کے ساتھ کسی حال میں " محمد " " احمد " وغیرہ نہ لانا چاهیے - اگر کسی کا نام " غلام قادر " ' " عبداللہ " " عبدالغنی " هے ' تو اُس سے پہلے " محمد " درست ؛ لیکن اگر " غلام حسین " ' " غلام محی الدین " ' " خادم علی " یا اِسی طرح کچھ اور هے ' تو بیجا هے - اِسی لیے " غالب " نے " محمد یوسف علی خاں " تو لکھا (ص ۱ ' س ۳) ' مگر نواب " خلد آشیاں " کے نام کے ساتھ " محمد " نہیں لکھا (ص ۴۸ ' س ۲) - معلوم ایسا هوتا هے کہ دفتر والوں نے اور ناموں کے ساتھ " محمد " دیکھ کر اُن کے نام میں بھی بڑھا دیا - اِس کا تتبع کیا ضرور تها ؟

۱۴۔۔۔کچھ حاشیے ضرورت سے زیادہ لمبے ھیں ' کچھ بالکل زائد - صفحہ ۸۹ کا حاشیہ ۳ صرف اِتنا ھی کافی ھوتا : " باقر علی خاں اور حسین علی خاں مراد ھیں (دیکھو دیباچہ ص ۲۴-۲۷) " - ص ۹۷ کا ح ۴ زائد ھے - دیباچے میں اِن لوگوں کا ذکر تفصیل سے آچکا ھے - صفحہ ۱۰۵ کے حاشیے کے بعد صفحہ ۱۱۵ کے حاشیہ ۵ کی مطلق ضرورت نہ تھی - ایک میں تفصیل ' دوسرے میں محض اُس کا حوالہ کافی ھوتا -

---

کتاب کا متن مع تمہیدی عبارتوں اور حاشیوں کے ۱۲۱ صفحے کا ھے - اُس پر " عرشی " صاحب نے نہایت تحقیق اور بڑی خوبی کے ساتھ ایک دیباچہ لکھا ھے ' جس کا حجم ۱۷۳ صفحے کا ھے - دیباچے سے پہلے جو دس صفحے ھیں اُن میں کتاب کی خوشنما لوح' مضامین کی فہرست' تصویروں کی فہرست اور بشیر حسین زیدی صاحب ' وزیر ریاست ' کی لکھی ھوئی " تقریب " ھے - جلد سادہ مگر خوشنما ھے - پشتے پر " مکاتیب غالب " کے نیچے کچھ انگریزی حرف ھیں ' گویا ' اطلس میں ٹاٹ کا پیوند ' - کتاب اُردو فارسی میں ؛ پھر انگریزی حرفوں میں نام اور بائیں جانب کی لوح کس لیے اور کس کے لیے ؟

اُردو لوح کی عبارت میں " دیگر " کا لفظ کسی طرح درست نہیں - تعجب ھوا کہ دیباچے(ص ۱ 'س ۱۱)میں بھی یہ لفظ اِسی ترکیب سے موجود ھے :

> " ... غالب کے مکاتیب ' جو موصوف نے نواب فردوس
> مکان ' نواب خلد آشیان (طاب ثراھما) یا دیگر
> وابستگان دربار کے نام لکھے تھے-"

نواب " فردوس مکان " اور نواب " خلدآشیان " کو " وابستگان دربار " میں شمار کرنا اگر صحیح ھے تو " دیگر " کا لفظ ٹھیک ھے ' نہیں

ہیں - " اور وابستگان دربار " کافی ہوتا! اور اگر کسی اور لفظ کا
ہ مخواہ لانا ہی مقصود تھا ' تو " اور " کے بعد " بعض " کا لفظ
کتا تھا -

دیباچے کے مطالب اور ماخذوں اور کتاب کی چار تصویروں کے ذکر
ں ۱۱ - ۱۹) کے بعد مولف نے "غالب" کی زندگی کے حالات ' اُن کی
ںلیفوں اور اُن کے طرز تحریر وغیرہ پر مفید بحثیں کی ہیں ' جن
ں سے بعض بہت قابل تعریف ہیں' جیسے "غالب" کے فارسی کو چھوڑ
اُردو میں خط لکھنا اِختیار کرنے اور اُن کی اُردو نثر کی برتری کے اسباب
ں ۱۱۴ - ۱۲۹) - البتہ دیباچے کے بعض حصوں میں بیجا اِطناب سے
لیا گیا ہے - کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مطالب کو بہت
پلا پھیلا کے بیان کرنے اور دیباچے کا حجم بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے -
ود " مکاتیب " کی عبارتیں کثرت سے دیباچے میں نقل ہوئی ہیں '
ن میں چند بہت طویل ہیں - اِس کی ضرورت نہ تھی - بیشتر
ورتوں میں " مکاتیب " کے صفحوں کا حوالہ دے دینا کافی ہوتا -

کہیں کہیں ایک ہی بات دو پیرایوں میں بیان ہوئی ہے ؛ جیسے:

" احمد بخش خاں...میرزا صاحب کی بی‌بی کے
حقیقی چچا اور میرزا صاحب کے چچیا سسر تھے "
(ص ۲۲) -

اور میرزا صاحب کے چچیا سسر " کا ٹکڑا یہاں زائد ہی نہیں '
مضحکہ خیز ہے - " غالب " کی تحصیل علم (ص ۲۷) کے سلسلے میں
طب " کی سرخی (ص ۲۸) دیکھ کر خیال ہوا کہ اُنھوں نے طب بھی
ھی ہوگی ' مگر معلوم ہوا کہ اِس سرخی کا مبنیٰ "غالب" کا صرف یہ
ملہ ہے کہ " میں طبیب نہیں ہوں مگر تجربہ کار ہوں " - اِس پر یہ
یاس کرلینا ' کہ یہ تجربہ طب کی کتابوں کے مطالعے سے حاصل ہوا

تھا ' درست نہیں [۱] - ایساهی کچھ حال " علم نجوم " کی بحث کا ہے - اِس طرح پر تو ہر فارسی ' خاص کر قصیدہ گو ' شاعر منجم قرار پائےگا ' اِس لیے کہ اِتنا علم نجوم کا تقریباً ہر شاعر کے کلام سے پایا جاتا ہے - اِسی طرح اور بہت ساری سرخیاں ہیں ' جیسے " صدق و سداد " (ص ۳۰) - اِس کی بنا یہ ہے : "غالب" نے ' اپنے خلوص کا یقین دلانے کو ' نواب یوسف علی خاں کو لکھا تھا کہ " فقیر کا شیوہ صدق و سداد کا ہے" - ایک دوسرے خط میں معذرت کے طور پر لکھا تھا : " لازم کرلیا ہے کہ بیہودہ گزارش نہ کروںگا اور کبھی کسی کی سپارش نہ کروںگا " - یہاں " بیہودہ گزارش" سے سوا " سفارش " کے کچھ مراد نہیں - سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس فقرے سے " لغو گوئی سے نفرت " (ص۳۰) کیوںکر نکلتی ہے ؟ نواب کلب علی خاں کو جو معذرت‌نامہ "غالب ' نے بھیجا تھا ' اپنی بےگناہی ثابت کرنے کو ' اُس میں خدا اور رسول کی قسم کھاکر لکھا تھا : " خدا و رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا " - اِسے " قسم سے پرہیز " فرض کرنا (ص ۳۱) بجا نہیں - " رنج پر رنج " ، " خوشی سے خوشی" ، " خیر خواہی" (ص ۳۱) اور اور بہت سی سرخیاں بےضرورت یا بےمحل ہیں- " امراض اور ضعف پیری" کے ذیل میں دس سرخیاں قائم کی گئی ہیں : (۱) قولنج ' (۲) امراض مختلفہ کا ہجوم ' (۳) نیم مردہ ' (۴) کوفتہ و رنجور ' (۵) نیم‌جاں ہوں' (۶) حواس درست نہیں' (۷) ضعف بصر اور رعشہ ' (۸) امراض قدیم بڑھ گئے ' (۹) فرض محال ' (۱۰) اب دم نہیں ' (ص ۳۵—۳۷) - یہ دسوں بےضرورت سرخیاں اگر حذف کر دی جائیں اور اِختصار سے کام لیا جائے تو یہ ڈھائی تین صفحے ایک

---

[۱]—ایک اور دوسرے کو بھی ایک نسخہ بتایا ہے " اُردوے معلی" (ص۸۹) ' مگر اِن باتوں سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ " غالب " نے طب کی تحصیل کی تھی یا طب کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے -

صفحے سے کم میں آجاتیں - صفحہ ۹۹ میں " توشۂ راہ " کا حال مولف نے " غالب " کی تحریر سے لے کر اپنے لفظوں میں پانچ چھ سطروں میں بیان کر دیا تھا اور وہ کافی تھا ؛ مگر اُسی بات کو " غالب " کے لفظوں میں بھی نقل کیا ہے - اِس سے کوئی سات سطریں اور بڑھ گئیں (ص۱۰۰) اور بےضرورت طول ہوا - اِسی صفحے پر " ناسازیِ طبیعت " کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے ' حذف کے قابل ہے - " تاریخ ورود رام‌پور " کے بیان میں بھی کسی قدر اِختصار ممکن تھا - صفحہ ۱۴۹ کے آخر میں ایک اِقتباس ہے اور وہی صفحہ ۱۵۱ میں آیا ہے - اِختصار مد نظر ہوتا تو پہلے مقام میں یہ جگہ نہ پاتا -

جیسا کہ " دستنبو " میں مذکور ہے [۱] ' نومبر ۱۸۵۸ع سے پہلے ہی " غالب " نے ملکہ وکٹوریا کی مدح میں ایک قصیدہ [۲] کہ کر لارڈ اِلن‌برا ' سابق گورنر جنرل ' کو لندن بھیجا کہ وہ اُسے بارگاہ شاہی میں پیش کر دیں - جواب آیا کہ قصیدہ پہنچا ؛ میں نے حکام پیشی کو بھیج دیا کہ گزرانا جائے - پھر مسٹر ہیرنگٹن [۳] کی تحریر آئی کہ جو قصیدہ لارڈ اِلن‌برا نے بھیجا تھا اُس پر حکم ہوا کہ قصیدہ گزار ' حاکم ہند کے توسط سے ' اپنے مطالب گزارش کرے - " غالب " نے عرضداشت لکھ کر لارڈ کےننگ کو بھیجی ' تو اُنھوں نے اُس کی رسید اور اُس کے اِنگلستان بھیجے جانے کی اِطلاع لکھی - چار مہینے پیچھے مسٹر رسل کلرک [۴] نے عرضداشت کا جواب بھیجا - یہ سب ہو چکا تھا کہ

---

[۱]—" کلیات نثر غالب " (لکھنئو) ص ۳۹۳—۳۹۵ -

[۲]—نظم نخست زمزمۂ خونچکان دهد ' (" کلیات نظم غالب " ص ۲۵۶) -

[۳]—نولکشوری نسخے میں ' زرنگٹن ' ہے جو صحیح نہیں - غالباً هنری بلک هیرنگٹن مراد هیں -

[۴]—جارج رسل کلرک ۱۸۵۶ سے ۱۸۵۸ م تک بورڈ آف کنٹرول کے نائب سکتر اور سکتر رهے - اُس کے بعد مستقل سکتر هوئے -

پہلی نومبر کو اعلان ہوا کہ آج سے ہندستان میں ملکۂ وکٹوریا کا عمل ہو گیا - مرزا صاحب نے خوش ہوکر نواب یوسف علی خاں کو لکھا :

"میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں ' اور وزرائے ملکۂ دارادربان کے دو سارٹی‌فکٹ پا چکا ہوں - اگر اِس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے ' تو... ' دستنبو ' میں دیکھا چاہیے " - [۱]

ظاہر ہے کہ یہاں ' مداحوں میں نام لکھوانا ' عبارت ہے قصیدہ لکھ کر ممدوح تک پہنچا چکنے سے اور ' سارٹی‌فکٹ ' اُن خطوں کو کہا ہے جو قصیدے اور عرضداشت کی رسید اور " غالب " کی عقیدتمندی اور وفاداری کے گویا اعتراف میں دو گورنر جنرلوں نے اُنہیں بھیجے تھے - دیباچہ نگار کو دھوکا ہوا جو وہ لکھتے ہیں :

"اِس عرصے میں مرزا صاحب نے مداحان حکومت انگلشیہ میں اپنا نام درج کراکے وزرائے ملکۂ معظمہ کے دو سارٹیفکٹ حاصل کر لیے تھے " (ص ۵۲) -

اِن لفظوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ' مداحان حکومت انگلشیہ ' کا کوئی باضابطہ رجسٹر رکھا جاتا تھا جس میں " غالب " نے اپنا نام بھی " درج کرا کے " اپنے نام کی رجسٹری کے دو سارٹیفکٹ حاصل کر لیے تھے -اگر " عرشی " صاحب " دستنبو " کو دیکھ لیتے ' جس کا حوالہ خود " غالب " کے خط میں ہے ' تو یقیناً یہ لغزش نہ ہوتی -

ص ۹۲ - ۹۳ - "غالب" نے نواب یوسف علی خاں سے اپنی شناسائی کا زمانہ تقریباً ۱۸۳۰ ع بتایا ہے - کہیں لکھا : " میرے آشنائے قدیم " ، کہیں : " تیس تیس [۲] برس کے میرے دوست " - مانا کہ آغاز

---

[۱]—نیز دیکھو " اُردوے معلی " ص ۳۱۰ جہاں 'سارٹی فکٹ ' کا ذکر نہیں -
[۲]—" اردوے معلی " کی پہلی اشاعت (۱۸۶۹ م) میں " تیس تیس " تھا ' کلکتے کی اشاعت (۱۸۸۳ م) کے مصحح نے " تیس بتیس " بنا دیا اور "عرشی" صاحب کو اُس

میں نواب صاحب کی عمر بارہ چودہ برس کی تھی ؛ اُسی زمانے میں " غالب " لکھتے تو اُن کو " دوست " نہ لکھتے - " دوست " کا لفظ اُس وقت لکھا کہ رامپور جاکر نواب صاحب کے مہمان بھی رہ چکے تھے اور نواب صاحب کا سن کوئی چوالیس برس کا تھا ، " غالب " کا باسٹھ تریسٹھ برس کا - جو مراسم اِبتدا میں صرف " شناسائی " یا " اُستادی شاگردی " تک محدود تھے وہ بڑھ کر " دوستی " تک پہنچ گئے تھے - اب وہ سارا زمانہ " دوستی " کا کہلائے گا - پس اگر " غالب " نے " دوستی " کا لفظ نواب صاحب کے لیے لکھا ، تو غلط نہیں - شاگردی کے زمانے کی تحقیق میں بہت پرپیچ ہو گیا ہے - اول تو خطوں اور رقعوں میں زمانے کا ٹھیک ٹھیک تعین کوئی نہیں کرتا ؛ اور پھر " غالب " سے یہ اُمید کرنا سراسر عبث ہے کہ اُنہوں نے ایک ایک دن کا حساب کر کے لکھا ہوگا - اکثر بیان تخمینے اور محض یاد پر مبنی ہیں -

ایسی صورت میں رامپور کے قیام کی مدت کے سلسلے میں "چھ سات ہفتے اور کچھ دن کم دو مہینے" کو " مختلف بیان " کہنا (ص ۹۱) زیادتی ہے - "عرشی" صاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے ، ایک مہینا بیس دن ، جس کے پچاس یا اُنچاس دن ہوتے ہیں ، اور سات ہفتے کے بھی اُنچاس دن ہوتے ہیں ، اور یہ بھی غلط نہیں کہ " کچھ دن کم دو مہینے " کا اِطلاق اُنچاس پچاس دن پر ہو سکتا ہے -

کہیں کہیں ایسے لفظ زائد ہیں جو نامناسب یا نادرست ہیں ؛ جیسے صفحہ ۷۱ کی آخری دو سطروں میں " اَزراہ پرورش " اور صفحہ ۷۸ ،

سے شاید توارد ہوا ؛ مگر دلی سے جو اِشاعت ۱۸۹۱ء میں ہوئی اُس میں وہی " تیس تیس " - پھر ۱۹۱۴ء میں آگرے سے جو اِشاعت ہوئی اُس میں بھی پہلی اِشاعت کے مطابق ہے - " تیس تیس " ہی صحیح ہے - اِسی طرح " عود ہندی " ص ۱۶۷ اور " اُردوے معلیٰ " (ص ۲۱۰) میں " بیس دن " ہے ، مگر " غالب " کے قلم کا لکھا ہوا اصل خط موجود ہے اور اُس میں "بیس بیس دن "-

سطر ۵ میں " اِبتدای سال سنه ۵۸ع " - یہاں " سال اور " سنه " میں سے صرف ایک لفظ کافی ہوتا ' اِس لیے که دونوں کے معنی ایک ہیں -

ص ۱۸۰ ' س ۱۷ - ۱۸ - " رسالۂ تذکیر و تانیث " کے دیباچے کی پہلی سطر " عرشی " صاحب نے پڑھ لی ہوتی ' تو یہ دھوکا نہ ہوتا که اُس کے مصنف کا نام ' احمد حسن ' ہے - رسالے کے مصنف سید فرزند احمد " صفیر " بلگرامی تھے ' جن کی کتاب " جلوۂ خضر " بہت مشہور ہے - سید احمد حسن کی فرمایش سے دیباچه لکھا گیا تھا -

ص ۱۸۱ ' س ۳ - عام طور پر یقین کیا جاتا ہے که " قدر " بلگرامی کے نام کے خط سب سے پہلے " مکمل اُردوے معلیٰ " (لاہور ۱۹۲۲ع) میں شائع ہوئے ؛ مگر جو خط اِس لاہوری اِشاعت کے ضمیمے میں ہیں وہ سب کے سب لفظ به لفظ " حسرت " موہانی کے ماہانه رسالے " اُردوے معلیٰ " (علی گڑھ) کے دسمبر ۱۹۰۷ع کے پرچے میں مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی نے شائع کر دیے تھے -

"عرشی" صاحب کی تحریر بلا شبہه اعلیٰ درجے کی اِنشاپردازی ہے اور اُن کی عبارت بہت پرتکلف ؛ پھر بھی بعض مقامات محلِ نظر ہیں :

(۱) " ادایگی " (ص ۲۰ ' س ۱۳ اور ص۲۴ ' س ۱۶ و ۲۳) ایک غلط لفظ ہے - " ادا " خود ہی مصدر ہے ؛ مگر چونکه اُس کے اور معنی رائج ہو گئے تھے ' اُردو میں " ادائی " بولنے لگے اور یه غلط نہیں - اُردو میں " قرضے کی ادائی " فصیحوں کی زبانوں پر ہے - ان پڑھ لوگوں نے اُس میں کاف ملا دیا ' جیسے " مہربانی " کو " مہربانگی " بولتے ہیں - یه دونوں لفظ بھونڈے ہیں ' اور " ادا " کے ساتھ کاف خاص کر بھونڈا - کاتبوں نے اور بھی ستم کیا که " ادائیگی " اور " پائیدار " (جیسے ص۱۲۵ ' س ۲۳ میں) اور " جائیداد " وغیرہ لکھنے لگے - ہمزہ زبردستی بڑھا

دیا - فارسی ترکیب میں " ادائیگی قرض " (ص ۳۳ ، س ۱۱) اور بھی برا ہے - " ادائے قرض " چاہیے تھا -

(۲) " بیٹا " اور " لڑکا " معنوں اور استعمال دونوں کے لحاظ سے مختلف ہیں ؛ وہ اولاد کے لیے مخصوص ہے ، یہ سولہ سترہ برس تک کے بچے کے لیے عام - جب اولاد ہی کے لیے یہ لفظ بولے جائیں ؛ تو اُس میں بلندی ہے ، اِس میں پستی - کوئی خود اپنے بیٹے کو " لڑکا " کہے ، تو یہ اُس کا اِنکسار سمجھا جائے گا ؛ کوئی دوسرا کہے تو اچھا نہیں - اِس لحاظ سے " اپنے لڑکے نواب شمس‌الدین... " (ص۲۲ ، س۱۱) کے بجائے " اپنے بیٹے...... " بہتر ہوتا - " مکاتیب " ص۹۷ ، ح۳ میں ہے : " شاہجہاں اپنے لڑکے عالمگیر..." یہاں بھی " بیٹے " چاہیے تھا - البتہ صفحہ ۱۶۴ ، س ۱۱ میں " لڑکے " کا لفظ نادرست نہیں -

(۳) "سلمہ...کو...قدم رکھا" اور "سلمہ..کو وفات پائی" ("مکاتیب" ص۹۷ ، ح۳ ، س۳ اور س۹) میں " کو " کی جگہ "میں" چاہیے -

(۴) " مثل " ہے تو عربی ، پر " دفتر " کے معنوں میں عربی میں نہیں آتا - اُردو میں عام طور پر ثؔ کے زبر سے بولا جاتا ہے - بعضے لوگ اُردو لفظ جان کر اِسے سؔ سے لکھتے ہیں ؛ کچھ بیجا نہیں - بعضوں کے نزدیک عربی لفظ "مسلہ" (مؔ کے زیر ، سؔ کے زبر ، لؔ کی تشدید سے) اِس کی اصل ہے جس کے معنے ہیں: ' بڑی سوئی ' - یہ کچھ زیادہ قریں قیاس نہیں - بہر حال " مثل " کی جمع " امثال " (ص۷۱ ، س ۱۳) صحیح نہیں ؛ ہاں لوگ " امثلہ " بولتے ہیں - ایسے لفظوں کی اُردو جمع اِستعمال کرنا چاہیے : " مسلیں ، مسلوں " - اِسی طرح " رواسم " (ص۱۱۳ ، س ۱) بھی صحیح نہیں ، جو حقیقت میں " روسم " (مہر ، نشان ، بلا) کی جمع ہے ، اور اُس سے یہاں بحث نہیں -

(۵) ایک جگہ (ص۱۰۹) "بیرخائیوں" کا لفظ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ کیا لفظ ہے - " بیرخی " کی اگر جمع بنائی جائے تو" بیرخیاں " یا " بیرخیوں " ہوسکتا ہے - " بیرخائی " کوئی لفظ نہیں -

(۶) " تحفے اور ہدیات کی آمد و شد " (ص۱۱۰) بھی عیب سے خالی نہیں - " تحفوں ہدیوں کی آمد و شد " صحیح ؛ اور اگر عربیت ہی مقصود ہے " تو تحف و ہدایا کی آمد و شد " سہی -

(۷) " غم غلط کرنے کے اس قدر درپے تھے" (ص۱۲۷) - " درپے" کا لفظ موزوں نہیں - " جن میں اِس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں نہ مندرج ہوں " (ص۱۳۵) - یہاں " مندرج " کا لفظ زائد ہے اور ناموزوں- صفحہ ۱۳۹ ، سطر ۶ میں " مرحوم " کے لفظ کی ضرورت نہ تھی - اِسی سطر میں " چھیڑ " کی جگہ " ظرافت " کا لفظ ہوتا تو بہتر ہوتا -

(۸) " چار چاند لگا دینا " (ص ۱۵۴) لوگ بولتے ہیں ، مگر کچھ زیادہ پسندید گی کے قابل نہیں -

" غالب " کے اِملا سے جو بحث کی گئی ہے (ص۱۴۵) بہت نامکمل ہے - مختفی ہ اور الف کی کتابت میں " غالب " اُصول سے نہیں ہٹے ہیں اور اگر اُن اُصول کو " عرشي " صاحب مدنظر رکھتے تو دیباچے میں بھی اِملا کی یکسانی ہاتھ سے نہ جانے پاتی- " اُردوے معلیٰ " اور " عود ہندی " میں اکثر اِملا کی بحث آئی ہے - اگر اُن سب مقامات کا مطالعہ کر لیا جاتا ، تو اِس مضمون پر سیرحاصل بحث ہوسکتی تھی - انگریزی لفظوں کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ " تلفظ بیشتر غلط کیا ہے " - کسی غیر زبان کے لفظوں کا تلفظ اُسی غیر زبان کے مطابق نہیں کیا جاتا - اگر " غالب " نے انگریزي لفظوں کا تلفظ اُردو کے ڈھنگ

پر کیا ، تو بجا کیا - انگریزی تلفظ یا اِملا کی بنا پر اُسے غلط کہنا درست نہیں - " لارڈ " غالباً سہو قلم ہے - " پنسن " واقعی "غالب " نے سین ہی سے لکھا ہے اور مذکر اِستعمال کیا ہے ، حالانکہ اُس زمانے میں بھی اور لوگ شین سے اور مونث بولتے تھے ، جیسا کہ حسین علی خاں کے عریضے کے اقتباس (ص ۲۰) سے بھی معلوم ہوتا ہے - پھر بھی " غالب " کے خطوں اور اور تحریروں میں جا بجا انگریزی لفظ ، انگریزوں کے نام ، عہدے ، وغیرہ آئے ہیں - جس طرح اُن کی کتابت ہوئی ہے اُسے دیکھنے کے بعد تو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ حتی الوسع اُن کو انگریزی تلفظ کے مطابق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور غالباً انگریزی دانوں سے پوچھ لیا کرتے ہوں - عربی لفظوں کا غلط اِملا " غالب " کی تحریر میں اور جگہ بھی دیکھا گیا ہے - سو عربی کے متعلق وہ خود ہی لکھ گئے ہیں :

" اِس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں - علما سے
پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلبگار رہتا ہوں " - [۱]

پرانا دستور تھا کہ لکھنے والا جب کوئی نئی بات شروع کرتا ، تو اُس کے پہلے لفظ پر ایک نشان بنا دیتا ، جسے " بت ، کہتے ہیں [۲] - اہلِ لغت اِس کی تشریح " غالب " کے زمانے سے بہت پہلے کرچکے ہیں - اِس لیے اِسے " غالب " کے خصوصیات یا اولیات میں گننا صحیح نہیں - اِسی طرح فقرے کے اِختتام پر بارہ کا ہندسہ (یعنی " حد " کے عدد)

---

[۱]—" اُردوے معلی " حصہ ۲ ، خط ۵ -

[۲]—صاحب " غیاث " نے " بت " کی اصل کے بارے میں ثقات کی زبان سے سن کر بتایا ہے کہ عربی مادے " ب ت ت " کے معنے کاٹ دینے کے ہیں اور اِسی سے وہ " بت " ہے جو نثر کے ہر فقرے کے آغاز میں شنگرف سے بنا دیا کرتے ہیں - میری راے میں ایک اِمکان یہ بھی ہے کہ " بت " مخفف " اِبتدا " کا ہو ؛ مگر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ نشان کسی خاص لفظ سے نہیں بنا ، بلکہ جب نشان اِستعمال ہونے لگا تو لوگوں نے اُسے " بت " کا مشابہ پاکر یہی نام اُسے دے دیا -

لکھنا بھی پرانا دستور تھا - " اِلتزام کی وجہ " جو " غالب " نے مرزا حاتم علی " مہر " کو لکھی ہے وہ محض بذاتہ سلجھی ہے - ' شاعری ' کو 'وجہ' جاننا درست نہیں -

اُردو لفظوں کے اِملا ' خاص کر الف اور مختفی ہ اور ی اور ہمزہ کی کتابت ' میں اِحتیاط نہیں برتی گئی ہے - " عرشی " صاحب کی تحریر میں ایک آدھ جگہ ' پتا " مگر اکثر " پتہ " دیکھا گیا ؛ کہیں "لیے"، "چاہیے" وغیرہ ' جو صحیح کتابت ہے ' مگر اکثر "لئے"، "چاہئے" وغیرہ - ' دیے" کو اکثر "دیئے" یا دئیے لکھا ہے - ایک ی کے ادا کرنے کو ایک زائد ہمزہ کی کیا ضرورت ؟ " غالب " کی جتنی تحریریں دیکھی گئیں اُن میں " دھبا " کہیں مختفی ہ سے لکھا ہوا نہیں پایا گیا ' " اُردوے معلیٰ" کی جتنی اِشاعتیں نظر سے گزریں اُن میں " دھبا " چھپا ہے ' مگر دیباچے (ص ۹۱ ' س ۳) میں " اُردوے معلیٰ " کی عبارت نقل ہوئی تو لفظ کا اِملا بدل دیا گیا - " غالب " کا ' اور اُن سے پہلے اور اُن کے بعد کے محققوں کا اُصول یہ تھا ' اور صحیح تھا ' کہ جن لفظوں کی اصل فارسی یا عربی نہیں ہے اُن میں مختفی ہ نہیں آسکتی ' الف ہونا چاہیے ' بلکہ فارسی کے لفظ بھی جب اُردو محاورے میں آئیں تو اُن کو الف سے لکھنا چاہیے ' جیسے " اور مزا یہ کہ......" (ص ۱۳۵ ' س ۲۲) -

" عرشی " صاحب نے " تہیا " الف سے لکھا ہے - عربی میں " تہیئۃ " ہے - اُردو میں ہمزہ ی سے بدل کر ی میں مدغم ہوگیا - معنی بھی بدل گئے : عربی میں کسی چیز کی تیاری کے معنی تھے ' اُردو میں " اِرادہ کرنا " معنی قرار پائے - جب معنی اور تلفظ دونوں بدل گئے ' تو اِملا کا بدلنا بیجا نہیں ؛ بلکہ جو اِجتہاد "عرشی" صاحب نے کیا ہے مستحسن ہے -

"مکاتیب غالب" کی ایک اور اِمتیازی خصوصیت اُس کی اچھی چھپائی ہے ، جو پتھر کے چھاپے میں نہیں ہو سکتی - ریاست کے حکام اور خاص کر جناب "عرشی" نے اُردو پر بڑا اِحسان کیا کہ لوہے کے ٹیپوں کے چھاپے کو پتھر کے چھاپے پر ترجیح دی اور اِس پر ریاست یقیناً مبارکبادی کی مستحق ہے - مگر یہ آرزو ، کہ اُردو پڑھنے والی قوم "اِن حرفوں کی عادی ہو کر...اہل مطابع سے اِسی قسم کی طباعت کی خواہاں ہو" اُس وقت تک آرزو ہی رہے گی ؛ جب تک کہ اِس قسم کی چھپائی کے موجودہ ناواجب نرخ کی ارزانی کی کوئی سبیل نہ ہو گی - ابھی تک ملک بھر میں دو تین چھاپے خانوں سے زیادہ نہیں جن میں یہ خوشنما اِستنبولی یا مصری ٹیپے ہیں - وہ اپنا بھاؤ کیوں گھٹانے لگے ؟ ہاں ، اگر رام پور کے شاہی چھاپےخانے میں اِس قسم کے حرف اِستعمال ہونے لگیں ، سرکاری کاغذات اور مطبوعات سوا اِس کے کسی اور طرح نہ چھپوائے جائیں اور باہر کا کام بھی سرکاری چھاپےخانہ واجبی نرخ پر کرنے لگے ، تو بہت جلد مقصد حاصل ہو سکتا ہے -

ایک چھوٹا سا غلطنامہ دیباچے کا ، ایک اُس سے بہت لمبا "مکاتیب" کا ، کتاب میں شامل ہے ، مگر دو غلطنامے بھی کتاب کی ساری غلطیوں کو سمیٹ نہ سکے ؛ اور ایک تیسرا غلطنامہ بن سکتا ہے:—

صفحہ	سطر	غلط		صحیح
دیباچہ—				
۵	۱	کے رستخیز	...	کی رستخیز
۲۵	۹	بجای می رسد	...	بجائے می رسد
۱۰۷	۹	میتھی	...	اُمیتھی
۱۲۱	۳-۴	تھے...سکتے	...	تھی...سکتی

صفحہ	سطر	غلط		صحیح
۱۲۴	۹	من ' و	...	من و
۱۳۴	۱۹	کی تمام	...	کے تمام

مکاتیب—

صفحہ	سطر	غلط		صحیح
۳ح۲		زکي	...	ذکی
ح۹		بمواجه	...	بمواجهه
ح۳۲		بکرما بۂ	...	بکرمابۂ
۵۹	اخیر	لامی	...	لا می
۵۸	۱۲	الزام	...	العزام
۹۰	اخیر	افراسیا بیهی	...	افراسیابیهی
۹۳ح۲		در فرو	...	درر فرو
۷۸ح۲		دیدۂ سفیداں	...	دیدہ سفیداں
۱۲۹		' امرکوٹ ' کے بعد اِضافہ کرو :		" انبالہ ۳۹ ' ۳۷ "
۱۳۰		'شاهجهانپور' کے بعد اِضافہ کرو :		" شملہ ۳۹ "
۱۳۳	۱	گئیں تهیں	...	گئی تهیں
۱۳۴	۲۴	هوئی هیں	...	هوئے هیں

ڈاکٹر اقبال مرحوم

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی موت، ہندستان کے لیے ایک ایسا سانحہ ہے جس سے قومی زندگی کے ہر پہلو کا متاثر ہونا لازمی ہے - اقبال نہ صرف ایک گہرے فلسفی، زبردست عالم اور بے نظیر شاعر تھے، بلکہ وہ ملت کے پیشوا اور قوم کے رہنما بھی تھے - ظاہر ہے کہ ایسی ہستی کے اُٹھ جانے پر ملک جس‌قدر اظہار حزن و ملال کرے، کم ہے - ہندستان کے جدید عہد میں جو بزرگ پیدا ہوئے اور جن کے کارناموں سے ہماری تاریخ کے اوراق مزین ہوں گے، اُن کی فہرست میں، یقین ہے، اقبال کا نام بہت نمایاں اور روشن ہوگا - نہ صرف قومی زندگی بلکہ اِنسانی زندگی کے لیے وہ ایک پیام لےکر آئے اور اِس پیام کو انھوں نے فلسفے کے منطقی دلائل اور شعر کی دلاویز رنگیں‌بیانوں کے ذریعے تمام ہندستان اور ایشیا کے باشندوں اور مغربی دنیا کے رہنے والوں تک پہنچایا -

اُردو شاعری کو اُنھوں نے اپنی شیوابیانی سے حسن و رعنائی کا پیکر بنایا - اُن کی شاعری فلسفہ اور تصوف کی ترجمانی، اسرار کائنات کی گرہ‌کشائی، مناظر فطرت کی صورت‌گری، محاورات کی دل‌کشی، استعارات کی شیرینی، تشبیہات کی طرفگی کا ایسا نمونہ ہے جو پڑھنے والے کے دل اور دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہے -

اقبال کی تعلیم کا نچوڑ اِس مصرع میں ہے :

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

یہی وہ "راز الوندی" ہے، جو اُنھوں نے "خاک راہ" کو بتایا ! یہ تعلیم اُن کی زندگی کی ایسی شمع ہے، جس کی روشنی، امید ہے، انسانیت کے لیے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دے گی -

اعلان !

ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کے لیے میں ایک جامع اور وسیع "فہرست کتب" (Bibliography) تیار کر رہا ہوں ؛ جس میں ہندستانی زبان کی قلمی اور مطبوعہ کتابیں ' قدیم ترین زمانے سے لے کر سنہ ۱۹۰۰ع تک درج کی جائیں گی - زیادہ معلومات ان قلمی کتابوں کی نسبت درکار ہیں جو اب تک چھپی نہیں ہیں - وہ ارباب علم جو ہندستانی زبان اور ادب کی ترقی کے خواہشمند ہیں ' اُن کی خدمت میں میری درخواست ہے کہ اپنے نادر کتب‌خانوں میں ہندستانی مخطوطات کا جائزہ لیں ' اور براہ کرم ذیل کے عنوانات کے مطابق خانہ‌پری کرکے مجھے اطلاع بخشیں - یہ کام اُس وقت تک مکمل نہ ہو سکے گا جب‌تک ایسے ارباب فضل و کمال میری امداد پر کمربستہ نہ ہو جائیں‌گے -

عنوانات :—

۱—موضوع کتاب -
۲— نام کتاب -
۳—نام مصنف -
۴—تاریخ تحریر -
۵—مقام تحریر -
۶—تاریخ ' ماہ اور سال جس میں کتاب نقل ہوئی -
۷—تعداد جلد -
۸—تعداد صفحات یا اوراق -
۹—رائیں -

اگر کوئی ترجمہ ہو تو مترجم کا نام ' اور ترجمہ کرنے کی تاریخ درج کرنی چاہیے - اگر مقدمے یا خاتمے (Colophon) میں کوئی اہم بات لکھی ہو تو اُس کو بھی لے‌لینا چاہیے -

حکیم سید شمس‌اللہ قادری
دفتر رسالۂ تاریخ
حیدرآباد ' دکن

مئی سنہ ۱۹۳۸ء مطبوعات

بیوہ :—منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں - ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں اور اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین طریقہ سے پیش کیا ہے - ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیے - قیمت مجلد ۱ روپیہ -

بنی اسرائیل کا چاند:—مصنفہ رائڈر ہیگرڈ - مترجمہ عبدالمجید حیرت بی - اے ' علیگ - فرعون کا دورحکومت ' شاہزادہ سیتی ولیعہد سلطنت کی انصاف و عدل کے لیے معزولی ' عبرانیوں پر مظالم ' ایک عبرانی لڑکی میرایی کے حیرت‌انگیز کارنامے - مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے درپے مختلف قسم کی وبائیں - بنی اسرائیل کی آزادی - فرعون کی مع لشکر غرقابی اور سیتی و میرایی کے تعلقات کی دلگداز داستان - قیمت مجلد ۲ روپیہ -

ضرب‌الامثال:—از خواجہ عبدالمجید دہلوی - یہ ۷۸ ضرب‌الامثال کا مجموعہ ہے - اس میں ایسے ضرب‌الامثال ہیں جو قصہ طلب ہیں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ بیان ہوئے کما حقہ سمجھ میں نہیں آتا - اب تک اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی - قیمت ۸ آنہ -

دلی کی دو سو برس کی تاریخ:—یہ اردو اکیڈیمی کا ایک مقالہ ہے - اس میں تمام‌تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے اور اُن کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں اُن کی جگہ اور قدر و قیمت دکھائی گئی ہے - قیمت ۵ آنہ -

عقاب:—از رفیعہ ریحانہ - یہ چار چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے - ذرا ابوخاں کی بکری کو تو دیکھو ' یہ بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتی ' لڑتے لڑتے مر جاتی ہے' لیکن غلامی کی زنجیر میں بندھنا پسند نہیں کرتی - قیمت ۳ آنہ -

چنبیلی:—یہ چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان میں ایک دل‌چسپ کہانی ہے - قیمت ۲ آنہ -

مکتبۂ جامعہ

دہلی — نئی دہلی — لاہور

هندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ' الہ آباد

کے مطبوعات

۱—از منۂ وسطی میں هندستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات -
از علامہ عبداللہ بن یوسف علی ' ایم - اے ' - ایل ایل ایم '
سی - بی - اے ' مجلد ۱ روپیہ ۴ آنہ - غیر مجلد ۱ روپیہ -
۲—اُردو سروے رپورٹ—از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب
ایم - اے - ۱ روپیہ -
۳—عرب و هند کے تعلقات - از مولانا سید سلیمان ندوی - ۴ روپیہ -
۴—ناتن (جرمن ڈراما) مترجمۂ مولانا محمد نعیم الرحمان صاحب -
ایم - اے ' ایم - آر ' اے - ایس - ۲ روپیہ ۸ آنہ -
۵—فریبِ عمل (ڈراما) مترجمۂ بابو جگت موهن لال صاحب '
رواں - ۲ روپیہ -
۶—کبیر صاحب - مرتبۂ پنڈت منوهر لال زتشی - ۲ روپیہ -
۷—قرونِ وسطی کا هندستانی تمدن - از رائے بہادر مہا مہو اُپادھیا
پنڈت گوری شنکر هیرا چند اوجھا ' مترجمۂ منشی پریم چند -
قیمت ۳ روپیہ -
۸—هندی شاعری - از ڈاکٹر اعظم کریوی - قیمت ۲ روپیہ -
۹—ترقیِ زراعت - از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب '
ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت - قیمت ۳ روپیہ -
۱۰—عالمِ حیوانی - از بابو برجیش بہادر ' بی - اے ' ایل ایل بی -
۶ روپیہ ۸ آنہ -
۱۱—معاشیات پر لکچر - از ڈاکٹر ذاکر حسین' ایم - اے' پی ایچ - ڈی -
مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۱ روپیہ -
۱۲—فلسفۂ نفس - از سید ضامن حسین نقوی - قیمت مجلد

۱۳—مہاراجہ رنجیت سنگھ - از پروفیسر سیتا رام کوہلی ' ایم اے -
قیمت مجلد ۴ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۴ روپیہ -

۱۴—جواہرِ سخن - جلد اول - مرتبہ مولانا کیفی چریا کوٹی -
قیمت مجلد ۵ روپیہ ' غیر مجلد ۴ روپیہ ۸ آنہ -

۱۵—علمِ باغبانی - از مسٹر وصی اللہ خاں - ایل - اے - جی - قیمت
مجلد ۶ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۶ روپیہ -

۱۶—انقلابِ روس - از کشن پرشاد کول - ممبر سرونٹس آف انڈیا
سوسائٹی لکھنؤ - قیمت مجلد ۳ روپیہ ' غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ -

۱۷—چلند دکھنی پہیلیاں - از محمد نعیم الرحمان ' ایم - اے ' استاد
عربی و فارسی ' الہ آباد یونیورسٹی - قیمت ۱ روپیہ ۴ آنہ -

۱۸—تاریخِ فلسفۂ سیاسیات - از محمد مجیب ' بی - اے (اکسن)
جامعۂ ملیۂ اسلامیہ - دہلی - قیمت مجلد ۴ روپیہ ۸ آنہ
غیر مجلد ۴ روپیہ -

۱۹—انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ - از علامہ
عبداللہ یوسف علی صاحب - قیمت مجلد ۴ روپیہ ' غیر
مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ .

۲۰—فلسفۂ جمال - از ریاض الحسن صاحب - ایم - اے - قیمت ۱ روپیہ -

۲۱—دیوانِ بیدار - از جلیل احمد قدوائی صاحب - ام - اے - قیمت
مجلد ۲ روپیہ ' غیر مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ -

۲۲—نفسیاتِ فاسدہ - از معتضد ولی الرحمان صاحب ' ایم - اے - قیمت
مجلد ۸ روپیہ ۸ آنہ ' غیر مجلد ۸ روپیہ -

۲۳—سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق - از پروفیسر آغا مہدی
حسین ' ایم-اے ' پی ' ایچ-ڈی ' ڈی-لٹ - قیمت مجلد
۳ روپیہ ' غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ -

ہندستانی اکیڈیمی ' یوپی ' الہ آباد -